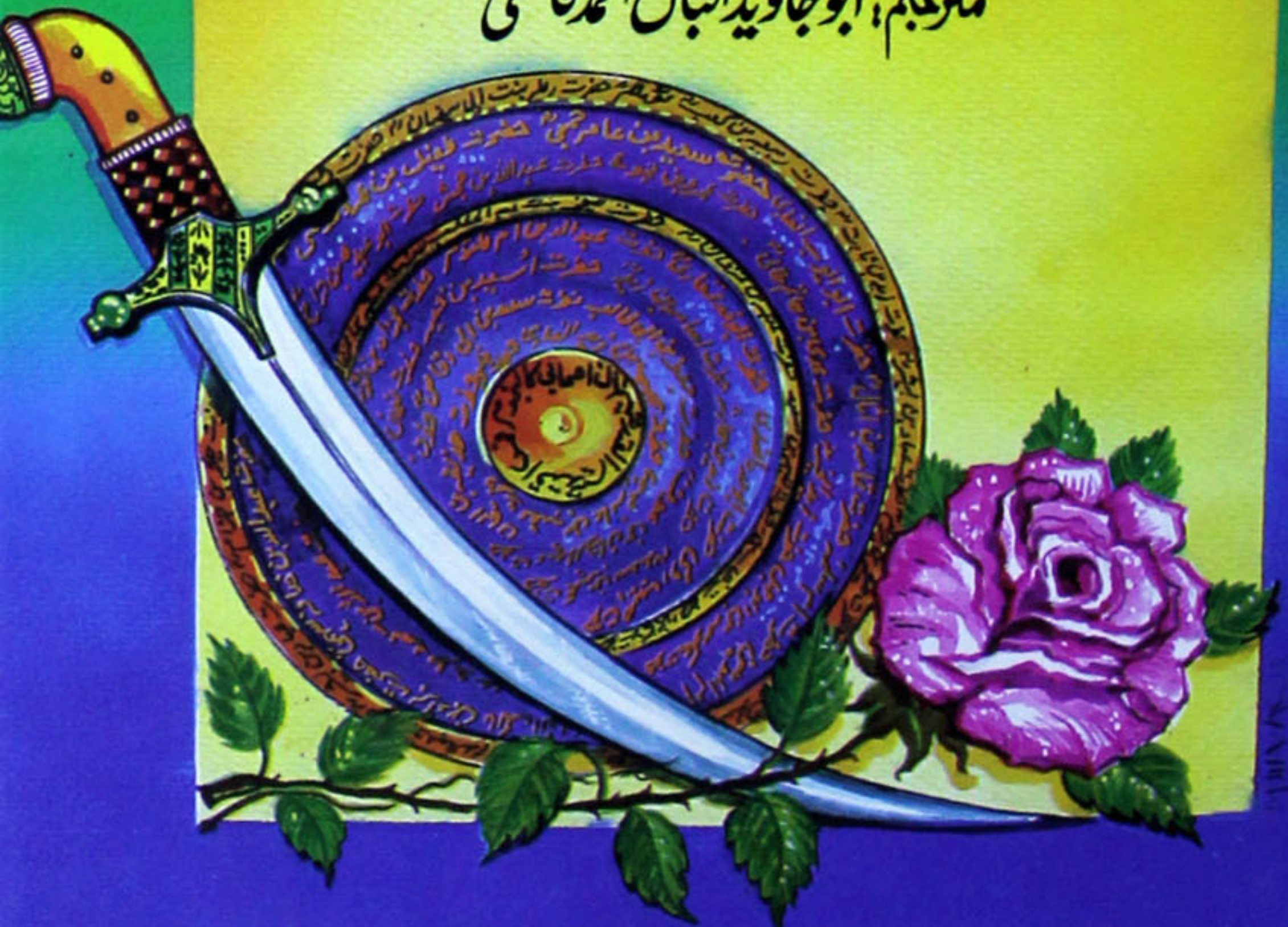


زندگی پاشا صحیحہ پاشا کی

مصنف، ڈاکٹر عبدالرحمن رافت پاشا
مترجم، ابو جاوید اقبال احمد قاسمی



زندگیاں صحابہؓ کی

ڈاکٹر عبد الرحمن رافت پاشا

ترجمہ

ابو جاوید اقبال احمد قاسمی

ناشر

مشفق بک کارزیم کریم ہاکیٹ
اردو بازار لاہور

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ

ہیں

نام کتاب ————— زندگیاں صحابہؓ کی

مصنف ————— ڈاکٹر عبدالرحمن رفیق پاشا

مترجم ————— ابو جابوید اقبال احمد قاسمی

ناشر ————— مشاق بک کارنر لاہور

پرنٹرز ————— اسم عصمت پرنٹرز

قیمت ————— روپے

کتاب ہذا میں اگر کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما کر شکریہ ادا کرنے
کا موقع فراہم کریں تاکہ اگلے ایڈیشن میں درستی کی جاسکے۔ شکریہ

فہرست

	عرض مترجم
۹	۱ - حضرت سعید بن عامر جمہیؓ
۱۵	۲ - حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ
۲۷	۳ - حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ
۳۷	۴ - حضرت عمیر بن وہب جمہیؓ
۴۹	۵ - حضرت براء بن مالک انصاریؓ
۵۷	۶ - ام المومنین حضرت ام سلمہؓ
۶۵	۷ - حضرت ثمامہ بن اثالؓ
۷۵	۸ - حضرت ابوالیوب انصاریؓ
۸۵	۹ - حضرت عمرو بن جموحؓ
۹۷	۱۰ - حضرت عبداللہ بن جحشؓ
۱۰۷	۱۱ - حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ
۱۱۷	۱۲ - حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
۱۲۷	۱۳ - حضرت سلمان فارسیؓ
۱۳۷	۱۴ - حضرت عکرمہ بن ابی جہلؓ

- ۱۵۹ - حضرت زید الخیر رضی
- ۱۶۹ - حضرت عدی بن حاتم طائی رضی
- ۱۷۹ - حضرت ابوذر غفاری رضی
- ۱۸۹ - حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی
- ۱۹۹ - حضرت مجزاة بن ثور سدوسی رضی
- ۲۰۹ - حضرت اسید بن حضیر رضی
- ۲۱۹ - حضرت عبداللہ بن عباس رضی
- ۲۲۵ - حضرت نعمان بن مقرن رضی
- ۲۳۵ - حضرت صہیب رومی رضی
- ۲۵۵ - حضرت ابو درداء انصاری رضی
- ۲۶۹ - حضرت زید بن حارثہ رضی
- ۲۷۹ - حضرت اسامہ بن زید رضی
- ۲۸۹ - حضرت سعید بن زید رضی
- ۲۹۹ - حضرت عمیر بن سعد رضی
- ۳۱۵ - حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی
- ۳۲۷ - حضرت جعفر بن ابی طالب رضی
- ۳۳۵ - حضرت ابوسفیان بن حارثہ رضی
- ۳۵۷ - حضرت سعد بن ابی وقاص رضی
- ۳۶۷ - حضرت حذیفہ بن الیمان رضی
- ۳۷۹ - حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی

- ۳۸۹ - حضرت حبیب بن زید انصاریؓ
 ۳۹۰ - حضرت ابو طلحہ انصاریؓ
 ۴۰۵ - حضرت رطلہ بنت ابی سفیانؓ
 ۴۱۵ - حضرت وحشی بن حربؓ
 ۴۲۳ - حضرت حکیم بن حزامؓ
 ۴۳۱ - حضرت عبید بن بشرؓ
 ۴۳۲ - حضرت زید بن ثابتؓ
 ۴۴۵ - حضرت ربیعہ بن کعبؓ
 ۴۵۵ - حضرت ابوالعاص بن زیدؓ
 ۴۶۵ - حضرت عاصم بن ثابتؓ
 ۴۷۲ - حضرت صفیہ بنت عبدالمطلبؓ
 ۴۸۱ - حضرت عقبہ بن غزوٰانؓ
 ۴۸۹ - حضرت نعیم بن مسعودؓ
 ۵۰۱ - حضرت ثقیف بن ارتؓ
 ۵۱۱ - حضرت ربیع بن زیاد حارثیؓ
 ۵۲۱ - حضرت عبداللہ بن سلامؓ
 ۵۳۱ - حضرت ہزاقہ بن مالکؓ
 ۵۴۳ - حضرت فیروز دینمیؓ
 ۵۵۱ - حضرت ثابت بن قیس انصاریؓ
 ۵۵۹ - حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ

۵۶۷

۵۵ - حضرت طلحہ بن عبید اللہ ^{رضی} تمیمی ^{رضی}

۵۷۵

۵۶ - حضرت ابو ہریرہ ^{رضی} دوسی ^{رضی}

۵۸۷

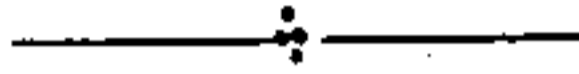
۵۷ - حضرت سلمہ بن قیس ^{رضی} اشجعی ^{رضی}

۵۹۷

۵۸ - حضرت معاذ بن جبل ^{رضی}

۶۰۵

مآخذ



”جو شخص پیروی کرنا چاہے، اُسے اُن لوگوں کی پیروی کرنی چاہیے جو وفات پا چکے ہیں اس لیے کہ آدمی جب تک زندہ رہتا ہے، اس کے فتنہ میں پڑنے اور دینِ حق سے ہٹ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

وہ لوگ جن کی پیروی کرنی ہے اصحابِ محمدؐ ہیں۔ وہ لوگ اس اُمت کے افضل ترین افراد تھے، اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری تھی۔ وہ دین کا گہرا علم رکھتے تھے اور تکلف سے دور تھے۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ مسلمانو! تم ان کا مقام پہچانو، ان کے پیچھے چلو اور ان کے اخلاق و سیرت کو حتی الامکان مضبوطی سے پکرو اس لیے کہ وہ لوگ صراطِ مستقیم، اور اللہ کی بتائی ہوئی راہِ ہدایت پر تھے۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

اِنَّ رِجَالِي كَالنَّجْمِ فَزِيحٌ اَوْ سَدْرٌ اَوْ قَدْحٌ

(حدیث نبوی)

میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کی پیروی
کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض مترجم

ملت کی نوجوان نسل کی ذہنی تربیت اور عملی تحریک کے لیے ہر زمانے میں ایسے لٹریچر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی گئی ہے جو اس مقصد کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہو، جس کے مطالعے سے نوجوانوں کے اندر اسلامی روح پیدا و مستحکم ہو، ان کا خوابیدہ شعور جاگ اٹھے اور انھیں اپنی اس بے پناہ قوتِ تخیل کا اندازہ ہو جائے۔ جسے قدرت نے ان کے وجود میں ودیعت کر رکھا ہے۔ اور وہ اپنے شکست ناپائیدار عزم و حوصلہ سے کام لے کر ارواح و اجساد کی دنیا کی تسخیر کا عظیم کارنامہ انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

اس مقصد کے تحت لکھی گئی کتابوں میں وہ کتابیں خاص طور سے مفید اور کارگر پائی گئی ہیں جن میں اسلاف خصوصاً صحابہ کرامؓ کی سیرتوں اور ان کی زندگیوں کے عظیم الشان اور حیرت انگیز کارناموں کو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ اپنی جگہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ نبی کریمؐ کی سیرت کے بعد جن مبارک ہستیوں کی سیرتوں کا مطالعہ مسلمانوں خصوصاً ان کی نوجوان نسل کی ذہنی تربیت اور عملی رہنمائی کے لیے ناگزیر اور غیر معمولی حد تک موثر ہے وہ آپ کے صحابہ کرامؓ ہیں۔

مصر کے مشہور عالم اور معروف صاحبِ قلم ڈاکٹر عبدالرحمن رافت پاشا مرحوم کی کتاب ”صُوْرٌ مِّنْ حَیَاةِ الصَّحَابَةِ“ سوانحی ادب میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کی حامل کتاب ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اٹھاون صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کے مختلف گوشوں اور ان کے بے مثال کارناموں کو اس انداز اور ترتیب سے پیش کیا

ہے۔ دورِ صحابہ کی اسلامی تاریخ کا بہت بڑا حصہ سامنے آ گیا ہے۔ یہ اٹھاون صحابہؓ ان ہزاروں بزرگ ترین ہستیوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو ان کے زمانے میں رسول کریمؐ کی دعوت پر ایمان لائے، جو آپؐ کی نصرت و حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جنھوں نے اپنی زندگیوں اللہ کے کلمے کو بلند کرنے اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے وقف کر دی تھیں۔ ہم ان اٹھاون صحابہ کی سیرتوں میں تمام صحابہ کرامؓ کی قوتِ ایمانی، جاں نثاری و جاں سپاری، ثباتِ قدمی و بہادری اور خدا و رسول سے ان کی محبت کی حسین و دلآویز تصاویر دیکھ سکتے ہیں۔

”صُورٌ مِّنْ حَیَاةِ الصَّحَابَةِ“ میں مصنفؒ کا اندازِ بیان ایسا منفرد، پُر سوز اور اس قدر موثر ہے کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دورانِ مطالعہ ایسے بہت سے مقامات آتے ہیں جہاں قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ کردار و عمل اور فداکاری و جاں نثاری کے ایک بحالیہ کے نیچے کھڑا ہے۔ وہاں اسے شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس جیلِ عظیم کے سامنے اس کی حیثیت ایک ذرہ حقیر ہے بھی کم تر ہے۔ پھر یہ احساس عقیدت و ندامت کے ملے جلے جذبات میں ڈھل جاتا ہے اور پھر اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ اس کے حضور عقیدت کے کچھ موتی نثار کیے اور اپنی بے مانگی پر ندامت کے آنسو بہائے بغیر آگے بڑھے۔ اور یہ اعجاز ہے صحابہ کرامؓ کی دل کش شخصیات کا، اور یہ تاثیر ہے عربی زبان و ادب اور مرتبہ مولف کے اندازِ بیان کی۔

مترجم کے بیان و قلم میں نہ مصنف جیسی قوت ہے نہ اس کی زبان میں عربی زبان کا حسن اور اس کی وسعت۔ پھر بھی اس نے اپنی حد تک اس بات کی کوشش کی ہے کہ اصل کتاب کا حسن اور اس کی اثر انگیزی حتی الامکان باقی رہے اور پڑھنے والوں کو اس کا احساس نہ ہو کہ وہ کسی کتاب کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔

فروری ۱۹۸۵ء میں عزیز طارق فارقلیط فلاحی مدیر ماہنامہ 'حیاتِ نو' جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کی فرمائش پر "صُورٌ من حَیَاةِ الصَّحَابَةِ" کے ترجمے کا آغاز ہوا تھا اور تقریباً آدھی کتاب انتیس قسطوں میں حیاتِ نو میں شائع ہو چکی تھی کہ جون ۱۹۸۸ء میں یو۔ کے اسلامک مشن کی دعوت پر مجھے برطانیہ منتقل ہونا پڑا۔ یہاں کتاب دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ کا یہ کام تقریباً پندرہ مہینوں تک معرض التوا میں پڑا رہا۔ پھر کتاب فراہم ہوتے ہی دوبارہ اس کا آغاز ہوا تو ۲۰ دسمبر ۱۹۸۹ء تک اس کی آخری سطریں سپردِ قلماس کی جا چکی تھیں۔

اب اگلا مرحلہ اس کی اشاعت کا تھا۔ میں یہاں برطانیہ میں مقیم تھا اور صورتِ حال یہ تھی کہ آدھی کتاب یہاں میرے پاس مسودہ کی شکل میں موجود تھی اور آدھی "حیاتِ نو" کے مختلف شماروں میں بکھری پڑی تھی۔ "حیاتِ نو" کے متعلقہ پرچوں کو تلاش کرنے اور ان میں بکھرے ہوئے اجزا کو بیجا کر کے انہیں مرتب کرنے کا کام باقی تھا۔ اور یہ کام اس وقت مکمل ہوا جب میں نومبر ۱۹۹۹ء میں وطن واپس آیا۔ "صُورٌ من حَیَاةِ الصَّحَابَةِ" کے اسی اُردو ترجمے کو "زندگیاں صحابہؓ کی" کی شکل میں ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔ خدائے تعالیٰ اس جذبے کو قبول فرمائے جس کے تحت اسے اُردو میں منتقل کیا گیا ہے اور اُس مقصد کو پورا کرے جس کے پیشِ نظر اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔

مآخذ کی جو فہرست کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کی گئی ہے اس کو اس شکل میں مرتب کرنے کی ذمہ داری تنہا مجھ پر ہے۔ مصنف کا انداز یہ ہے کہ انھوں نے ہر مضمون کے اختتام پر ان کتابوں کے نام دے دیئے ہیں جن سے انہوں نے اس مضمون کی ترتیب کے دوران استفادہ کیا تھا۔ اس طرح بہت سی کتابوں کے نام بار بار آئے ہیں۔ پھر انہوں نے مصنفین کے نام بھی نہیں لکھے۔ میں نے تکرار کو

حذف کر دیا اور تلاش و جستجو کے بعد ہر کتاب کے مصنف کی نشان دہی کر دی۔
اگر اس نشان دہی میں کوئی غلطی ہو اور کسی کتاب کا انتساب اس کے اصل مصنف
کے بجائے کسی دوسرے کی طرف ہو گیا ہو تو اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ مصنف کا
اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کتاب "زندگیاں صحابہ کی" کی اشاعت پر میرا دل خدائے کریم کے شکر
کے جذبے سے بے نیاز ہے کہ اگر اس کی توفیق شامل حال نہ ہوتی تو یہ کام میرے بس کا نہ تھا۔
پھر میں اپنے مخلص دوست جناب ڈاکٹر محمود الحسن صاحب اور ڈاکٹر خالد پرورد صاحب
کی خدمت میں ہدیہ تشکر و امتنان پیش کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کی حوصلہ افزائی
اور مسلسل اصرار نے اس کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ایک گزارش ارباب نظر قارئین سے۔ اگر اس کتاب کے مطالعے کے دوران آپ
ترجمے کی کسی غلطی یا اس کے کسی مستقیم سے واقف ہو جائیں تو اس سے مجھے ضرور آگاہ
فرمائیں۔ یہ آپ کی علمی امانت و دیانت کا تقاضا ہے۔

اور آخر میں اپنے رب کریم کے حضور اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر عبدالرحمن
رافت پاشا مرحوم کے پیچھے کھڑا ہاتھ پھیلائے ان کی اس دعا پر آمین کہتا ہوں!
"خدا یا! میں تیرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے ساتھ
سچی اور گہری محبت رکھتا ہوں۔ یا ارحم الراحمین! تو خوب جانتا ہے کہ میں ان لوگوں
سے صرف تیری رضا کے لیے محبت کرتا ہوں لہذا قیامت کے سخت گھبراہٹ والے
دن مجھے ان میں سے کسی ایک کو عطا فرما دے۔" آمین

اقبال احمد قاسمی

یو۔ کے اسلامک مشن

۲۲۔ ماچسٹر روڈ۔ اولڈ ٹھم۔ انگلینڈ

۱۰ مئی ۱۹۹۱ء یوم جمعہ

مِثْلُ رِجَالِ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمَا طَعِمُوا فِي الرِّقْعَةِ

لِلْأَصْحَابِ الرِّقْعَةِ وَاللَّيَالِيَةِ - (شرح السنّة)

میری امت کے درمیان صحابہؓ کھانے میں نمک کے مانند
ہیں۔ نمک کے بغیر کھانا طبیعت کے موافق ٹھیک (خوش ذائقہ)
نہیں ہوتا۔

حضرت سعید بن عامر جمحی رضی اللہ عنہ

نوجوان سعید بن عامر جمحی ان ہزاروں انسانوں میں سے ایک تھا جو سردارانِ قریش کی دعوت پر مکہ سے باہر مقامِ تنعیم پر صحابی رسول حضرت حبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کا تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوئے تھے، جن کو کفار نے غداری سے گرفتار کیا تھا۔

وہ اپنی بھرپور جوانی اور پرجوش شباب کے بل پر مجمع کو ڈھکیلتا اور اس میں سے اپنے لیے راستہ بناتا ہوا ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ جیسے رؤسائے قریش کے پہلو بہ پہلو جا کھڑا ہوا جو اس مجمع میں نمایاں مقام پر کھڑے تھے۔ اس طرح اُسے اس بات کا موقع ملا کہ وہ قریش کے قیدی کو دیکھ سکے جو وہاں پایہ زنجیر لایا گیا تھا جس کو قریش کی عورتیں، بچے اور جوان ڈھکیلتے ہوئے موت کے میدان کی طرف لارہے تھے، تاکہ اُسے قتل کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انتقام لے سکیں اور جنگِ بدر میں مارے جانے والے اپنے اعزہ و اقارب کا بدلہ چکا سکیں۔

جب یہ زبردست ہجوم اپنے قیدی کو لیے ہوئے اس جگہ پر پہنچ گیا جو اس کے قتل کے لیے بنائی گئی تھی تو نوجوان سعید بن عامر ایک جگہ رک کر ہجوم کے درمیان سے حضرت حبیب کو دیکھنے لگا، اس نے دیکھا کہ حبیب کو تختہ دار کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ اُس نے عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار اور شور و غل کے درمیان سے ابھرتی ہوئی حبیب کی وہ باوقار اور پرسکون آواز سنی جو اُس کے پردہ سماعت سے ٹکرانی تھی۔

”اگر تم لوگ جاہلو تو قتل سے پہلے مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کا موقع دیدو۔“
 پھر سعید نے دیکھا کہ حبیب بن عدی نے قبلہ رو ہو کر دو رکعتیں پڑھیں۔
 آہ! کیسی حسین اور کتنی مکمل تھیں وہ دو رکعتیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ حبیب نے
 زعمار قریش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”واللہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم میرے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا ہو
 جاؤ گے کہ میں موت سے ڈر کر نماز کو طول دے رہا ہوں تو میں اور لمبی اور
 اطمینان کے ساتھ نماز پڑھتا۔“

پھر سعید نے بہ چشم سر اپنی قوم کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ زندہ ہی حبیب کا
 مثلہ کر رہے ہیں، ان کے اعضاء جسم کو یکے بعد دیگرے کاٹ رہے اور ساتھ
 ہی ساتھ یہ بھی کہتے جاتے ہیں۔ ”کیا تم یہ بات پسند کرو گے کہ اس وقت
 محمد تمہاری جگہ یہاں ہوتے اور تم اس تکلیف سے نجات پا جاتے؟“
 تو حبیب نے جواب دیا اور اس وقت ان کے جسم سے بے تحاشا خون
 بہ رہا تھا، ”واللہ مجھے تو اتنا بھی گوارا نہیں ہے کہ میں امین و اطمینان کے ساتھ
 اپنے اہل و عیال میں رہوں اور ان کے پاؤں کے تلوے میں ایک کانٹا بھی
 چھب جائے۔“

اور یہ سننے ہی لوگوں نے اپنے ہاتھوں کو فضا میں بلند کرتے ہوئے چھینا
 شروع کر دیا۔

”مارڈالوائے، قتل کر دو اسے۔“

پھر سعید بن عامر کی آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ حبیب نے تختہ دار
 ہی سے اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

اللہم احصہم عددًا - واقتلہم بذاولتقادیر منہم احدًا

خدا یا! انہیں ایک ایک کر کے گن لے۔ انہیں منتشر کر کے ہلاک کر اور ان میں سے کسی کو نہ چھوڑ۔

پھر انہوں نے آخری سانس لی اور رُوح پاک اپنے رب کے حضور پہنچ گئی۔ اس وقت ان کے جسم پر تلواروں اور نیزوں کے ان گنت زخم تھے۔ اس کے بعد قریش مکہ لوٹ آئے اور بڑے بڑے واقعات و حادثات کے ہجوم میں حبیبؐ اور ان کے قتل کا واقعہ ان کے ذہنوں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن نوجوان سعید بن عامر جمحی حبیبؐ کی منزلت اور ان کے دردناک قتل کے اس دل خراش منظر کو اپنے لوح ذہن سے ایک لمحہ کے لیے محو نہ کر سکا، وہ سوتا تو خواب میں ان کو دیکھتا اور عالم بیداری میں اپنے خیالات میں ان کو موجود پاتا۔ یہ منظر ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا کہ حبیبؐ تختہ دار کے سامنے بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ کھڑے دور کعتیں ادا کر رہے ہیں۔ اور اس کے پردہ سماعت سے ہر وقت ان کی وہ درد بھری آواز ٹکراتی رہتی۔ جب وہ قریش کے لیے بددعا کر رہے تھے، اور اس کو ہر وقت اس بات کا ڈر لگا رہتا کہ کہیں آسمان سے کوئی بجلی یا کوئی چٹان گر کر اسے ہلاک نہ کر دے۔

پھر حبیبؐ نے سعید کو وہ باتیں بتادیں جو پہلے سے اس کے علم میں نہ تھیں۔ حبیبؐ نے اُسے بتایا کہ حقیقی زندگی یہی ہے کہ آدمی ہمیشہ سچے عقیدے کے ساتھ چمٹا رہے اور زندگی کی آخری سانس تک خدا کی راہ میں جدوجہد کرتا رہے۔ حبیبؐ نے سعید کو یہ بھی بتا دیا کہ ایمان راسخ کیسے کیسے حیرت انگیز کارنامے انجام دیتا ہے اور اس سے کتنے محیر العقول افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ حبیبؐ نے سعید کو ایک اور بڑی اہم حقیقت سے آگاہ کیا کہ وہ شخص جس کے ساتھی اس سے اس طرح ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ واقعی برحق رسول اور سچا نبی ہے اور اُسے

آسمانی مدد حاصل ہے۔

اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے سعید بن عامر کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیا۔ وہ قریش کی ایک مجلس میں پہنچا اور وہاں کھڑے ہو کر اس نے قریش اور ان کے کانے کرتوتوں سے اپنی بے تعلقی و نفرت اور ان کے معبودانِ باطل سے اپنی بے زاری و برأت اور اپنے دخولِ اسلام کا برملا اور کھلم کھلا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے اور مستقل طور پر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کر لی۔ اور غزوہ خیبر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں آپ کے ہمراہ رہے، اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے جوار رحمت میں منتقل ہو گئے تو حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ آپ کے دونوں خلفاء حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں میں شمشیر برہنہ بن گئے اور انھوں نے اپنی تمام جسمانی اور نفسانی خواہشات کو خدائے تعالیٰ کی مرضیات کے تابع کر کے اپنی زندگی کو اس مومن صادق کی زندگی کا نادر اور بے مثال نمونہ بنا کر پیش کیا جس نے دنیوی عیش و عشرت کے عوض آخرت کی ابدی و لافانی کامیابی و فائز المرامی کا سودا کر لیا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں جانشین ان کی نصیحتوں کو بہت غور و توجہ سے سنتے اور ان کی باتوں پر پورا پورا دھیان دیتے تھے۔ ایک بار وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے ابتدائی ایام میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نصیحت کرتے ہوئے ان سے کہا،
 ”عمر! میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ رعایا کے بارے میں ہمیشہ خدائے تعالیٰ سے ڈرتے رہیے اور خدا کے معاملے میں لوگوں کا کوئی خوف نہ کیجیے۔“

اور آپ کے اندر قول و عمل کا تضاد نہ پایا جائے، بہترین قول وہی ہے جس کی تصدیق عمل سے ہوتی ہو۔“

انہوں نے سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

”عمر! دور و نزدیک کے ان تمام مسلمانوں پر ہمیشہ اپنی توجہ مرکوز رکھیے جن کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالی ہے، اور ان کے لیے وہی باتیں پسند کیجئے جو آپ خود اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے پسند کرتے ہیں، اور حق کی راہ میں بڑے سے بڑے خطرے کی بھی پرواہ نہ کیجئے اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کو خاطر میں نہ لائیے۔“

”سعید! یہ سب کس کے بس کی بات ہے؟“ حضرت عمرؓ نے ان کی یہ باتیں سن کر کہا۔

”یہ آپ جیسے شخص کے بس کی بات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدؐ کا ذمہ دار بنایا ہے، جس کے اور خدا کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہے۔“ حضرت سعیدؓ نے کہا۔

اس گفتگو کے بعد خلیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ سے حکومت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں تعاون کی خواہش ظاہر کی اور فرمایا۔

”سعید! میں تم کو حص کا گورنر بنا رہا ہوں۔“

”عمر! میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے آزمائش میں نہ ڈلیے۔“ حضرت سعیدؓ نے جواباً عرض کیا۔

ان کا یہ جواب سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

”خدا تمہارا بھلا کرے، تم لوگ حکومت کی بھاری ذمہ داریاں میرے

سر ڈال کر خود اس سے کنارہ کش ہو جانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں تم کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔“

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حمص کی گورنری ان کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں تمہارے لیے تنخواہ نہ مقرر کر دوں؟“

”امیر المؤمنین! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بیت المال سے جو وظیفہ مجھے ملتا ہے، وہ میری ضروریات سے فاضل ہے۔“ حضرت سعیدؓ نے کہا۔ اور وہ حمص کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اہل حمص کے کچھ قابل اعتماد لوگوں پر مشتمل ایک وفد حضرت عمرؓ کی خدمت میں باریاب ہوا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ مجھ اپنے بیان کے نقرار اور حاجتمندوں کے نام لکھ کر دے دو تاکہ میں ان کی ضروریات کی تکمیل کا کوئی بندوبست کر دوں۔ تعمیل حکم میں انھوں نے خلیفہ کے سامنے جو فہرست پیش کی اس میں تھا۔ فلاں ابن فلاں اور فلاں ابن فلاں اور سعید بن عامر۔

”سعید بن عامر؟ کون سعید بن عامر؟ حضرت عمرؓ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہمارے گورنر“ ارکان وفد نے جواب دیا۔

”تمہارا گورنر؟ کیا تمہارا گورنر فقیر ہے؟ حضرت عمرؓ نے مزید حیرت

سے پوچھا۔

”جی ہاں امیر المؤمنین! خدا کی قسم کتنے ہی دن ایسے گزر جاتے ہیں کہ ان کے گھر میں آگ نہیں جلتی۔“ وفد نے مزید وضاحت کی۔

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ وہ دیر تک روتے رہے حتیٰ

کہ ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، پھر وہ اٹھے اور ایک ہزار دینار ایک تھیلی میں رکھ کر اسے ارکان وفد کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا۔

”سعید سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ امیر المومنین نے یہ مال آپ کے لیے بھیجا ہے تاکہ آپ اس سے اپنی ضرورتیں پوری کریں۔“

وفد کے لوگ دیناروں کی وہ تھیلی لے کر حضرت سعیدؓ کی خدمت میں پہنچے اور اسے ان کے سامنے پیش کر دیا۔ انہوں نے اس تھیلی اور اس میں رکھے ہوئے دیناروں کو اپنے سے دُور ہٹاتے ہوئے کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جیسے ان کے اُوپر کوئی بڑی مصیبت نازل ہو گئی ہو۔ آواز سن کر ان کی بیوی گھبرائی ہوئی ان کے پاس آئیں اور بولیں۔

”سعید کیا بات ہے؟ کیا امیر المومنینؓ کا انتقال ہو گیا؟“

”نہیں۔ اس سے بھی بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔“ حضرت سعیدؓ نے کہا۔

”کیا کسی جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہو گئی ہے؟“ اہلیہ نے سوال کیا۔

”نہیں اس سے بھی بڑی افتاد آپڑی ہے۔“ حضرت سعیدؓ نے جواب دیا۔

”اس سے بڑی افتاد کیا ہو سکتی ہے؟“ بیوی نے پھر پوچھا۔

”دنیا میرے گھر میں داخل ہو گئی ہے۔ تاکہ میری آخرت کو تباہ کر دے۔“

حضرت سعیدؓ نے تشویشناک لہجے میں جواب دیا۔

”اس نے چھٹکارا حاصل کر لو۔“ بیوی نے ہمدردانہ مشورہ دیا (ابھی تک

وہ دیناروں کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھیں)۔

”کیا تم اس معاملے میں میری مدد کر سکتی ہو؟“ حضرت سعیدؓ نے پوچھا۔

”ہاں، کیوں نہیں؟“ بیوی نے جواب دیا۔

پھر حضرت سعیدؓ نے تمام دیناروں کو بہت کچھوٹی چھوٹی تھیلیوں

میں رکھ کر انھیں غریب اور محتاج مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔
 اس بات کو ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ حضرت عمر بن خطاب
 رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر وہاں کے حالات معلوم کرنے کے لیے تشریف
 لائے۔ اس دورے میں جب آپ حمص پہنچے، (اس زمانے میں حمص کو گولیفہ
 بھی کہا جاتا تھا اس لیے کہ وہاں کے باشندے بھی اہل کوز کی طرح اپنے
 عمال اور حکام کی بہ کثرت شکایتیں کرنے میں مشہور تھے) تو جب اہل حمص خلیفہ
 سے سلام و ملاقات کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خلیفہ نے ان
 سے دریافت کیا کہ تم نے اپنے اس نئے امیر کو کیسا پایا؟ جواب میں انھوں
 نے امیر المؤمنین کے سامنے حضرت سعید بن عامرؓ کی چار شکایتیں پیش کیں
 جن میں سے ہر ایک شکایت دوسری سے بڑی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ
 ”میں نے ان کو اور سعیدؓ کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا
 کی کہ وہ سعیدؓ کے متعلق میرے حسن ظن کو صدمہ نہ پہنچائے، کیونکہ میں ان کے
 متعلق بہت زیادہ خوش گمان تھا، جب شکایت کرنے والے اور ان کے امیر
 سعید بن عامرؓ سے پاس یکجا ہو گئے تو میں نے دریافت کیا کہ تم کو اپنے امیر
 سے کیا شکایت ہے؟

”جب تک خوب دن نہیں چڑھ آتا یہ اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتے“
 مترجمین نے کہا۔ میں نے سعیدؓ سے دریافت کیا کہ سعیدؓ! تم اس شکایت
 کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ سعیدؓ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر بولے ”جدا کی
 قسم میں اس بات کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کو ظاہر کیے بغیر چارہ نہیں
 ہے، بات یہ ہے کہ میرے گھر میں کوئی خادمہ نہیں ہے اس لیے ذرا سویرے
 اٹھتا ہوں تو پہلے اٹا گوندھتا ہوں پھر تھوڑی دیر انتظار کرتا ہوں تاکہ اس کا

خمیر اٹھ جائے، پھر روٹیاں پکاتا ہوں اس کے بعد وضو کر کے لوگوں کی ضرورت کے لیے باہر نکلتا ہوں۔ میں نے اہل حمص سے پوچھا کہ تمہاری دوسری شکایت کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ، ”یہ رات کے وقت کسی کا جواب نہیں دیتے۔“ میں نے پوچھا کہ ”سعید اس شکایت کے متعلق تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ تو انہوں نے جواب دیا کہ ”ہذا کی قسم میں اس بات کو کبھی ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا تھا، میں نے دن کے اوقات ان لوگوں کے لیے اور رات کے اوقات اپنے رب کے لیے مخصوص کر رکھے ہیں۔“

میں نے معترضین سے کہا: ”اب تم اپنی تیسری شکایت بیان کرو۔“ انہوں نے کہا کہ یہ مہینے میں ایک بار دن بھر گھر سے باہر نہیں نکلتے۔“ میں نے دریافت کیا کہ سعید تم اس شکایت کا کیا جواب دیتے ہو؟ سعید نے کہا کہ ”امیر المؤمنین میرے پاس کوئی خادم نہیں ہے، اور جسم کے ان کپڑوں کے سوا میرے پاس اور کوئی کپڑا نہیں ہے، میں ان کو بیٹھے میں صرف ایک بار دھوتا ہوں اور ان کے خشک ہونے کا انتظار کرتا ہوں، اور سوکھنے کے بعد دن کے آخری حصے میں انھیں پہن کر باہر آتا ہوں۔“

میں نے معترضین سے کہا کہ اب تم اپنی آخری شکایت بیان کرو۔“ انہوں نے کہا کہ ”ان کو رہ رہ کر غشی کے شدید دورے پڑتے ہیں اور یہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔“

میں نے کہا، ”سعید! تمہارے پاس اس شکایت کا کیا جواب ہے؟“ انہوں نے جواب دیا کہ میں نجیب بن عدی کے قتل کے وقت موقع پر موجود تھا اور اس وقت میں مشرک تھا۔ میں نے قریش کو دیکھا کہ وہ ان کے جسم کا ایک ایک عضو کاٹتے جاتے اور ساتھ ہی یہ کہتے جاتے کہ کیا تم یہ پسند

کرتے ہو کہ آج تمہاری جگہ پر محمدؐ ہوتے اور تم اس تکلیف سے نجات پا جاؤ تے
تو وہ جواب دیتے کہ خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ میں اطمینان و سکون
کے ساتھ اپنے اہل و عیال میں رہوں اور محمدؐ کے تلوؤں میں ایک پھانس بھی
لگ جاتے؛ خدا کی قسم جب مجھ کو وہ منظر یاد آتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی
یاد آتا ہے کہ میں نے اس وقت ان کی مدد کیوں نہ کی تو مجھے اس بات کا
شدید خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری اس کوتاہی کو ہرگز معاف نہیں
کرے گا۔ اور اسی وقت میرے اوپر غشی طاری ہو جاتی ہے۔" یہ سن کر میں
نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے سعیدؓ کے متعلق میرے حسن ظن کو صدمہ
نہیں پہنچنے دیا۔"

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے ایک ہزار دینار بھیجے
تاکہ ان سے وہ اپنی ضروریات پوری کریں۔ جب ان کی اہلیہ نے ان دیناروں
کو دیکھا تو بولیں کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو آپؐ کی خدمات سے
بے نیاز کر دیا۔ اب آپ اس رقم سے ہمارے لیے ایک غلام اور ایک خادمہ
خرید دیجئے۔ یہ سن کر حضرت سعیدؓ نے کہا۔

"کیا تم کو اس سے بہتر چیز کی خواہش نہیں ہے؟"

"اس سے بہتر؟ اس سے بہتر کیا چیز ہے؟" اہلیہ نے پوچھا۔

"یہ رقم ہم اس کے پاس جمع کر دیں جو اسے ہم کو اس وقت واپس

کر دے جب ہم اس کے زیادہ ضرورت مند ہوں۔" حضرت سعیدؓ نے

بات سنبھالی۔

"اس کی کیا صورت ہوگی؟" اہلیہ نے وضاحت چاہی۔

حضرت سعیدؓ نے کہا کہ "ہم یہ رقم اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیدیں"

ابوہ نے کہا، ”ہاں یہ بہتر ہے، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔“
 پھر حضرت سعیدؓ نے اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے ان تمام دیناروں کو
 کو بہت سی تھیلیوں میں رکھ کر اپنے گھر کے ایک آدمی سے کہا کہ ”انھیں فلاں
 قبیلے کی میواؤں، فلاں قبیلے کے یتیموں، فلاں قبیلے کے مسکینوں اور فلاں قبیلے
 کے عاجز مندوں میں تقسیم کر دو۔“

اللہ تعالیٰ حضرت سعیدؓ بن عامر جمحی سے راضی ہو۔ وہ ان لوگوں میں
 سے تھے جو خود محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی اپنے اوپر دوسروں
 کو ترجیح دیتے تھے۔



حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ

حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ زمانہ جاہلیت میں قبیلہ دوس کے سردار، عرب کے قابل ذکر اشراف اور معدودے چند اصحاب مروت میں سے تھے۔ وہ بڑے بہمان نواز اور صاحب جود و سخا آدمی تھے۔ بہانوں کی بکثرت آمد کی وجہ سے ان کے یہاں کھانے کی رنگیں ہمیشہ چولھوں پر چڑھی رہتیں اور ان کے دروازے آنے والے بہانوں کے استقبال کے لیے ہر وقت کھلے رہتے، وہ بھوکوں کو کھانا کھلاتے، خوف زدہ لوگوں کو امان دیتے اور پناہ طلب کرنے والوں کو اپنی پناہ میں لیتے۔ ان ساری خوبیوں کے علاوہ وہ نہایت باشعور اور زبردست ادیب، بڑے نازک خیال اور حساس شاعر اور کلام و بیان کے حسن و قبح اور صحت و عدم کی تمیز میں غیر معمولی درک رکھنے والے نقاد تھے۔

حضرت طفیل بن عمرو اپنے قبیلہ کے علاقہ تہامہ کو چھوڑ کر مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار قریش کے درمیان حق و باطل کی زبردست کشمکش برپا تھی۔ اور فریقین میں سے ہر ایک اپنے اور اپنی جماعت کے لیے اعوان و انصار فراہم کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق و انصاف کے ہتھیار سے کام لے کر لوگوں کو ہندگی رب کی دعوت دے رہے تھے اور کفار قریش ہر قسم کے حربے استعمال کر کے اس دعوت کی مخالفت و مزاحمت میں جُٹے ہوئے تھے اور لوگوں کو اس سے باز رکھنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک زور لگا رہے تھے۔

مکہ پہنچ کر حضرت طفیلؓ نے محسوس کیا کہ وہ کسی تیاری کے بغیر اس معرکہ میں شامل اور بلا قصد و ارادہ اس کی موجوں میں داخل ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ تو وہ اس مقصد سے مکہ آئے تھے نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے مابین برپا اس کشمکش کا انھیں وہم و گمان ہی گزرا تھا، اس وجہ سے اس کشمکش سے وابستہ ان کی ناقابل فراموش اور عجیب و غریب داستان سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت طفیل بن عمروؓ اس داستان کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں جب میں مکہ پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی سرداران قریش میری طرف لپکے اور انھوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا اور مجھے بڑی عزت و تکریم سے نوازا۔ پھر ان کے بڑے بڑے سردار اور سربراہ اور وہ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے ”طفیل! تم ہمارے شہر میں آئے ہو۔ اور یہ شخص جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے، اس نے ہمارا سارا معاملہ خراب کر کے رکھ دیا ہے، اس نے ہماری جمعیت کو منتشر اور ہماری جماعت کو پراگندہ کر دیا ہے۔ ہم لوگوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں تم کو اور تمہاری قیادت و سرداری کو بھی وہی خطرہ نہ لاحق ہو جائے جس سے ہم لوگ دوچار ہیں۔ اس لیے تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم نہ تو اس شخص سے کوئی بات کرنا نہ اس کی کوئی بات سننا کیونکہ اس کی باتیں بڑی جادو اثر ہیں، اس کی زبان میں بلا کی تاثیر ہے۔ یہ شخص اپنی ان باتوں کے ذریعہ باپ بیٹے، بھائی بھائی اور شوہر بیوی میں تفریق کر دیتا ہے۔“

حضرت طفیلؓ اپنی کہانی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں۔
 ”خدا کی قسم وہ لوگ مسلسل اس شخص کی عجیب و غریب باتیں مجھے سناتے رہے اور اس کے حیرت انگیز کارناموں سے میری اپنی ذات اور میری قوم کے

متعلق مجھ کو خوفزدہ کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے اس بات کا عزم مصمم کر لیا کہ میں نہ اس شخص سے ملوں گا نہ اس سے کلام کروں گا نہ اس کی کوئی بات سنوں گا اور جب میں خانہ کعبہ کے طواف اور اس میں رکھے ہوئے ان بتوں سے برکت حاصل کرنے کے لیے مسجد حرام میں گیا جن کی ہم تعظیم و توقیر کرتے تھے تو اس خوف سے کہ کہیں محمدؐ کی کوئی بات میرے کانوں میں نہ پڑ جائے، میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ مسجد میں داخل ہوا تو میں نے محمدؐ کو کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں مشغول پایا۔ ان کا طریقہ عبادت ہمارے طریقہ عبادت سے مختلف تھا۔ وہ منظر مجھے بہت اچھا لگا اور ان کے عبادت کے اس طریقے کو دیکھ کر میں فرط مسرت سے جھوم اٹھا اور غیر ارادی طور پر بہ تدریج ان سے قریب ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ان کے بالکل نزدیک پہنچ گیا اور خدا کو یہی منظور تھا کہ ان کی زبان سے نکلنے والے کچھ الفاظ میرے کانوں تک پہنچیں۔ چنانچہ میں نے ان سے ایک بہترین کلام سنا اور اپنے دل میں کہا۔ طفیل! تمہاری ماں تمہارے سوگ میں بیٹھے۔ تم ایک سمجھدار اور صاحب بصیرت شاعر ہو، کلام کا حسن و قبح تم پر مخفی نہیں ہے۔ آخر اس شخص کی باتیں سننے میں کیا چیز تمہارے اڑے آ رہی ہے۔ اگر اس کی باتیں اچھی ہوں گی تو قبول کر لینا اور اگر بُری ہوں گی تو انہیں چھوڑ دینا۔“

حضرت طفیلؓ کہانی کی اگلی کڑی اس سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں۔
 ”یہ سوچ کر میں وہیں رک گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھر کی طرف لوٹے تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہوا۔ اور جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو میں بھی ان کے پیچھے اندر چلا گیا اور ان سے کہا کہ ”اے محمدؐ آپ کی قوم کے لوگوں نے مجھ کو آپ سے دور رکھنے کے لیے

آپ کے متعلق مجھ سے بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں۔ وہ مسلسل مجھ کو آپ کے دین سے ڈراتے رہے حتیٰ کہ میں نے آپ کی باتیں نہ سُننے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اپنے کان رُوئی سے بند کر لیے تاکہ کہیں آپ کی کوئی بات میرے کانوں میں نہ پڑ جائے۔ لیکن یہ اللہ کی مرضی تھی کہ اس نے مجھے آپ کی باتیں سُنائیں اور وہ مجھے بہت پسند آئیں۔ آپ اپنا دین مجھے بتائیے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت میرے سامنے پیش کی اور مجھے دو سورتیں، سورہ اخلاص اور سورہ فلق پڑھ کر سُنائیں۔ خدا کی قسم اس سے پہلے میں نے اس کلام سے بہتر کوئی کلام نہیں سُنا تھا نہ ان کی باتوں سے بہتر کوئی بات دیکھی تھی۔ میں نے اسی وقت اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور کلمہ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔“

حضرت طفیلؓ اب داستان کے اس موڑ سے آگے بڑھتے ہیں۔

”پھر میں بہت دنوں تک مکے میں ٹھہرا رہا۔ اس مدت میں میں نے اسلام کی تعلیمات کو حاصل کیا اور جتنا ممکن ہوا قرآن حفظ کیا۔ پھر جب میں نے اپنے قبیلے کی طرف لوٹنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ میں اپنی قوم کا سردار ہوں۔ وہاں میری باتیں مانی جاتی ہیں، اب میں واپس جا کر انہیں اسلام کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ مجھے کوئی ایسی نشانی عطا فرمادے جو میری دعوت کے لیے ممد و معاون ثابت ہو، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کی ”اللہم اجعل لہ آیۃ“ ”خدا یا طفیل کو کوئی نشانی مرحمت فرمادے“ اس کے بعد میں اپنے قبیلے کی طرف چل پڑا، یہاں تک کہ جب میں ان کی بستی کے قریب ایک اونچی جگہ پہنچا تو میری دونوں آنکھوں کے درمیان چراغ جیسی ایک روشنی پیدا ہو گئی۔ یہ

دیکھ کر میں نے دعا کی کہ ہدایا! اس کے چہرے کے علاوہ کسی دوسری جگہ منتقل کر دے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر سمجھیں گے کہ یہ کوئی سزا ہے جو مجھے اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑنے کے جرم میں ملی ہے۔ تب وہ روشنی وہاں سے منتقل ہو کر میری لاکھی کے سرے پر آگئی، اور جب میں پہاڑ کی بلندی سے نیچے اتر رہا تھا تو میری لاکھی کے سرے پر چمکتی ہوئی وہ روشنی لوگوں کو ایک معلق قندیل کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جب نیچے اتر کر اپنے قبیلے میں پہنچا تو میرے والد صاحب جو بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ میرے پاس آئے میں نے ان سے کہا کہ ”ابا! مجھ سے پرے بیٹھے، اب آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا نہ میں آپ کا ہوں نہ آپ میرے۔“

”بیٹے! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ والد صاحب نے کہا۔

”میں مسلمان ہو چکا ہوں اور میں نے محمدؐ کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بیٹے! تم نے جو دین اختیار کیا ہے میں بھی اس کو اپناتا ہوں۔“ انھوں نے فرمایا۔

”تب آپ جا کر پہلے غسل کر لیجیے اور اپنے کپڑے پاک کر کے تشریف لائیے تاکہ میں آپ کو وہ دین سکھا دوں جس کو میں نے اختیار کیا ہے۔“ میں نے عرض کیا۔

پھر وہ اٹھے، جا کر غسل کیا اور اپنے کپڑے پاک کر کے میرے پاس آئے۔ میں نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور انھوں نے بخوشی اسے قبول کر لیا۔

پھر میری بیوی میرے پاس آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ ”مجھ سے

دور رہو۔ اب میرا اور تمہارا کوئی تعلق نہیں۔“

”میرے والدین آپ پر فدا ہوں، یہ کیوں؟ اس نے بڑی حیرت سے پوچھا
میں نے کہا کہ اسلام نے میرے اور تمہارے درمیان جدائی کی وسیع سطح

حائل کر دی ہے میں نے اسلام قبول کر کے دین محمدؐ کی پیروی اختیار کر لی ہے۔“

اس نے کہا کہ ”جو دین آپ کا ہے وہی دین میرا بھی ہے۔“

میں نے اس سے کہا کہ ”جاؤ، جا کر ذوشریٰ کے چشمے میں غسل کر کے

پاک ہو لو“ ذوشریٰ قبیلہ۔ دوس کے بت کا نام تھا جس کے پاس وہ چشمہ

تھا جو پہاڑ کی بلندی سے گرتا تھا، اس نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر

قربان ہوں۔ کیا آپ کو ذوشریٰ کی طرف سے بچوں کو کسی نقصان کا اندیشہ ہے کہ

مجھے اس چشمے میں غسل کرنے کے لیے بھیج رہے ہیں؟“ میں نے کہا کہ تباہی ہو

تمہارے اور ذوشریٰ کے لیے، میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ لوگوں کی نظروں سے

دُور جا کر وہاں غسل کر لو، میں تم کو اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ تفسیر و

بے جان پتھر ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

اس کے بعد وہ گئی، غسل کیا اور پھر میرے پاس آئی تو میں نے اس کے

سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جس کو اس نے بلا چون و چرا قبول کر لیا۔ پھر

میں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، مگر ابو ہریرہؓ کے سوا

سب نے اس کو قبول کرنے میں دیر کی۔ حضرت طفیل اس دلچسپ کہانی کو نئے

موڑ پر لاتے ہیں۔

”پھر میں ابو ہریرہؓ کو ساتھ لے کر مگرا آیا۔ جب بارگاہ رسالت میں حاضر

ہوا تو آپ نے دریافت فرمایا۔

”طفیل تمہارے پیچھے تمہارے قبیلے کا کیا حال ہے؟“ میں نے عرض

کیا کہ ”ان کے دلوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں جو حق کے دیدار میں مانع ہیں۔ وہ لوگ کفر شدید میں مبتلا ہیں ان کے اوپر سرکشی اور نافرمانی کی کیفیت مسلط ہے“ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر اپنے وضو کیا اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ آپ میرے قبیلے والوں کے حق میں بددعا فرمائیں گے اور وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ تو بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا ”آہ میری قوم“ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بددعا کرنے کے بجائے کہہ رہے تھے:

اللَّهُمَّ اهْدِ دَوْسًا..... اللَّهُمَّ اهْدِ دَوْسًا..... اللَّهُمَّ اهْدِ دَوْسًا.....
 هدایا قبیلہ دوس کو ہدایت دے..... هدایا..... هدایا.....

پھر آپ نے طفیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا کہ ”اپنے قبیلہ میں جاؤ، ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرو۔“

پھر میں مستقل طور پر قبیلہ دوس کے علاقے میں رہ کر انھیں اسلام کی طرف دعوت دیتا رہا حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور یکے بعد دیگرے بدر، اُحد اور خندق کے معرکے گزر گئے۔

اور جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت میرے ساتھ قبیلہ دوس کے اتنی گھرانے تھے جو اسلام قبول کر کے اس کی تعلیمات سے آراستہ ہو چکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں کے ساتھ خیبر کے مالِ عنیمت میں سے ہم لوگوں کو بھی حصہ عنایت فرمایا۔ ہم نے عرض کیا کہ ”اے اللہ کے رسول، آپ ہم لوگوں کو ہر غزوہ میں اپنے لشکر کے میمنہ پر مقرر فرماتے اور ہمارا شعار، ”مبرور“ مقرر فرمادیتے۔“

حضرت طفیلؓ اپنی داستان کے آخری حصے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔
 اس کے بعد میں برابر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہا یہاں
 تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکے پر فتح عنایت فرمائی۔ فتح مکہ کے بعد میں
 نے بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ مجھے عمرو بن حمہ
 کے بُت ذوالکفین کو جلانے کی ہم پر بھیج دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 نے مجھے اس کی اجازت دیدی۔ میں اپنے قبیلے کا ایک دستے لے کر روانہ ہوا،
 جب اس کے پاس پہنچ کر اسے نذر آتش کرنا چاہا تو بہت سے مرد عورتیں اور بچے
 میرے گرد جمع ہو گئے۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کہ اگر میں نے ذوالکفین کو کوئی
 نقصان پہنچایا تو آسمان سے بجلی گر کر مجھے ہلاک کر دے گی، لیکن میں اس کے
 پرستاروں کے سامنے ہی اس کی طرف بڑھا اور یہ کہتے ہوئے اس کو نذر آتش کر دیا۔
 يَا ذَا الْكُفَيْنِ لَسْتُ مِنْ عِبَادِكَ
 ذوالکفین میں تیرے پرستاروں میں سے
 مِيلَادُنَا أَقْدَمُ مِنْ مِيلَادِهَا
 نہیں ہوں ہماری پیدائش تیری پیدائش
 اِنِّي خَشَوْتُ النَّارَ فِي فُؤَادِكَ
 سے مقدم ہے میں نے تیرے دل میں
 آگ بھردی ہے۔

اور اس بت کے آگ میں بھسم ہو جانے کے ساتھ ہی قبیلہ دوس میں شرک
 کے باقی ماندہ آثار بھی جل کر خاکستر ہو گئے۔ اور پورا قبیلہ مشرک بہ اسلام ہو گیا۔
 حضرت عمرو بن طفیل رضی اللہ عنہ اس کے بعد ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم کے ساتھ رہے یہاں تک کہ آپ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ اور جب آپ
 کے رفیق حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت طفیلؓ بن عمرو نے اپنے
 آپ کو، اپنی تلوار کو اور اپنے لڑکے کو خلیفہ کی اطاعت کے لیے وقف کر دیا اور
 جب مرتدین اور مدعیان نبوت کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت

طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ مسلّمہ کذاب سے جنگ کے لیے جانے والی فوج کے ہراول میں شامل ہو گئے۔ یمامہ جاتے ہوئے راستے میں انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ انھوں نے اپنے رفیق سفر سے کہا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے تم اس کی تعبیر بیان کرو۔ ساتھیوں نے خواب کی تفصیل دریافت کی۔ انھوں نے کہا کہ ”میں نے دیکھا کہ میرا سر مونڈ دیا گیا ہے، میرے منہ سے ایک پرندہ نکلا، ایک عورت نے مجھے اپنے پیٹ میں داخل کر لیا اور یہ کہ میرا بیٹا عمر بڑی تیزی سے میرے پیچھے آ رہا ہے مگر میرے اور اس کے درمیان ایک رکاوٹ کھڑی کر دی گئی اور وہ میرے ساتھ اس میں داخل ہونے سے رہ گیا۔“

ساتھیوں نے کہا آپ کا یہ خواب بہت اچھا ہے، حضرت طفیل نے کہا کہ میں نے اپنے طور پر اس خواب کی یہ تعبیر کی ہے۔

”سر مونڈے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کاٹا جائے گا، اور پرندہ جو منہ کے راستے سے نکلا تو اس سے مراد میری روح ہے، اور عورت جس نے مجھے اپنے پیٹ میں داخل کیا، اس سے مراد میری قبر ہے جس میں میں دفن کیا جاؤں گا، امید ہے کہ مجھے شہادت نصیب ہوگی، اور میرے بیٹے کے میرا پیچھا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ بھی شہادت کی طلب میں میرا ساتھ دے گا مگر وہ اسے کچھ دنوں کے بعد حاصل کر سکے گا۔“

معرکہ یمامہ میں صحابی جلیل حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے زبردست واد شجاعت دی یہاں تک کہ وہ زخمی ہو کر گر گئے، اور زخموں کی تاب نہ لا کر نعمت شہادت سے بہرہ ور ہوئے مگر ان کے صاحبزادے عمرو بن طفیل برابر جنگ میں مصروف رہے یہاں تک کہ زخموں سے نڈھال ہو گئے اور

ان کا دایاں ہاتھ کٹ کر گر گیا۔ اور وہ اپنے والد اور اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو
یہاں کی سرزمین پر چھوڑ کر مدینہ واپس آگئے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک بار حضرت
عمر بن طفیل ان کی خدمت میں باریاب ہوئے اسی وقت حضرت عمرؓ کے
لیے کھانا لایا گیا۔ مجلس میں کچھ اور لوگ بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے،
انہوں نے سب کو کھانے کے لیے بلایا مگر حضرت عمر بن طفیل کھانے میں شریک
نہیں ہوئے، وہ کنارے ہٹ گئے تھے، حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا
بات ہے تم کھانے میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟ شاید تم اپنے کٹے ہوئے
ہاتھ پر ندامت محسوس کر رہے ہو اور کھانے میں شریک ہونے سے جھکتے ہو۔
انہوں نے کہا، جی ہاں امیر المؤمنین! یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ ”خدا کی قسم
جب تک تم اپنا کٹا ہوا ہاتھ اس کھانے میں نہیں ڈالو گے میں اس کو چکھ نہیں
سکتا۔ خدا کی قسم اہل مجلس میں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے جس کا کوئی عضو
جنت میں داخل ہو۔“

حضرت عمر بن طفیلؓ جب سے اپنے والد محترم سے جدا ہوئے تھے،
برابر اس خواب کی عملی تعبیر کی جستجو میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ جب جنگ
یرموک کا موقع آیا تو اس میں بڑے شوق سے شریک ہوئے۔ اور بڑی بے
جگری سے لڑے یہاں تک کہ اس دولت شہادت سے سرفراز ہو گئے جس کی
تمنا ان کے والد نے ان کے دل میں پیدا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ طفیل بن عمروؓ کی
رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔ وہ شہید ہیں اور شہید کے باپ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ

ہماری اس کہانی کا ہیرو اصحاب رسولؐ میں سے وہ شخص ہے جس کا نام عبداللہ بن حذافہ سہمی ہے۔ ممکن تھا کہ تاریخ اس شخص کی طرف بھی کوئی توجہ نہ کرتی اور اس کا کوئی خیال دل میں لائے بغیر اسی طرح گزر جاتی جس طرح اس سے پہلے کے لاکھوں عربوں کو نظر انداز کرتی ہوئی گزر گئی ہے لیکن اسلام نے عبداللہ بن حذافہ سہمی کے لیے ان کے دوہم عصر اور اپنے وقت کے عظیم بادشاہوں۔ شہنشاہ ایران کسریٰ اور شہنشاہ روم قیصر سے ملاقات کا موقع فراہم کر دیا تھا اور ان دونوں سے ان کی ملاقات کے ساتھ ایک ایسی داستان وابستہ ہو گئی جو ہمیشہ کے لیے زمانے کی یادداشت میں محفوظ ہو چکی ہے اور جس کو تاریخ کی زبان برابر دہراتی رہے گی۔

شہنشاہ ایران کسریٰ کے ساتھ ان کی ملاقات کا قصہ سہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کچھ صحابہ کے ذریعہ شاہان عجم کے پاس دعوتی خطوط ارسال فرمائے اور ان خطوط کے ذریعہ انھیں اسلام کی دعوت دینے کا ارادہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مہم کے دوران پیش آنے والے خطرات کا پورا پورا اندازہ تھا۔ کیوں کہ ان قاصدوں کو ایسے دور دراز علاقوں میں جانا تھا جن سے اس سے پہلے ان کو کوئی سابقہ نہیں پیش آیا تھا۔ مزید برآں یہ کہ وہ ان علاقوں کی زبانوں سے نا بلد اور ان حکمرانوں کے مزاج سے بالکل ناواقف تھے، پھر اس پر طرہ یہ کہ انھیں ان کو اپنے سابقہ ادیان کو

ترک کرنے، اپنے اقتدار و حکومت کے منصب سے الگ ہو جانے اور ایک ایسی قوم کے دین میں داخل ہونے کی دعوت دینی تھی جو ماضی قریب میں ان کے ماتحت رہ چکی تھی۔ یقیناً یہ ایک نہایت پرخطر سفر تھا جس پر روانہ ہونا موت کے منہ میں جانے اور اس سے زندہ و سلامت واپس آنا نیا جہنم پانے کے مترادف تھا۔ اس مہم کے متوقع خطرات کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مشورہ کے لیے جمع کیا اور ان کے سامنے خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ ”میں تم سے کچھ لوگوں کو شاہانِ عجم کے یہاں سفارت پر بھیجنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ اس میں مجھ سے اختلاف نہ کرنا جیسا کہ بنی اسرائیل نے عیسیٰ علیہ السلام سے اختلاف کیا تھا۔“

جواب میں صحابہ کرام نے عرض کیا۔

”اللہ کے رسول! آپ ہم کو جہاں چاہیں بھیج دیں۔ ہم آپ کا ہر پیغام خوشی خوشی پہنچانے کے لیے تیار ہیں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوک عرب اور شاہانِ عجم کے پاس اپنے خطوط پہنچانے کے لیے چھ صحابہ کو طلب فرمایا۔ ان میں سے ایک حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی بھی تھے۔ انھیں شہنشاہ ایران کسریٰ کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب کیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ نے اپنی اونٹنی کو سواری کے لیے تیار کیا۔ بیوی بچوں سے رخصت ہوئے اور تین تہا اپنی منزل مقصود کا رخ کیا، وہ راستے کے نشیب و فراز کو طے کرتے اور مصائب سفر کو برداشت کرتے ہوئے ایران پہنچے تو درباریوں سے کسریٰ کے ساتھ ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔

اور ان کو اس نخط سے بھی آگاہ کر دیا جسے وہ بادشاہ کے لیے لے کر آئے تھے، کسریٰ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے دربار کی تزئین و آرائش کا حکم دیا اور اپنے تمام بڑے بڑے افسروں کو دربار میں حاضری کی ہدایت کی۔ ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اس نے حضرت عبداللہ بن ہذاذہؓ کو دربار میں طلب کیا، اس وقت ان کے جسم پر ملکانسا کبیل اور معمولی سی عبا تھی اور ان کے حلیے سے بدوی عربوں کی سادگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن ان کا سر بہت بڑا اور قد کافی لمبا تھا اور ان کے سینے میں عظمت اسلام اور دل میں عزتِ اسلام کی آتش جو الہ شعلہ زن تھی۔ کسریٰ نے ان کو اپنی طرف بڑھے دیکھا تو ایک درپاہی کو اشارہ کیا کہ وہ خط ان کے ہاتھ سے لے لے۔ مگر حضرت عبداللہ نے کہا کہ نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ میں یہ خط اپنے ہاتھ سے آپ کے حوالہ کروں اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ کسریٰ نے درباریوں سے کہا کہ چھوڑ دو، اس کو میرے پاس آنے دو۔ حضرت عبداللہ نے کسریٰ کے قریب جا کر خط اس کے سپرد کر دیا۔ اور اس نے اپنے عرب سکرٹیری کو بلایا (جو حیرہ کا باشندہ تھا) اور اسے اپنے سامنے خط کھولنے اور اس کو پڑھنے کا حکم دیا۔ اس نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مِنْ مُحَمَّدٍ
رَسُولِ اللّٰهِ اِلٰی كَسْرٰی عَنۡیْمِ فَاذِی
سَلَامٍ عَلٰی مَنْ اَتْبَعَ الْهُدٰی.....

خدا نے رحمان و رحیم کے نام سے۔ محمد
رسول اللہ کی طرف سے شاہ ایران کسریٰ
کو سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی
پیروی کرے.....

خط کا اتنا حصہ سنتے ہی اس کے سینے میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی،

اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا اور گردن کی رگیں تن گئیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط کا آغاز اپنے نام سے کیا تھا۔ اس نے سکرٹری کے ہاتھ سے خط جھپٹ لیا۔ اور اس کے مندرجات کو جانے بغیر اسے پُرزہ پُرزہ کرتے ہوئے چیخ اٹھا ”میرا غلام، اور مجھے اس طرح خط لکھ رہا ہے؟“ پھر اس نے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کو دربار سے نکال باہر کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکال دیے گئے۔ حضرت عبداللہؓ دربار سے نکلے تو انھیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ اب اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ یا وہ قتل کر دیے جائیں گے یا انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے گا؟ لیکن پھر انھوں نے اپنے دل میں کہا۔

”خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پہنچانے کے بعد اب میرا جو بھی حشر ہو مجھے اس کی قطعی کوئی پرواہ نہیں ہے۔“

ادھر جب کسریٰ کا غصہ فرو ہوا تو اس نے حضرت عبداللہؓ کو دوبارہ اپنے سامنے پیش کیے جانے کا حکم دیا لیکن وہ نہیں ملے۔ اس کے آدمیوں نے بہتیرا تلاش کیا مگر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ان لوگوں نے جزیرہ عرب تک جانے والے تمام راستوں کو چھان مارا مگر وہ ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

جب حضرت عبداللہؓ دربار نبویؐ میں حاضر ہوئے تو انھوں نے کسریٰ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی مکمل روداد آپ کے گوش گزار کر دی اور خط پھاڑنے کے واقعے سے بھی آپ کو آگاہ کیا۔ ان کی پوری سرگزشت سن کر آپ نے صرف اتنا فرمایا ”مَزَّقَ اللهُ مَلَكَهُ“ اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دے۔

ادھر کسریٰ نے اپنے یمن کے گورنر باذان کو لکھا کہ اس شخص کے پاس جس نے حجاز میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اپنے دو قوی اور بہادر آدمیوں کو بھیجو اور انہیں حکم دو کہ اسے پکڑ لائیں اور میرے سامنے پیش کریں۔ حسب حکم باذان نے اپنے دو بہترین آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ کیے اور ان دونوں کے ہاتھ آپ کو ایک خط بھی بھیجا جس میں اس نے لکھا کہ ”آپ بلاتباخیر ان کے ساتھ کسریٰ کے سامنے پیش ہونے کے لیے چلے آئیں۔“ اس نے ان دونوں سے یہ بھی کہا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے مکمل آگاہی حاصل کریں اور ان کے متعلق مفصل معلومات فراہم کر کے اس کو آگاہ کریں۔ وہ دونوں پیہم اور تیز رفتاری کے ساتھ مراحل سفر طے کرتے ہوئے طائف پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ہوئی۔ ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ یثرب میں ہیں۔ اس کے بعد تاجر خوش و حرم اور شاداں و فرحال مکہ پہنچے اور انھوں نے قریش کو خوش خبری دیتے ہوئے کہا کہ ”یہ بات تمہارے لیے بڑی خوش کن اور مسرت انگیز ہے کہ ”کسریٰ“ محمد کے درپے آزار ہو گیا ہے اور اس نے تمہیں اس کے شر سے بچا لیا ہے۔“ ادھر ان دونوں نے مدینہ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور باذان کا خط آپ کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ ”شہنشاہ کسریٰ نے اپنے حاکم باذان کو ہدایت کی ہے کہ وہ آپ کو لانے کے لیے کسی کو بھیجے۔ چنانچہ ہم اسی لیے آتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ چلے چلیں، اگر آپ ہماری بات مان لیں تو ہم کسریٰ سے بات کر کے آپ کے لیے رعایت حاصل کر لیں گے اور آپ کو اس کی طرف سے پہنچنے والی ہر متوقع تکلیف اور اذیت سے بچالیں گے۔ لیکن اگر آپ نے ہماری بات ماننے سے انکار کیا تو

آپ خود اس کی قوت و سطوت سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ آپ کو اور آپ کی پوری قوم کو تباہ و برباد کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ باتیں سن کر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ”آج تو تم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس جاؤ، کل پھر آنا۔“ جب دوسرے دن وہ دونوں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ ”کیا آپ نے ہمارے ساتھ چلنے اور کسریٰ سے ملنے کے لیے خود کو تیار کر لیا ہے؟“ تو آپ نے جواب دیا کہ ”آج کے بعد تم کسریٰ سے نہیں مل سکو گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بیٹے شیریہ“ کو فلاں مہینے کی فلاں رات اس کے اوپر مسلط کر کے اسے ہلاک کر دیا ہے۔“

یہ سنا تو ان کے چہروں پر دہشت و حیرانی کے آثار ظاہر ہوئے اور وہ ٹکٹکی باندھ کر آپ کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

”جلنتے ہیں آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا یہ بات ہم باذان کو لکھ دیں؟“

”ہاں، اور اس کو یہ بھی لکھ دینا کہ میرا دین کسریٰ کی سلطنت کے آخری حدود تک پہنچے گا اور اُسے یہ بھی لکھ دو کہ اگر تم اسلام قبول کر لو تو میں تمہارا یہ سارا زیر حکومت علاقہ تمہارے سپرد کر کے تم کو تمہاری قوم کا حکمراں بنا دوں گا۔“ آپ نے جواب دیا۔

اس کے بعد وہ دونوں آپ سے رخصت ہو کر باذان کے پاس پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذی ہونی خبر سے اس کو مطلع کیا۔ باذان نے کہا کہ اگر محمدؐ کی یہ بات درست ہے تو یقیناً وہ اللہ کے نبی ہیں، اور اگر ایسا نہیں

ہے تو سوچوں گا کہ مجھے ان کے ساتھ کیا رویہ اپنانا چاہیے؟ پھر اس کے چند ہی روز بعد "شیرویہ" کا خط باذان کے پاس پہنچا، جس میں اس نے لکھا تھا۔ "میں نے کسریٰ کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے اس کو اپنی قوم کے انتقام میں قتل کیا ہے۔ اس نے ہماری قوم کے اشراف کو قتل کرنا، ان کی عورتوں کو کنیز بنانا اور ان کے اموال کو غصب کرنا اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ جب میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے تو اپنے پاس موجود تمام لوگوں سے میری اطاعت و فرمانبرداری کا عہد لے لو۔"

باذان نے اس خط کو پڑھتے ہی ایک طرف پھینک کر اپنے دخول اسلام کا اعلان کر دیا اور اس کے ساتھ ہی یمن میں رہنے والے سارے ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

یہ کہانی تو تھی حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کی کسریٰ شاہ ایران کے ساتھ ملاقات کی۔ رہی قیصر روم سے ان کی ملاقات کی کہانی تو وہ یہ ہے۔ قیصر روم کے ساتھ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات، خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ کے عہد خلافت میں ہوئی تھی۔ ان کی ملاقات کا یہ قصہ بھی حد درجہ دلچسپ اور نہایت حیرت انگیز ہے۔

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے سال ۳۰ھ میں رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کی تھی جس میں حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ مسلمان مجاہدین کی صداقت ایمانی عقیدہ کی پختگی اور راہ خدا میں ان کی جانبازی و جاں سپاری کی خبریں قیصر روم تک پہلے سے پہنچی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے فوجی افسروں کو اس بات کی ہدایت کر دی تھی کہ وہ اگر کسی مسلمان سپاہی کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اسے قتل نہ کریں بلکہ

زندہ اس کے سامنے پیش کریں۔ خدا کی مرضی، اتفاق سے حضرت عبداللہ بن
 خداؤرض رومی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے، رومی انھیں بادشاہ کے پاس
 لائے اور یہ کہتے ہوئے اس کے سامنے پیش کیا کہ ”یہ شخص محمدؐ کے ان اصحاب
 میں سے ہے جنھوں نے بالکل آغاز دعوت کے زمانے میں ان کی پکار پر لبیک
 کہا تھا۔ ہم اس کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے اور حسب حکم آپ کے
 سامنے پیش کر رہے ہیں۔“

قیصر انھیں دیر تک بغور دیکھتا رہا۔ پھر ان سے کہنے لگا۔

”میں تمہارے سامنے ایک بات پیش کر رہا ہوں۔“

”وہ کیا بات ہے؟“ حضرت عبداللہ نے پوچھا۔

”تم نصرا نیت قبول کر لو۔ اگر تم نے میری بات مان لی تو میں تمہیں

رہا کر دوں گا۔ اور تمہارے ساتھ عزت و تکریم کا بہترین سلوک کروں گا۔“

حضرت عبداللہ نے اس کی اس پیش کش کو پائے نفرت و حقارت سے

ٹھکرا دیا اور حد درجہ حزم و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ ناممکن ہے۔ موت مجھے تمہاری اس پیش کش سے ہزاروں گنا زیادہ

محبوب ہے۔“

میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک نہایت زیرک و دانا آدمی ہو۔ اگر تم میری

یہ پیش کش قبول کر لو تو میں تمہیں اپنے اقتدار میں شریک کر لوں گا۔“ قیصر

ان کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بادشاہ کی اس سطحی پیش کش کو سن کر بوجھل زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدی

بے ساختہ مسکرا پڑا، اور اس نے نہایت بے نیازی اور لاپرواہی کا مظاہرہ

کرتے ہوئے جواب دیا۔

”خدا کی قسم! اگر تم عرب و عجم کی ساری سلطنت بھی مجھے دیدو اور اس کے بدلے صرف یہ چاہو کہ میں ایک لمحے کے لیے دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پھر جاؤں تو یہ بھی میرے لیے قطعاً ناقابل قبول ہے۔“

”تب میں تم کو قتل کر دوں گا۔“ قیصر نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

”تمہاری مرضی، جو چاہو کرو!“ حضرت عبداللہؓ نے اس کی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔

پھر قیصر نے انھیں ٹنگلی پر باندھنے کا حکم دیا۔ اس کے اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور انھیں ٹنگلی پر باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے جلاذ سے رومی زبان میں کہا کہ ”اس کے دونوں ہاتھوں کے آس پاس تیر جلاذ، وہ اس وقت بھی انھیں نصرانیت قبول کرنے کی دعوت دے رہا تھا، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر اس نے جلاذ کو ان کے پاؤں کے ارد گرد تیر مارنے کا حکم دیا۔ اس دوران بھی وہ انھیں اپنا دین چھوڑنے کی دعوت دیتا رہا لیکن انھوں نے پھر بھی انکار کیا، تب قیصر نے جلاذ کو رک جانے کا اشارہ کیا اور کہا کہ اسے تختہ دار سے نیچے اتار دو۔ پھر اس نے ایک بڑی سی دیگ منگوائی، اس میں تیل ڈلوایا اور اسے آگ پر رکھوا دیا۔ جب تیل کھولنے لگا تو اس نے مسلمان قیدیوں میں سے دو آدمیوں کو بلوایا اور ان میں سے ایک کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈلوادیا۔ اس میں پڑتے ہی اس کے بدن کا گوشت الگ ہو گیا اور ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ قیصر نے حضرت عبداللہؓ بن خداؤذ کی طرف رخ کرتے ہوئے پھر ان کو نصرانیت قبول کرنے کی دعوت دی۔ مگر انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ اس کی دعوت کو رد کر دیا۔

جب وہ ان سے بالکل مایوس ہو گیا تو انہیں بھی اسی دیگ میں ڈالنے کا حکم دیا جس میں ان کے دونوں ساتھیوں کو ڈالا گیا تھا۔ جب انہیں کشاں کشاں دیگ کی طرف لے جایا جا رہا تھا، ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ سپاہیوں نے قیصر سے کہا کہ یہ رو رہا ہے۔ قیصر نے سمجھا کہ اب ان کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ اس نے سپاہیوں سے کہا کہ اسے میرے پاس لاؤ۔ جب حضرت عبداللہؓ اس کے پاس پہنچے تو اس نے پھر اس خواہش کا اعادہ کیا کہ وہ نصرایت اختیار کر لیں مگر جب انہوں نے انکار کر دیا تو اس نے دریافت کیا کہ پھر تم رو کیوں رہے تھے؟

”میرے دل میں یہ خیال آیا کہ عبداللہؓ! اس وقت تم اس دیگ میں ڈال دیے جاؤ گے اور تمہاری جان نکل جائے گی، حالانکہ میری خواہش تھی کہ کاش میرے بدن میں اتنی ہی جانیں ہوتیں جتنے بال ہیں اور وہ تمام جانیں ایک ایک کر کے خدا کے دین کے لیے اس دیگ میں ڈالی جاتیں۔ اسی خیال پر مجھے رونا آگیا“ حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا۔

”اچھا کیا تم میرے سر کو بوسہ دے سکتے ہو؟“ ہرقل نے پوچھا۔ ”اگر تم ایسا کرو تو میں تم کو رہا کر دوں گا۔“

”اور میرے دوسرے تمام مسلمان ساتھیوں کو بھی؟“ حضرت عبداللہؓ نے سوال کیا۔

”ہاں، دوسرے تمام مسلمان قیدیوں کو بھی تمہارے ساتھ رہا کر دیا جائے گا۔“ قیصر نے جواب دیا۔

حضرت عبداللہؓ حذافہؓ کہتے ہیں کہ میں نے دل میں سوچا کہ یہ اللہ کا ایک دشمن ہے، اگر میں اس کے سر کو بوسہ دے دوں تو یہ اس کے بدلے

میں مجھ اور تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کر دے گا۔ ایسا کر لینے میں میرا کیا نقصان ہے؟

پھر انھوں نے قریب جا کر اس کے سر کا بوسہ لے لیا۔ اور ہر قتل نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ تمام مسلمان قیدی جمع کر کے عبداللہ بن حذافہ کے حوالے کر دیے جائیں اور اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے اپنی یہ سرگزشت ان کو سنائی، جس کو سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور قیدیوں کو دیکھا تو فرمایا کہ ”ہر مسلمان پر یہ حق ہے کہ وہ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے سر کو بوسہ دے۔ اور یہ حق سب سے پہلے میں ادا کر رہا ہوں اور پھر انھوں نے حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے سر کا بوسہ لیا۔

— — —

حضرت عمیر بن وہب صحیح رضی اللہ عنہ

عمیر بن وہب صحیح جنگ بدر سے خود تو اپنی جان بچا کر صحیح سلامت واپس آگیا مگر اپنے پیچھے اپنے لڑکے کو مدینہ میں چھوڑ آیا جو مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان، باپ کے جرائم کے بدلے میں بیٹے سے مواخذہ کریں گے اور ان اذیتوں اور تکلیفوں کے بدلے میں اسے دردناک سزا دیں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت سے باز رکھنے اور ان کے صحابہ کو اس سے پھرنے کے لیے دیا کرتا تھا۔

ایک روز عمیر چاشت کے وقت بیت اللہ کا طواف کرنے اور وہاں رکھے ہوئے بتوں سے برکت حاصل کرنے کی نیت سے مسجد حرام میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے صفوان بن امیہ کو حجرہ کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا تو اس کی طرف بڑھ گیا۔ اور اسے سلام کیا۔ صفوان نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ”عمیر! آؤ بیٹھو۔ کچھ دیر باتیں کریں۔ باتوں میں وقت اچھا کٹ جاتا ہے“ عمیر صفوان کے بازو میں بیٹھ گیا اور دونوں کے درمیان جنگ بدر اور اس میں نازل ہونے والی مصیبت کا ذکر چھڑ گیا۔ وہ اپنے ان قیدیوں کو شمار کر رہے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔ صفوان نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

۱۔ کعبہ سے متصل شمال کی جانب ایک جگہ۔

”خدا کی قسم، ان لوگوں کے بغیر اب زندگی میں کوئی لطف باقی نہیں رہ گیا ہے۔“

”تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو،“ عمیر نے اس کی تائید کی۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”رب کعبہ کی قسم، اگر میرے ذمے وہ قرض نہ ہوتے جن کی ادائیگی کا میرے پاس کوئی بندوبست نہیں ہے۔ اور میرے اہل و عیال نہ ہوتے جن کے اپنے بعد ہلاک ہو جانے کا مجھے شدید اندیشہ لاحق ہے تو میں شرب جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ کر دیتا اور اس فتنے کا سدباب کر دیتا جو ہمارے لیے پریشانی کا سبب ہوا ہے۔“ (نعوذ باللہ من ذالک) پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

”مسلمانوں کے یہاں میرے لڑکے وہب کی موجودگی کے سبب میرا وہاں جانا ان کے لیے کسی تشویش یا شبہ کا باعث بھی نہیں ہوگا۔“

صفوان نے عمیر کی اس بات کو غنیمت سمجھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہاتھ آیا ہو ایہ بہترین موقع ضائع ہو جائے اس لیے اس کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”عمیر! تم اپنا سارا قرض میرے اوپر چھوڑ دو۔ چاہے وہ جتنا بھی ہو میں اسے تمہاری طرف سے ادا کر دوں گا اور تمہارے اہل و عیال کو اپنے اہل و عیال میں شامل کر کے زندگی بھر ان کی پوری پوری کفالت کرتا رہوں گا۔ میرے پاس جو دولت ہے وہ ان سب کے گزر بسر کے لیے کافی ہے۔ وہ اس سے خوش حالی اور فراخی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔“

”تب ہماری اس باہمی گفتگو کو اپنے ہی تک محدود رکھنا۔ کسی دوسرے کو اس سے آگاہ نہ کرنا۔“ عمیر نے صفوان کو رازداری کی تاکید کرتے ہوئے

کہا۔ ”میں تمہارے لیے اس کا ذمہ لیتا ہوں“ صفوان نے اس کو اطمینان دلایا۔
 عمیر مسجد سے اٹھ کر باہر آیا تو اس کے دل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلات
 بغض و کینہ کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ اپنے اس ناپاک منصوبے کی تکمیل کے لیے
 ضروری انتظامات میں مشغول ہو گیا۔ اس کو اپنے اس سفر اور اس کے مقصد کے
 بارے میں کسی شخص کی طرف سے کسی شبہ کا قطعی کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ کیونکہ
 اس وقت قیدیوں کے فدیے کی ادائیگی کے سلسلے میں ان کے قریشی رشتہ داروں
 کی شرب کی طرف آمدورفت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔

عمیر نے اپنی تلوار کو صیقل کرنے اور اس کو زہر میں بچھانے کا حکم دیا۔ پھر
 اس نے اپنی سواری کی اونٹنی طلب کی۔ وہ تیار کر کے اس کے سامنے لائی گئی
 اور وہ اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اور اپنے دل میں بغض و عداوت اور شر و فساد
 کے ناپاک جذبات لیے مدینہ کی سمت چل پڑا۔ عمیر مدینہ پہنچا اور اس نے
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے مسجد کا رخ کیا۔
 (نعوذ باللہ من ذالک) جب وہ مسجد کے دروازے کے پاس پہنچا تو اس نے
 اپنی اونٹنی کو بٹھایا اور اس سے نیچے اتر آیا۔ اس وقت حضرت عمر بن خطاب
 رضی اللہ عنہ کچھ صحابہ کرام کے ساتھ مسجد کے دروازے کے قریب ہی بیٹھے
 ہوئے تھے۔ وہ لوگ آپس میں جنگِ بدر اور اس میں قتل ہونے والے
 قریشیوں اور ان کے قیدیوں کا تذکرہ کر رہے تھے۔ وہ مسلمان ہاجرین
 والصار کے دلیرانہ کارناموں کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے
 اس احسان کو یاد کر رہے تھے جو اس نے مسلمانوں کی فتح و کامرانی اور ان
 کے دشمنوں کی ذلت آمیز شکست کی شکل میں ان کے اوپر کیا تھا۔ یکایک حضرت
 عمرؓ کی توجہ بدلی اور ان کی نظر عمیر بن وہب پر پڑی جو اپنی سواری سے اتر کر

تلوار لٹکائے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ گہرا اٹھٹھے اور یہ کہتے ہوئے دوڑے۔

”یہ کتنا، دشمن خدا عمیر بن وہب ہے... خدا کی قسم یہ کسی نیک ارادے سے نہیں آیا ہے۔ یہ مکہ میں مشرکین کو ہمارے خلاف اکسایا کرتا اور جنگ بدر سے پہلے ہمارے خلاف جاسوسی کیا کرتا تھا؛ پھر انھوں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔

”تم لوگ فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ جاؤ اور آپ کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو۔ اور ہوشیار رہنا کہیں یہ نصیحت مکار کوئی دھوکا نہ کر دے۔“ پھر وہ خود لپکے ہوئے حضور کی خدمت میں پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ دشمن خدا عمیر بن وہب ہے جو تلوار سے مسلح ہو کر آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ضرور کسی بُرے ارادے سے یہاں آیا ہے۔“

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ باتیں سن کر فرمایا کہ ”اے میرے پاس لے آؤ۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمیر بن وہب کے پاس پہنچے اور اس کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اور اس کی گردن کو تلوار کے نشیے میں پھنسا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس حال میں دیکھا تو فرمایا کہ ”عمر! اس کو چھوڑ کر دوڑ بھاڑ“ پھر آپ نے عمیر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اسے اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے آپ کے نزدیک جا کر جاہلیت کے طریقے سے سلام کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ”عمیر! اللہ تعالیٰ

نے ہم کو تمہارے طریقہ سلام سے بہتر سلام سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو "سلام" سے نوازا ہے جو اہل جنت کا طریقہ سلام ہے۔"

"واللہ آپ ہمارے طریقہ سلام سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے آپ کے سلام کرنے کا طریقہ بھی یہی تھا۔" عمیر نے کہا۔

"عمیر! تم یہاں کس غرض سے آئے ہو؟" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا۔

"اس قیدی کی رہائی کی اُمید لے کر آیا ہوں جو آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ اس کو رہا کر کے میرے اوپر احسان کیجئے۔" عمیر نے بہانہ بنایا۔

"پھر تمہاری کمر میں یہ تلوار کیسی لٹک رہی ہے؟" آپ نے اس کے دل کا چور پکڑتے ہوئے فرمایا۔

"اللہ ان تلواروں کا بُرا کرے، کیا جنگِ بدر کے روز یہ ہمارے کسی کام آسکیں؟ اس نے ایک اور پردہ ڈالنا چاہا۔

"عمیر! مجھ سے سچ سچ بتاؤ۔ تمہارے، یہاں آنے کا اصل مقصد کیا ہے؟" آپ نے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں کیا۔

"میں واقعی صرف اسی کام سے آیا ہوں۔" وہ ایک بار پھر سفید جھوٹ بولا۔

"نہیں صحیح بات یہ ہے کہ تم اور صفوان بن امیہ حجر کے پاس بیٹھے تھے۔ اور تم نے قریش کے ان مقتولین کا ذکر کیا جو بدر کے گڑھے میں ڈال دیے گئے تھے۔ پھر تم نے کہا تھا کہ اگر میرے اوپر قرض کا بوجھ اور اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری نہ ہوتی تو میں یثرب جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تمام کر دیتا۔ تو صفوان نے اس شرط پر کہ تم مجھے قتل کر دو گے تمہارے قرضوں کی ادائیگی اور تمہارے اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی لیکن

یاور کھو تمہارے اور اس ناپاک ارادے کے درمیان اللہ تعالیٰ حائل ہے۔
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔
 یہ سن کر تھوڑی دیر کے لیے عمیر بن وہب بالکل ہٹکا بگاڑ گیا۔ پھر بول
 اٹھا: ”میں گواہی دیتا ہوں کہ واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں“ اس کے بعد
 اس نے کہا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم آپ کی بیان کردہ آسمانی خبروں
 اور آپ کے اوپر نازل شدہ وحی کی تکذیب کرتے تھے۔ لیکن میرے اور صفوان
 کے باہن طے شدہ اس منصوبے کو میرے اور اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا
 تھا۔ خدا کی قسم اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہمارے اس خفیہ منصوبے سے
 خدا کے سوا کسی دوسرے نے آپ کو آگاہ نہیں کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ
 مجھے یہاں کھینچ لایا تاکہ مجھے دولت ایمان سے سرفراز فرمائے۔“ پھر وہ کلمہ شہادت
 پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ
 کرام سے فرمایا کہ ”اپنے بھائی کو دین سکھاؤ اسے قرآن کی تعلیم دو اور اس کے
 قیدی کو آزاد کر دو۔“

عمیر بن وہب کے اسلام لانے پر مسلمانوں نے غیر معمولی مسرت کا اظہار
 کیا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”جس وقت
 عمیر بن وہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا، وہ میرے
 نزدیک خنزیر سے بھی بدتر تھا، لیکن آج وہ میرے بعض بیٹوں سے بھی
 زیادہ مجھے محبوب ہے۔“

حضرت عمیر بن وہب مدینہ میں رک گئے۔ وہاں رک کر وہ اسلامی
 تعلیمات کے ذریعہ اپنے نفس کا تزکیہ کرتے، قرآن کے نور سے اپنے دل کو

منور کرتے اور اپنی زندگی کے بارونق اور مطمئن ترین ایام گزارتے رہے۔ اور اس مدت کے دوران صفوان بن امیہ اپنے دل کو جھوٹی امیدوں سے بہلاتا رہا۔ جب بھی اس کا گزر قریش کی مجلسوں کی طرف ہوتا، وہ اُن کو خوش خبری دیتے ہوئے کہتا کہ ”عنقریب تمہارے پاس ایک ایسی اہم اور مسرت افزا خبر آنے والی ہے جو بدر کے اندوہناک سانحہ کے اثرات کو تمہارے دلوں سے محو کر دے گی۔“

لیکن جب اس کے انتظار کی گھڑیاں طویل ہو گئیں تو بتدریج اضطراب بے چینی اس کے دل میں سرایت کرنے لگی اور لمحہ بہ لمحہ اس کی بے قراری اور پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ جیسے وہ انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔ وہ مدینہ کی طرف سے آنے والے قافلوں سے حضرت عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کرتا مگر کسی کے پاس اس کے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ہوتا تھا..... آخر کار ایک سوار نے آکر اس کو یہ اطلاع دی کہ ”عمیر نے اسلام قبول کر لیا ہے“ یہ خبر صفوان بن امیہ پر بجلی بن کر گری۔ کیوں کہ اس کو اس بات کا یقین تھا کہ عمیر بن وہب ہرگز اسلام قبول نہیں کر سکتا چاہے روتے زمین پر بسنے والا ہر شخص مسلمان ہو جائے۔

ادھر حضرت عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ برابر اپنے دین کا علم حاصل کرتے رہے اور جہاں تک ممکن ہوا اپنے رب کے کلام کو حفظ کرتے رہے۔ پھر ایک روز انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ماضی میں ایک طویل مدت تک میں خدا کے نور کو بھاننے کی کوشش میں لگا رہا اور دین اسلام کو قبول کرنے والوں کو سخت قسم کی اذیتیں دیتا رہا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ

مجھے مکہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ وہاں پہنچ کر میں قریش کو ٹھہرا
 اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دوں۔ اگر وہ
 میری دعوت قبول کر لیں گے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوگا۔ لیکن اگر انہوں نے
 میری اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو میں ان کو بھی بہت پرستی اور انکار
 اسلام کے جرم میں ویسی ہی اذیتیں دوں گا جیسی اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم
 کو اسلام قبول کرنے پر دیا کرتا تھا۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دیدی۔ اجازت پا کر وہ
 مکہ آئے اور صفوان بن امیہ کے گھر پہنچے اور اس سے بولے۔ ”صفوان!
 تمہارا شمار مکہ کے سربر آوردہ لوگوں اور قریش کے اصحاب عقل و دانش میں
 ہوتا ہے۔ کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو ان پتھروں کی پرستش اور ان کے لیے قربانی
 کرنے کا جو طریقہ تم لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے، وہ عقل کی رو سے زندگی گزارنے
 کا صحیح طریقہ ہے؟ میں تو اسے درست نہیں سمجھتا، اور اس بات کی گواہی دیتا
 ہوں کہ اللہ کے سوا حقیقت میں کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم
 اس کے رسول ہیں۔“

پھر حضرت عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ مکہ میں دعوت الی اللہ کے کام میں
 جٹ گئے اور بڑی تعداد میں لوگ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔
 اللہ تعالیٰ حضرت عمیر بن وہب کو بہترین اجر سے نوازے اور ان کی قبر کو نور سے
 بھر دے۔ آمین۔

حضرت برابر بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ

وہ پراگندہ مو، نجیف الجثہ، ہلکے پھلکے، ڈبلے پتلے اور چھری سے بدن کے مالک تھے۔ بظاہر ان کی شخصیت میں کوئی کشش نہ تھی۔ دیکھنے والے ان کے اوپر ایک اچھٹی ہوئی نظر ڈال کر اپنی نگاہیں پھیر لیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی شجاعت و جواں مردی کا یہ حال تھا کہ جنگ مغلوبہ میں دشمن کی کثیر تعداد کو قتل کرنے کے علاوہ انھوں نے انفرادی جنگ میں ایک سو مشرکین کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ تلوار کے دھنی، نہایت شجاع اور جنگ کے وقت آگے بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والے تھے۔ اسی لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مختلف صوبہ جات کے گورنروں کو یہ حکم دیا تھا کہ انھیں شکر مجاہدین کے کسی دیتے کی قیادت پر مامور نہ کیا جائے، کیونکہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ اپنے اقدام کے ذریعہ انھیں ہلاکت میں ڈال دیں گے۔

یہ ہیں خادم رسول حضرت انس کے بھائی حضرت برابر بن مالک انصاری۔ ان کی جرات و شجاعت کے کارنامے اتنے زیادہ ہیں کہ اگر ہم ان کو بیان کرنے لگیں تو سلسلہ بیان دراز اور وقت تنگ ہو جائے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دلیرانہ کارناموں میں سے صرف ایک کا ذکر کر دیا جائے جو ان کے دوسرے کارناموں پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہو۔

اس کہانی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اور آپ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے، جب عرب قبائل

بڑی تعداد میں دین اسلام کو چھوڑ کر اس میں سے بالکل اسی طرح نکل گئے جس طرح وہ فوج در فوج اس میں داخل ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ مکہ، مدینہ، طائف اور ادھر ادھر کے چند قبائل کے سوا جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے ایمان پر جمادیا تھا، کوئی اسلام پر باقی نہیں رہ گیا تھا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ ان ہلاکت خیز اور تباہ کن فتنوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اور ان کے استقبال کے لیے بلند اور مضبوط پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ ان فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے ہاجرین و انصار پر مشتمل گیارہ لشکر ترتیب دیے اور ان کے لیے گیارہ علم تیار کر کے ان کے قائدین کے حوالے کرتے ہوئے انھیں جزیرہ عرب کے مختلف علاقوں میں روانہ کیا تاکہ وہ مرتدین کو حق و ہدایت کی راہ پر واپس لائیں اور دین حق سے منحرف ہونے والوں کو بزورِ شمشیر جادہ حق کی طرف پلٹ آنے پر مجبور کر دیں۔ ان مرتدین میں مسیلمہ بن حبیب کذاب کا قبیلہ بنو حنیفہ کثرت تعداد، جنگی بہادری اور شجاعت و دلیری کے لحاظ سے سب سے زیادہ مضبوط تھا۔ مسیلمہ کی حمایت و تائید کے لیے اس کے اپنے قبیلے اور اس کے حلیف قبائل کے چالیس ہزار جنگ جو اکٹھا ہو گئے تھے۔ ان کی اکثریت نے مسیلمہ پر ایمان لانے کے بجائے محض قبائلی عصبیت کی بنا پر اس کی پیروی اختیار کی تھی۔ ان میں سے بعض کا یہ کہنا تھا کہ ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ جھوٹا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں مگر ربیعہ کا کذاب (مسیلمہ) مضر کے صادق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلے میں ہمارے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

مسیلمہ نے مسلمانوں کے پہلے لشکر کو، جو اس سے لڑنے کے لیے حضرت عکرمہ بن ابی جہل کی قیادت میں نکلا تھا، شکست دے کر اٹے پاؤں واپس

ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کی جگہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید کی سرکردگی میں دوسری فوج روانہ کی جس میں انھوں نے انصار و ہاجرین میں سے بڑے بڑے صحابہ کرام کو جمع کر دیا تھا۔ اس فوج کے ہراول میں حضرت برار بن مالک انصاریؓ اور کچھ دوسرے بہادر اور جاتبار مسلمان مجاہدین شامل تھے۔ دونوں فوجیں نجد میں یمامہ کے مقام پر ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں اور جنگ شروع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد سلیمہ کا پلہ بھاری ہونے لگا، زمین مسلمانوں کے پاؤں کے نیچے سے سرکنے لگی اور وہ اپنی جگہ سے ہٹنے لگے۔ یہاں تک کہ سلیمہ کے حامیوں نے آگے بڑھ کر حضرت خالد بن ولید کے نیچے پر حملہ کر دیا اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اگر بنو حنیفہ ہی کے ایک شخص (مجاہد) نے امان نہ دی ہوتی تو انھوں نے ان کی بیوی حضرت ام حکیم کو قتل بھی کر دیا ہوتا۔ اس وقت مسلمانوں کو زبردست خطرے کا احساس ہوا۔ انھوں نے بڑی شدت کے ساتھ اس بات کو محسوس کیا کہ اگر وہ سلیمہ سے شکست کھا جاتے ہیں تو آج کے بعد نہ کوئی اسلام کی حمایت میں کھڑا رہ سکے گا نہ پورے جزیرہ عرب میں خدائے وحدہ لا شریک کی پرستش ممکن ہوگی۔ یہ احساس ہوتے ہی حضرت خالد بن ولید بڑی سرعت کے ساتھ فوج کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی اس طرح از سر نو ترتیب قائم کی کہ ہاجرین کو انصار سے اور بادیہ نشین قبائل کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا اور ہر قبیلہ کے افراد کو انھیں میں سے کسی کی قیادت میں منظم کیا تاکہ جنگ میں ہر ایک فریق کی کارکردگی کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے اور یہ معلوم ہو جائے کہ مسلمان فوج کس محاذ پر کمزور پڑ رہی ہے۔

دونوں فوجوں میں ایسی سخت اور خونریز جنگ برپا ہوئی کہ اس سے قبل

مسلمانوں کی جنگ کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں گزری تھی۔ مسیلمہ کی قوم نے اس جنگ میں غیر معمولی ثبات قدمی کا مظاہرہ کیا۔ وہ معرکہ کارزار میں مضبوط چٹانوں کی طرح ڈٹ گئے اور انھوں نے اپنے مقتولین کی کثرت کی کوئی پرواہ نہیں کی، نہ اس کی وجہ سے انھوں نے اپنے حوصلے پست ہونے دیے نہ ان کے قدموں میں لغزش ہوئی، مسلمان مجاہدین نے بھی حیرت انگیز بہادری اور بے مثال جواں مردی کے مظاہرے کیے اور جرأت و شجاعت کے ایسے ایسے شاندار اور فقید المثال کارنامے انجام دیے کہ اگر ان کو یک جا کر کے مرتب کر دیا جائے تو ایک لاجواب رزمیہ وجود میں آجائے۔

یہ ہیں انصار کے علم بردار حضرت ثابت بن قیسؓ، وہ اپنے جسم پر خوشبو لگاتے ہیں، کفن پہنتے ہیں اور زمین میں گڑھا کھود کر اس میں پنڈلیوں تک اتر کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اپنی جگہ پر جم کر لڑتے ہیں۔ اپنے قبیلے کے جھنڈے کی حفاظت کرتے ہیں اور لڑتے لڑتے شہید ہو جاتے ہیں، اور یہ ہیں عمر فاروقؓ کے بھائی حضرت زید بن خطابؓ، جو مسلمانوں کو لٹکار رہے ہیں "لوگو! دشمن پر کاری ضرب لگاؤ اور اس کو مارتے کاٹتے آگے ہی بڑھتے رہو۔ لوگو! میں اس کے بعد اب اس وقت تک کوئی بات نہیں کروں گا جب تک مسیلمہ کو شکست نہ ہو جائے یا میں خدا کی بارگاہ میں حاضر نہ ہو جاؤں تاکہ وہاں اپنی معذرت پیش کر سکوں۔" پھر انھوں نے دشمن پر ایک زبردست حملہ کیا اور برابر لڑتے رہے یہاں تک کہ جام شہادت نوش فرمایا۔ اور یہ ہیں حضرت ابو حذیفہؓ کے مولیٰ، حضرت سالمؓ۔ ہاجرین کا علم ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے متعلق ہاجرین کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان کی طرف سے کسی کمزوری یا پسپائی کا اظہار نہ ہو، تو انھوں نے کہا کہ ہم کو خطرہ ہے کہ کہیں آپ کی

طرف سے دشمن ہمارے اوپر حملہ نہ کر دیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ”اگر میری طرف سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار ہو اور دشمن میری طرف سے تمہارے اوپر حملہ کرنے کی راہ پالے تو میں بدترین حاملِ قرآن ٹھہروں گا“ یہ کہہ کر وہ دشمن پر ٹوٹ پڑے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے لیکن جوانِ مردی اور شجاعت کے یہ سارے کارنامے حضرت برار بن مالکؓ کی دلیری و شجاعت کے آگے بیچ ہیں۔

جب حضرت خالد بن ولیدؓ نے جنگ کے شعلوں کو تیزی سے بھڑکتے ہوئے دیکھا تو حضرت برار بن مالکؓ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے کہ ”انصار کی نوجوان! دشمن پر حملہ کرو“

تو حضرت برار بن مالکؓ نے اپنے قبیلے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”انصار کے لوگو! تم میں سے کوئی شخص مدینہ واپس لوٹنے کی بات نہ سوچے۔ آج کے بعد تمہارے لیے مدینہ نہیں ہے۔ آج تو صرف حدائے وحدہ لا شریک کی رضا کی طلب ہے اور..... اور پھر جنت ہے“ پھر انہوں نے مشرکین پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ان کے قبیلے کے لوگوں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ صفوں کو چیرتے، شمشیر زنی کے جوہر دکھاتے اور دشمنوں کی گردنوں پر اس کی تیزی آزماتے رہے۔ یہاں تک کہ مسیلہ اور اس کے سپاہیوں کے قدم اکھڑ گئے اور انہوں نے بھاگ کر اس باغ میں پناہ لی جو اس کے بعد تاریخ میں ”حدیقۃ الموت“ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس لیے کہ اس روز اس باغ میں بہت کثیر تعداد میں لوگ قتل ہوئے اور کشتوں کے پتے لگ گئے تھے۔

”حدیقۃ الموت“ ایک بہت وسیع و عریض باغ تھا اور اس کی فصیلیں نہایت بلند و بالا تھیں۔ مسیلہ اور اس کے ہزاروں ہمنواؤں نے اس میں پناہ لینے کے بعد اس کے دروازے اندر سے بند کر لیے اور اس کی اونچی دیواروں کے پیچھے

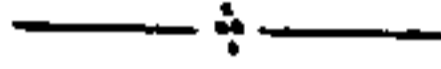
خود کو محفوظ کر لیا اور اندر سے مسلمانوں پر تیروں کی بارش کرنے لگے۔ اس وقت اسلام کے جانباز اور بہادر فرزند حضرت برابر بن مالکؓ آگے بڑھے اور بولے کہ لوگو! مجھے ڈھال پر بٹھا کر نیزوں کے سہارے اوپر اٹھاؤ اور دروازے کے قریب باغ کے اندر پھینک دو تاکہ یا تو میں شہادت کا درجہ حاصل کروں یا تمہارے لیے دروازہ کھول دوں۔ حضرت برابرؓ نہایت ہلکے پھلکے اور ڈبلے پتلے تھے۔ وہ فوراً ایک ڈھال پر بیٹھ گئے اور دسیوں نیزوں نے انھیں اوپر اٹھالیا اور ان کو سہ لقمے الموت کے اندر مسلیمہ کے ہزاروں فوجیوں کے درمیان پھینک دیا گیا۔ اندر پہنچے ہی وہ دشمنوں کے ادیر بھلی بن کر گرے۔ وہ دروازے کے پاس برابر لڑتے رہے اور ان کی گردنیں تلوار سے قلم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے دس آدمیوں کو قتل کر دیا اور دروازہ کھول دیا۔ اس وقت ان کے جسم پر تیروں اور تلواروں کے آسی سے اوپر زخم تھے۔ مسلمانوں نے دیواروں اور دروازوں کے راستے حقیقہ الموت پر دھاوا بول دیا اور اس میں پناہ لینے والے مرتدین کو اپنی تلواروں کی دھار پر رکھ لیا اور تقریباً بیس ہزار مشرکین کو واصل جہنم کرنے کے بعد مسلیمہ تک پہنچ کر اسے بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ حضرت برابرؓ کے زخموں کا علاج کرنے کے لیے ان کو خمیے میں اٹھا کر لایا گیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ دوا علاج کے سلسلے میں ایک ماہ تک ان کے پاس ٹھہرے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا برکامل سے نوازا اور ان کے ہاتھوں مسلمانوں کو شاندار فتح عنایت فرمائی۔

حضرت برابر بن مالکؓ اس دولت شہادت کو پانے کی حسین آرزو کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رہے اور برابر اس کی جستجو میں سرگرداں رہے جو حقیقہ الموت کے روز ان کو حاصل ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ وہ اپنے اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے سرفراز ہونے کے لیے یکے

بعد دیگرے بہت سے معرکوں میں شریک ہوئے اور ان میں خطرناک ترین مواقع پر پہنچ کر لڑتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آگیا جب مسلمانوں نے ایران کے مشہور شہر "تستر" کو فتح کرنے کے لیے اس کا محاصرہ کر لیا۔ اہل فارس ایک نہایت مستحکم مضبوط قلعے میں پناہ گیر ہو گئے اور مسلمانوں نے اس کو چاروں طرف سے اپنے محاصرہ میں لے لیا۔ جب محاصرہ کا یہ سلسلہ کافی طویل ہو گیا اور اہل ایران کی پریشانیاں حد سے بڑھ گئیں تو وہ قلعہ کی فصیلوں سے لوہے کی زنجیریں لٹکانے لگے جن کے سروں سے فولادی انکس جڑے ہوئے تھے جن کو آگ میں تپا کر انکاروں کی طرح سُرخ کر دیا جاتا۔ وہ نوکیلے اور دھکتے ہوئے انکس مسلمانوں کے جسموں میں دھنس جاتے اور وہ ان میں پھنس کر رہ جاتے اور ایرانی اوپر سے زنجیروں کے ذریعہ ان کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ ان انکسوں میں پھنس کر مسلمان یا تو موت کے گھاٹ اتر جاتے یا قریب الموت ہو جاتے تھے۔ انہی میں سے ایک انکس حضرت برادر کے بھائی حضرت انس بن مالک کے جسم میں دھنس گیا۔ یہ دیکھتے ہی برادر قلعے کی دیوار کی طرف لپکے اور جھپٹ کر اس زنجیر کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا جو ان کے بھائی کو اٹھائے لیے جا رہی تھی، وہ اس کو اپنے بھائی کے جسم سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کوشش میں ان کے دونوں ہاتھ برسی طرح جل گئے مگر انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے بھائی کو اس انکس کی گرفت سے چھڑائے بغیر زنجیر کو اپنے ہاتھوں سے نہیں چھوڑا۔ بھائی کو نجات دلانے کے بعد وہ زمین پر گر پڑے اس وقت ان کے ہاتھوں کا سارا گوشت جل چکا تھا۔ اور صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔

اس غزوہ کے موقع پر حضرت برادر بن مالک نے دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو نعمت شہادت سے بہرہ ور فرمائے ان کی یہ دعا بارگاہ رب العزت میں

شرف قبولیت سے ہمکنار ہوئی اور ان کی وہ دیرینہ تمنا پوری ہو گئی جس کو وہ
 مدتوں سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ وہ میدان جنگ میں شہید ہو کر
 گئے اور دیدارِ خداوندی کی ہمیش بہا اور قابلِ رشک نعمت سے سرفراز
 ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ حضرت برادر بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ کے چہرے
 کو جنت میں شگفتہ اور تروتازہ رکھے اور اپنے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
 کے دیدار سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ ان سے راضی ہو جائے اور ان
 کو خوش کر دے۔ آمین۔



اُمُّ الْمُؤْمِنِينَ حَضْرَتِ اُمِّ سَلْمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا

حضرت ام سلمہؓ غیر معمولی شرف و فضیلت کی حامل خاتون تھیں۔ ان کے والد کا شمار قبیلہ بنی مخزوم کے مشہور اور اہم سرداروں اور عرب کے معدودے چند اصحابِ جو دو سخا میں ہوتا تھا، وہ اپنی سخاوت و فیاضی کی وجہ سے ”زاد الراکب“ کے لقب سے مشہور تھے۔ کیوں کہ ان کے علاقے کا قصد کرنے والے قافلے اور ان کی معیت میں سفر کرنے والے مسافر کبھی اپنے ساتھ زادِ راہ لے کر چلنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے جو بالکل آغازِ دعوت کے زمانے میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان سے پہلے صرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان چند لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا جن کی تعداد دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے بھی کم تھی۔ ان کا نام ہند بنت ابی امیہ تھا، لیکن ان کی کنیت ”ام سلمہ“ ان کے نام سے زیادہ مشہور تھی۔

وہ اپنے شوہر حضرت ابو سلمہؓ کے ساتھ ہی اسلام لائیں۔ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والی دوسری خاتون تھیں۔ یہ شرف ان سے پہلے صرف حضرت خدیجہؓ کو حاصل تھا۔ جیسے ہی ان کے اور ان کے شوہر کے مسلمان ہونے کی خبر قریش کو ملی، وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے، ان کے اندر ایک ہیجان برپا ہو گیا اور انہوں نے ان دونوں کو ایسی اذیت ناک اور عبرت انگیز سزائیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا جو مضبوط چٹانوں کو ہلا دینے کے لیے کافی تھیں۔ لیکن انہوں نے ان سزاؤں کے سامنے نہ تو کسی ضعف و کمزوری

کا اظہار کیا نہ ہمت ہاری نہ کسی قسم کے تردد و تذبذب میں مبتلا ہوئے۔
 جب اذیت رسائی کا یہ سلسلہ سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا اور
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی
 اجازت دے دی۔ تو یہ دونوں ہجرت کرنے والے ”قافلہ ہاجرین“ میں
 پیش پیش تھے۔ حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر اجنبی دیار اور انجانے علاقے
 کی طرف چل پڑے اور اپنے پیچھے مکہ میں اپنا عالی شان مکان، اپنا بلند
 مقام اور اپنی خاندانی شرافت چھوڑ گئے۔ وہ اپنے اس عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ
 سے اجر و ثواب کے خواہاں اور اس کی رضا و خوشنودی کے طالب تھے۔
 اگرچہ حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر کو نجاشی (شاہ حبشہ) کی حمایت و
 سرپرستی میں نہایت سکون و اطمینان کی زندگی نصیب ہوئی تھی مگر اس
 کے باوجود مہبط وحی (مکہ) واپس جانے اور سرچشمہ ہدایت (محمد صلی اللہ علیہ
 وسلم) کے دیدار کی آرزو ان کے دلوں کو ہر وقت مضطرب اور بے چین رکھتی
 تھی۔ اور پھر جب سرزمین حبشہ میں مقیم ہاجرین کے پاس مسلسل اس طرح
 کی خبریں آنے لگیں کہ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا ہے، حضرت
 حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت عمرؓ بن خطاب کے مسلمان ہو جانے کی وجہ
 سے مسلمانوں کی طاقت کافی بڑھ گئی ہے اور قریش کی اذیت رسائیوں اور
 ان کے ظلم و ستم کا زور بڑی حد تک ٹوٹ چکا ہے۔ تو ان میں سے کچھ
 لوگوں نے مکہ واپس لوٹ جانے کا ارادہ کر لیا۔ دیار حرم میں پہنچنے کا شوق
 اور بارگاہ رسالت میں حاضری کا اشتیاق انہیں کھینچنے لے جا رہا تھا۔ چنانچہ
 واپسی کے اس سفر میں بھی حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر سب سے آگے
 تھے۔ لیکن واپس آنے والوں پر بہت جلد یہ بات منکشف ہو گئی کہ ان کے

پاس اس سلسلے میں جو خبریں پہنچی تھیں، ان میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا تھا۔ اور مسلمانوں نے حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد جو تھوڑی سی پیش قدمی کی تھی، قریش کی طرف سے اس کی شدید مزاحمت ہوئی ہے۔

اس کے بعد مشرکین نے مسلمانوں کو ستانے اور ان کو خوف زدہ کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے اور ان کے ظلم و ستم کی چکی پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ چلنے لگی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو ہجرت کر کے مدینہ چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اور حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر نے قریش کی اذیتوں سے نجات حاصل کرنے اور اپنے دین کی حفاظت کے خیال سے جلد از جلد ہجرت کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر یہ کام ان کے لیے اتنا آسان نہ تھا جتنا وہ گمان کرتے تھے۔ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان کو ایسے سخت اور المناک حالات سے گزرنا پڑا جن کے سامنے تمام سختیاں ہیچ نظر آتی ہیں۔ ہم ہجرت کی یہ المناک داستان خود حضرت ام سلمہؓ کی زبانی بیان کرتے ہیں کیونکہ اس سلسلے میں ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور ان کی تصویر کشی زیادہ مکمل ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ۔

”جب ابو سلمہؓ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی ٹھکانی تو انہوں نے میرے لیے سواری کا اونٹ تیار کیا، مجھے اس پر سوار کیا اور میرے بچے سلمہ کو میری گود میں ڈالا اور کسی چیز کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر اونٹ کی نیکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم مکہ سے باہر نکلتے، میرے قبیلہ (بنی مخزوم) کے کچھ لوگوں نے ہم کو جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ ہمارا

راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور ابو سلمہ سے کہنے لگے کہ ”تم اپنے متعلق جو
 چاہو فیصلہ کرو مگر تمہاری بیوی سے تمہیں کیا سروکار؟ یہ ہماری بیٹی ہے
 ہم تم کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ اس کو اپنے ساتھ لیے
 ہوئے درد کی ٹھوکریں کھاتے پھرو۔“ پھر وہ ان کے اوپر جھپٹ پڑے اور
 مجھے زبردستی ان بے چھین کر الگ کر دیا۔ جب میرے شوہر ابو سلمہ کے قبیلے
 بنو عبدالاسد کے لوگوں نے یہ دیکھا کہ میرے قبیلہ والوں نے مجھے اور میرے
 بچے کو ابو سلمہ سے چھین لیا ہے تو وہ نہایت غضبناک ہوئے اور کہنے لگے کہ
 ”خدا کی قسم جب تم نے اپنے خاندان کی لڑکی کو ہمارے قبیلہ کے آدمی سے
 چھین لیا تو ہم بھی بچے کو اس کے پاس نہیں رہنے دیں گے۔ وہ ہمارے خاندان
 کا بچہ ہے اور ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں۔“ پھر میری آنکھوں کے سامنے
 ہی وہ میرے بچے کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔ اس کھینچا تانی میں اس کا ہاتھ
 بھی اکھڑ گیا اور وہ اس کو چھین کر لے گئے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا
 کہ جیسے میرا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا ہے اور میں اکیلی رہ گئی ہوں۔
 ایک طرف میرے شوہر اپنے دین اور اپنی جان کی حفاظت کے لیے مدینہ چلے
 گئے۔ دوسری طرف میرے بچے کو بنو عبدالاسد نے جبراً مجھ سے چھین لیا
 اور میرے قبیلہ بنو مخزوم نے زبردستی مجھے اپنے پاس روک لیا۔ اس طرح
 ذرا سی دیر میں مجھے، میرے شوہر اور میرے بچے کو ایک دوسرے سے
 جدا کر دیا گیا۔

پھر حضرت ام سلمہؓ اپنی داستان کا اگلا حصہ بیان کرتی ہیں۔
 ”اس کے بعد سے میرا روزمرہ کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح سویرے مکہ کے
 باہر ابطح کی طرف نکل جاتی اور اس جگہ جا کر بیٹھ جاتی جہاں میرے ساتھ یہ المیہ

پیش آیا تھا میں ان بیٹی ہونی گھڑیوں کو یاد کرتی رہتی، جب میرے شوہر اور بچے کے درمیان جدائی کی دیوار حائل کر دی گئی تھی۔ میں برابر روتی رہتی یہاں تک کہ رات کے سائے گہرے ہو جاتے۔ میری یہ حالت ایک سال یا اس کے لگ بھگ رہی آخر کار میرے بنی عم میں سے ایک شخص کا گزر میری طرف سے ہوا، اس کو میرے اس حال زار پر ترس آیا۔ اور اس نے میرے قبیلہ والوں سے کہا کہ تم لوگ اس غریب کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ تم نے اس کو اس کے شوہر اور بچے سے جدا کر کے اس کے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ وہ برابر ان کو میرے حق میں ہموار کرتا اور ان کے جذبہ ترحم کو ہمیز کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ اس حد تک نرم ہو گئے کہ انہوں نے مجھے اپنے شوہر کے پاس چلے جانے کی اجازت دیدی۔ لیکن میرے لیے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ میں اپنے تختِ جگر کو مکہ میں بنی عبدالاسد کے یہاں چھوڑ کر خود اپنے شوہر کے پاس مدینہ چلی جاتی اور اس صورت میں جب کہ میں خود دار الہجرت (مدینہ) میں ہوں اور میرا کم رس بچہ مکہ میں اس حال میں پڑا ہو کہ اس کے متعلق مجھے کوئی خبر نہ ملے، کیسے ممکن تھا کہ میری ماتا کی آگ ٹھنڈی ہو اور میری آنکھوں سے اُڈتے ہوئے آنسوؤں کا سیلاب تھم سکے، بعض لوگوں نے جب مجھ کو اس طرح رنج و غم پھیلے اور کرب و الم سے نبرد آزما ہوتے دیکھا تو ان کو میری حالت پر رحم آیا اور انہوں نے بنی عبدالاسد سے بات کر کے ان کو میرے ساتھ نرم رویتہ اپنانے پر آمادہ کر لیا چنانچہ انہوں نے میرے بچے سلمہ کو مجھے واپس کر دیا،

”اب میں نے مکہ میں ٹھہر کر مدینہ جانے والے کسی ہم سفر کے انتظار میں وقت گنوانا اور اپنی روانگی میں مزید تاخیر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس اثنا میں کہیں کوئی ایسا حادثہ نہ پیش آجائے جو مجھے میرے شوہر

کے پاس پہنچنے سے روک دے۔ اس لیے میں نے جھٹ پٹ اپنی سواری کے اونٹ کو تیار کیا، بچے کو گود میں لیا اور اپنے شوہر سے ملنے کے لیے مدینہ کی طرف چل پڑی جب میں تنعیم کے مقام پر پہنچی تو میری ملاقات عثمان بن طلحہ سے ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ”زاد الراکب“ کی بیٹی! کہاں جا رہی ہو؟“

”اپنے شوہر کے پاس مدینہ جا رہی ہوں“ میں نے جواب دیا۔
 ”کیا تمہارے ساتھ کوئی اور نہیں ہے؟“ انہوں نے دریافت کیا۔
 ”نہیں، خدائے تعالیٰ اور میرے اس بچے کے سوا میرے ساتھ دوسرا کوئی نہیں ہے؟“ میں نے جواب دیا۔

”خدا کی قسم، جب تک تم مدینہ نہ پہنچ جاؤ میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا“ یہ کہہ کر انہوں نے میرے اونٹ کی نکیل تھام لی اور مجھے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ خدا کی قسم اس سے پہلے مجھے کسی ایسے عرب کی صحبت نصیب نہیں ہوئی تھی جو ان سے زیادہ کریم النفس اور شریف ہو ان کا حال یہ تھا جب وہ کسی منزل پر پہنچتے تو وہ اونٹ کو بٹھاتے اور خود مجھ سے پرے ہٹ جاتے۔ جب میں اونٹ سے نیچے اتر کر زمین پر ٹھیک سے کھڑی ہو جاتی تو وہ اونٹ کے پاس آتے، کجاوہ اُتار کر زمین پر رکھ دیتے اور اونٹ کو لے جا کر کسی دزخت سے باندھ دیتے۔ پھر مجھ سے دور کسی سائے میں لیٹ جاتے،

ع عثمان زمانہ جاہلیت میں خانہ کعبہ کے کلید بردار تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، فتح مکہ میں شریک ہوئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر بیت اللہ کی کنجی ان کے حوالے کی۔

جب روانگی کا وقت ہو جاتا تو وہ اٹھ کر اونٹ کے پاس آتے اس کو تیار کر کے میرے قریب لیتے اور مجھے اس پر سوار ہونے کی اجازت دیتے ہوتے دور ہٹ جاتے۔ جب میں سوار ہو کر اطمینان سے بیٹھ جاتی تو آتے اور اس کی نیل پکڑ کر آگے آگے چل پڑتے۔ مدینہ پہنچنے تک راستہ بھر میرے ساتھ ان کا یہی رویہ رہا۔ جب ان کی نظر بنی عوف بن عمرو کی بستی قبا پر پڑی تو بولے کہ ”تمہارے شوہر اسی بستی میں ہیں۔ خدا کا نام لے کر چلی جاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے وہ واپسی کے لیے مکہ کی طرف مڑ گئے۔ بچھڑے ہوئے ایک طویل عرصے کی جدائی کے بعد دوبارہ ہم ایک دوسرے سے ملے۔ حضرت ام سلمہؓ کی آنکھیں اپنے شوہر کے دیدار سے ٹھنڈی ہوئیں، اور حضرت ابو سلمہؓ کے دل کو اپنی بیوی اور بچے کو پا کر قرار و سکون نصیب ہوا۔ اس کے بعد واقعات اور حوادث تیزی سے گزرتے رہے، یہ غزوہ بدر ہے جس میں حضرت ابو سلمہؓ شریک ہوئے اور فتح یاب و ظفر مند ہو کر مسلمانوں کے ساتھ واپس لوٹے۔ اور یہ ہے معرکہ احد، جنگ بدر کے بعد حضرت ابو سلمہؓ اس غزوہ میں بھی ایک بہادر کی طرح شریک ہوئے اور اس میں اپنی جرأت و شجاعت کے انٹ نقوش چھوڑ آئے۔ جنگ سے واپس آئے تو ان کا جسم زخموں سے چور تھا۔ وہ برابر زخموں کا علاج کرتے رہے اور بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ زخم مندمل ہو چکے ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ وہ زخم بظاہر تو بھر گئے تھے مگر اندر ہی اندر خراب ہو گئے تھے۔ ایک دن اچانک پھٹ گئے اور حضرت ابو سلمہؓ بستر سے لگ گئے۔ اسی زمانے میں جب وہ اپنے زخموں کے ساتھ کشمکش میں مصروف تھے۔ ایک دن اپنی بیوی سے بولے کہ ام سلمہؓ! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔

لا يَصِيبُ أَحَدًا مُصِيبَةٌ فَيَسْتَرْجِعُ
عِنْدَ ذَاكَ يَقُولُ اللَّهُمَّ عِنْدَكَ
أَحْتَسِبُ مُصِيبَتِي هَذِهِ . اللَّهُمَّ
اخْلَفْنِي خَيْرًا مِنْهَا ، إِلَّا اعْطَاكَ
اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ“

” جو شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کے
وقت انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھے اور
دعا کرے کہ خدایا! میں تجھ سے ہی اس
مصیبت کا اجر چاہتا ہوں۔ الہی تو مجھے
اس کا بہترین نعم البدل عطا فرما۔ تو اللہ تعالیٰ

اس کے لیے تلافی مافات کی بہترین صورت پیدا فرما دیتا ہے۔“

حضرت ابو سلمہؓ کئی روز تک بستر علالت پر پڑے رہے۔ اسی دوران
ایک دن صبح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے
تشریف لائے۔ آپ دروازے میں داخل ہوئے اور ابھی اچھی طرح ان کو دیکھ
بھی نہیں سکے تھے کہ انہوں نے زندگی کو خیر باد کہہ دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم نے اپنے دست مبارک سے ان کی آنکھوں کو بند کیا اور آسمان کی طرف
نظریں اٹھاتے ہوئے ان کے لیے دعا کی۔

اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِأَبِي سَلَمَةَ وَارْفَعْ
دَرَجَتَهُ فِي الْمُقَرَّبِينَ وَاخْلَفْهُ فِي
عَقِبِهِ فِي الْعَابِرِينَ وَاغْفِرْ لَنَا وَلَهُ
يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ وَأَنْسِحْ لَهُ فِي
قَبْرِهِ وَنُورْ لَهُ فِيهِ .

اے اللہ! ابو سلمہ کی مغفرت فرما دے۔
مقربین میں ان کو بلند مرتبہ عطا کر اور
ان کے پس ماندگان میں ان کا قائم مقام
ہو جا۔ رب العالمین! ہماری اور ان کی
مغفرت فرما، ان کی قبر کو شادہ اور منور کر۔

ادھر جب حضرت ام سلمہؓ کو وہ دعایا یاد آئی۔ جو حضرت ابو سلمہؓ نے ان کو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بتائی تھی تو انہوں نے کہا۔

اللَّهُمَّ عِنْدَكَ أَحْتَسِبُ مُصِيبَتِي هَذِهِ لَيْكِنِ انْ كَادَ اللَّهُمَّ اخْلَفْنِي فِيهَا
خَيْرًا مِنْهَا كُنْتُ بِرَأْمَادِهِ نَهْرًا تَهْتَأُ . وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھیں کہ ابو سلمہ

سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو نعم البدل کے طور پر طلب کیا جائے۔۔۔۔۔ لیکن کچھ دیر بعد انہوں نے دعا مکمل کر دی۔

حضرت ام سلمہؓ کی اس مصیبت پر مسلمانوں نے غیر معمولی صدمہ و افسوس کا اظہار کیا، انہیں "ایم العرب" کے لقب سے نوازا۔ کیونکہ مدینہ میں ان کے ننھے ننھے بچوں کے سوا ان کے اہل قبیلہ و خاندان میں سے ان کا کوئی قریبی سرپرست اور ہمدرد نہ تھا۔

ہاجرین و انصار دونوں نے بیک وقت اپنے اوپر حضرت ام سلمہؓ کے حق کو محسوس کیا۔ اور ان کی عدت و فاقہ گزرتے ہی حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کو نکاح کا پیغام دیا۔ مگر انہوں نے ان کا پیغام منظور نہیں کیا۔ پھر حضرت عمر فاروقؓ نے ان کے ساتھ نکاح کی پیش کش کی مگر انہوں نے حضرت عمرؓ کے پیغام کو بھی اسی طرح رد کر دیا جس طرح وہ حضرت ابو بکرؓ کے پیغام کو نامنظور کر چکی تھیں۔ پھر جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے پیغام دیا تو حضرت ام سلمہؓ نے کہا کہ۔

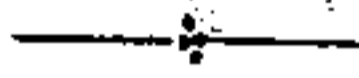
"اے اللہ کے رسول! میرے اندر تین ایسی خصلتیں ہیں جو شاید آپ کو پسند نہ آئیں پہلی بات یہ ہے کہ میں انتہائی غیرت مند اور خود دار عورت ہوں، مجھے اندیشہ ہے کہ میری کوئی بات آپ کی طبع مبارک کو ناگوار گزر جائے گی اور آپ مجھ سے ناراض ہو جائیں تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے سزا دے گا، دوسری بات یہ ہے کہ میں ایک سن رسیدہ عورت ہوں۔ اور تیسری یہ کہ میں بال بچوں والی عورت ہوں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ باتیں سن کر ارشاد فرمایا کہ۔
"یہ جو تم نے اپنی غیرت مندی اور خود دارگی کی بات کہی ہے تو میں

اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ تمہارے اندر سے اس کو دور کر دے اور جہاں تک سن رسیدگی کی بات ہے تو اس میں میری حالت تم سے مختلف نہیں ہے۔ اور یہ جو تم نے بال بچوں کا ذکر کیا ہے تو اس کے لیے کسی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے بچے میرے بچے ہیں۔“

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح کر لیا اور ان کی وہ دعا مجسم قبولیت بن کر سامنے آگئی جو انہوں نے اپنے شوہر کے انتقال کے وقت کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ابو سلمہؓ کا نعم البدل عطا فرما دیا۔ اور اس وقت سے ہند بنت ابی امیہ مخزومیہ صرف سلمہؓ کی ماں نہیں رہ گئیں بلکہ تمام مسلمانوں کی ماں ہو گئیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت ام سلمہؓ کے چہرے کو جنت میں تروتازہ اور بارونق رکھے، ان سے راضی رہے اور ان کو راضی رکھے۔ آمین



حضرت ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ ہجری میں دعوت اسلامی کے دائرے کو وسیع کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس کے لیے آپ نے عرب و عجم کے حکمرانوں کو آٹھ دعوتی خطوط لکھے۔ آپ نے جن حکمرانوں کے پاس یہ خطوط ارسال فرمائے تھے، ان میں سے ایک ثمامہ بن اثال حنفی بھی تھا۔ ثمامہ کو اہم حکمرانوں میں شامل کرنا اور اس کے یہاں دعوتی خط روانہ کرنا ہجرت انگریز اور قابل تعجب اس لیے نہیں تھا کہ وہ نہایت بااثر اور اہم شخصیت کا مالک تھا۔ وہ دور جاہلیت میں عرب کا ایک حکمران، بنو حنیفہ کا ایک سربراہ اور وہ رئیس اور علاقہ یمامہ کے ان بادشاہوں میں سے تھا جن کی کوئی بات ٹھکرانی نہیں جاتی۔

جب ثمامہ کے پاس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا تو اس نے اس کے ساتھ نہایت توہین آمیز اور غیر ذمہ دارانہ رویہ اپنایا۔ جھوٹے پندار اور جاہلانہ غور نے اس کو گناہ پر جمادیا اور اس نے دعوت حق سے اپنے کان بند کر لیے پھر شیطان اس پر سوار ہو گیا اور برابر اسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے ان کی دعوت کو نیست و نابود کر دینے پر انگیزہ کرتا رہا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بے خبری کی حالت میں اچانک حملہ کر کے آپ کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا اور اپنے اس ناپاک منصوبے کی تکمیل کے لیے وہ کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ اور اگر اس کے چچانے عین وقت پر اس کو اس منصوبے پر عمل کرنے سے روک نہ دیا ہوتا تو اس کا یہ گھناؤنا جرم پایہ تکمیل

کو پہنچ گیا ہوتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ شامہ اگرچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ قتل سے باز آ گیا۔ لیکن وہ آپ کے صحابہؓ کو قتل کرنے کے ارادے سے دست بردار نہیں ہوا۔ وہ برابر ان کی تاک میں لگا رہا۔ آخر کار وہ چند صحابہ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور ان کو نہایت دردناک طریقے سے قتل کر ڈالا جس وجہ سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں اس بات کا اعلان فرمادیا کہ وہ جہاں کہیں ملے، قتل کر دیا جائے صحابہؓ کے قتل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کے کچھ ہی دنوں بعد شامہ نے عمرہ ادا کرنے کا ارادہ کیا اور اس ارادے سے وہ اپنے علاقہ یمامہ سے مکہ کی سمت روانہ ہوا، وہاں پہنچ کر وہ کعبہ کا طواف اور اس میں رکھے ہوئے بتوں کے لیے قربانی کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اپنے اس سفر کے دوران وہ مدینہ کے قریب ایک راستے سے گزرتے ہوئے اچانک ایک ایسی آفت میں پھنس گیا جس کا اسے وہم و گمان تک نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے کچھ مسلمانوں پر مشتمل ایک فوجی دستے نے۔ جو اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں کوئی شر پسند رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر مدینہ کے باشندوں کو نقصان نہ پہنچادے۔ شامہ کو دیکھا اور اسے گرفتار کر لیا۔ دھالانکہ ان میں سے کوئی بھی اس کو پہچاننا نہ تھا، اور اس کو مدینہ لائے، اسے مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس اس قیدی کے حالات سے واقفیت حاصل کر کے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر فرمائیں گے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے مسجد کی طرف آئے اور اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو آپ کی نظر شامہ پر پڑی جو ستون سے بندھا ہوا تھا۔ آپ

نے صحابہ کرام سے دریافت فرمایا۔

”جانتے ہو تم لوگوں نے کس کو گرفتار کیا ہے؟“

”ہمیں اے اللہ کے رسول! ہم اس سے واقف نہیں ہیں،“ صحابہ نے عرض کیا۔

”یہ قبیلہ بنی حنیفہ کا سردار ثمامہ بن اثال ہے۔ اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، آپ نے قیدی کا تعارف کرتے ہوئے فرمایا۔ پھر آپ واپس گھر تشریف لے گئے اور گھر والوں سے کہا کہ ”تمہارے پاس جو بھی کھانا ہو، اسے جمع کر کے ثمامہ بن اثال کے پاس بھیج دو۔“ پھر آپ نے ہدایت فرمائی کہ ”میری اونٹنی کا دودھ صبح و شام دوہ کر اس کو پیش کیا جائے پھر آپ ثمامہ کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے خیال سے اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے پوچھا کہ

”ثمامہ! تمہارا کیا خیال ہے۔ تم ہماری طرف سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟“

”میں آپ کے متعلق اچھا لگان اور آپ سے اچھے برتاؤ کی امید رکھتا ہوں۔ لیکن اگر آپ میرے قتل کا فیصلہ کرتے ہیں تو ایک ایسے شخص کو قتل کرائیں گے جو قتل کا مجرم ہے۔ اور اگر احسان کر کے مجھے چھوڑ دیں تو ایک احسان شناس کو اپنا ممنون کرم پائیں گے۔ اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہے تو وہ بھی فرمائیے جتنا مال چاہیں گے، دیا جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔ اس گفتگو کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ کو اس کے حال پر چھوڑا اور دو روز تک اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس دوران اس کے پاس حسب معمول کھانے پینے کی چیزیں اور اونٹنی کا دودھ برابر پہنچتا رہا۔ دو دن بعد رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر اس کے پاس تشریف لائے اور وہی سوال کیا۔
 ”تمامہ! تمہارا کیا خیال ہے۔ تم ہم سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟“

اس نے جواب دیا۔

”میرے پاس کہنے کی وہی باتیں ہیں جو اس سے پہلے میں کہہ چکا ہوں۔
 اگر آپ میرے اوپر احسان کرتے ہیں تو ایک ایسے شخص پر احسان کریں گے جو
 اس کی قدر پہچانتا ہے اور اگر میرے قتل کا فیصلہ کرتے ہیں تو آپ کا یہ فیصلہ حق
 بہ جانب ہوگا کیونکہ میں آپ کے آدمیوں کو قتل کر کے اس کا مستحق قرار پا چکا
 ہوں اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہے تو بتائیے، جو چاہیں گے آپ کو پیش
 کیا جائے گا۔“

اس موقع پر بھی آپ نے اس سے مزید کچھ نہیں کہا بلکہ اس کو چھوڑ کر
 چلے گئے۔ البتہ اگلے روز آپ پھر اس کے پاس گئے اور پھر وہی سوال دہرایا۔
 ”تمامہ! تم کو ہماری طرف سے کس برتاؤ کی امید ہے؟“

اور اس نے بھی حسب سابق وہی جواب دیا۔

”اگر آپ میرے اوپر احسان کرتے ہیں تو ایک احسان شناس شخص پر
 احسان کریں گے اور اگر مجھے قتل کر دیتے ہیں تو میں اس کا مستحق ہوں اور
 اگر آپ کو مال کی ضرورت ہو تو فرمائیے، آپ کا مطلوبہ مال میں آپ کو
 پیش کر دوں گا۔“

اس سوال و جواب کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو مخاطب
 کرتے ہوئے فرمایا کہ ”تمامہ کو رہا کر دو۔“ اور حسب ارشاد اس کی زنجیریں
 کھول دی گئیں۔ رہائی پا کر تمامہ مسجد سے نکلا اور مدینہ کے باہر بقیع کے

قریب واقع کھجوروں کے ایک باغ میں گیا جس میں کنواں تھا۔ اپنی سواری کو اسی کنویں کے پاس بٹھا کر اس کے پانی سے خوب اچھی طرح غسل کیا اور پاک صاف ہو کر پھر اسی راستے سے چل کر مسجد میں واپس آ گیا۔ اس نے مسجد میں مسلمانوں کی ایک مجلس کے قریب پہنچ کر بہ آواز بلند کلمہ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”اے محمد! خدا کی قسم رُوئے زمین پر کوئی چہرہ میرے نزدیک آپ کے چہرے سے زیادہ مغفوض اور قابلِ نفرت نہ تھا۔ مگر اب یہ مجھے ہر چہرے سے زیادہ محبوب ہے۔ اور خدا کی قسم آپ کے دین سے زیادہ قابلِ نفرت میرے نزدیک کوئی دین نہ تھا۔ لیکن اب یہ مجھے تمام ادیان سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور خدا کی قسم آپ کے شہر سے زیادہ ناپسندیدہ میرے نزدیک کوئی دوسرا شہر نہیں تھا مگر اب آپ کا یہ شہر مجھے تمام شہروں سے زیادہ پسند ہے۔“

تھوڑی دیر تک کر پھر بولے۔

”میں نے آپ کے کچھ ساتھیوں کو قتل کیا ہے۔ اس کی تلافی کے لیے آپ میرے اوپر کیا عائد کرتے ہیں؟“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”شامہ! اس سلسلے میں تمہارے اوپر نہ قصاص ہے نہ دیت۔ کیونکہ اسلام نے تمہاری تمام سابقہ زیادتیوں اور غلط کاریوں کو حرفِ غلط کی طرح محو کر دیا ہے۔“

پھر آپ نے اسلام لانے کی وجہ سے جنت کی خوشخبری دی۔ ان کا چہرہ فرط مسرت سے چمک اٹھا۔ کہنے لگے کہ ”خدا کی قسم میں نے آپ کے جتنے صحابہ کو قتل کیا ہے اس سے کئی گنا تعداد میں مشرکین کو قتل کروں گا۔ اور اپنی ذات کو، اپنی تلوار کو اور ان لوگوں کو جو میرے ماتحت اور ہم نوا ہیں۔ آپ کی اور آپ کے دین کی نصرت و تائید کے لیے وقف کرتا ہوں۔ قدرے توقف کے بعد پھر کہا۔ ”اے اللہ کے رسول! آپ کے سواروں

نے مجھے اس وقت گرفتار کیا تھا جب میں عمرہ کی نیت سے نکلا تھا۔ تو آپ کے خیال میں اب مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”تم مکہ جا کر عمرہ ادا کر لو۔ مگر یہ عمرہ اب تم اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے مطابق ادا کرو گے۔“ پھر آپ نے مناسک حج اور افعال عمرہ کی تعلیم دی۔

حضرت شامہ ابن اثال عمرہ کی ادائیگی کے لیے روانہ ہوئے، جب بطن مکہ میں پہنچے تو وہیں کھڑے ہو کر بلند آواز سے تلبیہ پڑھنا شروع کر دیا۔

بِسْمِكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ - لَا شَرِيكَ لَكَ
لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ - لَا شَرِيكَ لَكَ
لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ - لَا شَرِيكَ لَكَ
لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ - لَا شَرِيكَ لَكَ

میں حاضر ہوں، خدا یا میں حاضر ہوں،
تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔
بیشک ساری تعریفیں اور تمام نعمتیں
تیرے لیے ہیں۔ اور اقدار تیرے ہی تیرے

کوئی شریک نہیں۔

وہ دنیا کے سب سے پہلے مسلمان تھے جو تلبیہ پڑھتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے تھے۔ قریش کے لوگ اس ناگہانی اور غیر متوقع آواز کو سن کر سہم گئے اور غضبناک ہو کر دوڑے۔ انھوں نے اپنی تلواریں بے نیام کر لیں اور آواز کی طرف لپکے تاکہ اس شخص پر ٹوٹ پڑیں جو ان کے کچھار میں گھس آیا تھا۔ وہ لوگ شامہ کی طرف بڑھے تو انہوں نے تلبیہ کی آواز اور تیز کر دی۔ وہ ان کی طرف نہایت لا پرواہی اور بے خوفی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ایک قریشی جو ان نے تیر چلا کر ان کو قتل کرنا چاہا۔ مگر دوسروں نے اس کو یہ کہتے ہوئے ایسا کرنے سے روک دیا کہ ”تیرا بڑا ہو۔ جانتا ہے یہ کون ہے؟ یہ پیامہ کا بادشاہ شامہ ابن اثال ہے۔ اگر تم نے اس کو کوئی نقصان پہنچایا تو اس

کے قبیلے والے ہمارے یہاں غلے کی برآمد روک کر ہم کو بھوکوں مار دیں گے۔“ پھر وہ لوگ اپنی تلواریں میان میں کر کے حضرت شامہؓ کے سامنے آئے اور ان سے بولے۔

”شامہ! یہ تم کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا تم بے دین ہو گئے ہو اور تم نے اپنا اور اپنے آباء و اجداد کا دین ترک کر دیا ہے؟“

”نہیں میں بے دین نہیں ہوا ہوں بلکہ میں نے سب سے لچھے دین، محمدؐ کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے۔“ حضرت شامہؓ نے جواب دیا اس کے بعد انھوں نے کہا کہ۔

”اس گھروالے کی قسم، میرے واپس جانے کے بعد یمامہ کے گھروں کا ایک دانہ اور وہاں کی پیداوار کا کوئی حصہ اس وقت تک تمہارے یہاں نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ تم سب کے نسب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہ اختیار کر لو۔“

حضرت شامہؓ نے قریش کی آنکھوں کے سامنے رسول اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمرہ کے ارکان ادا کیے۔ انہوں نے غیر اللہ اور بتوں کے لیے نہیں، ہدائے تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے قربانی کے جانور ذبح کیے اور واپس اپنے وطن لوٹ آئے۔ واپس آکر انہوں نے اپنے قبیلہ والوں کو قریش کے یہاں غلے کی سپلائی روک دینے کا حکم دیا۔ قبیلہ والوں نے ان کے اس حکم کی تعمیل کی اور اہل مکہ کے یہاں اپنی پیداوار کی سپلائی بند کر دی۔

اقتصادی پابندی جو شامہؓ ابن اٹال نے قریش کے حلات لگائی تھی، بتدریج سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئی۔ اس کے نتیجے میں غلے کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا، لوگوں میں فاقہ کشی عام ہو گئی اور ان کی تکلیف اور پریشانی زیادہ بڑھ

گئی۔ اور جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کو اپنے اور بال بچوں کے بھوکے سے مر جانے کا شدید خطرہ لاحق ہو گیا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا۔

”ہم آپ کے متعلق پہلے سے یہ بات جانتے ہیں کہ آپ صلہ رحمی کرتے اور دوسروں کو اس کی تاکید کرتے ہیں۔ مگر اس وقت ہم جس صورت حال کا سامنا کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ نے ہمارے ساتھ قطع رحمی کا طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ آپ نے باپوں کو تلوار سے قتل کیا اور بیٹوں کو بھوکوں ما رہے ہیں۔ شامہ ابن اثال نے غلے کی برآمد پر پابندی لگا کر ہمیں سخت تکلیف اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کو لکھ دیں کہ وہ غلے وغیرہ ہماری ضرورت کی چیزوں پر عائد کردہ پابندی ختم کر دیں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت شامہ کو لکھ دیا کہ وہ قریش کے خلاف پیداوار کی برآمد پر لگائی ہوئی بندش ختم کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے آپ کے حکم کے مطابق وہ پابندی اٹھائی۔ اور قریش کے یہاں غلے کی سپلائی جاری کر دی۔

حضرت شامہ ابن اثال رضی اللہ عنہ زندگی بھر اپنے دین کے وفادار اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوئے عہد کے پابند رہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور اہل عرب اجتماعی اور انفرادی طور پر اللہ کے دین سے نکلنے لگے اور مسیلمہ کذاب نے بنو حنیفہ میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے انہیں اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دینی شروع کی تو حضرت شامہ اس کے سامنے ڈٹ گئے۔ انہوں نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ ”بنو حنیفہ کے لوگو! خبردار اس گمراہ کن دعوت کو ہرگز قبول نہ کرنا جس میں

نور ہدایت کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ خدا کی قسم یہ شقاوت و بدبختی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ان لوگوں پر مسلط کیا ہے جو اسے اختیار کریں اور زبردست امتحان و آزمائش ہے ان لوگوں کے لیے جو اس سے اجتناب کریں۔“

انہوں نے مزید فرمایا۔

”بنو حنیفہ والوا ایک وقت میں دو نبی نہیں ہو سکتے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں، ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، نہ ان کی نبوت میں کسی کو شریک کیا گیا ہے۔“

ح. م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے، سب کچھ جاننے والا گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ سخت عذاب دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے۔

حَمْدٌ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ
الْحَكِيمِ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ
التَّوْبِ - شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي
الطُّوْلِ - لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ دَالِيهِ
الْمُصِیْرُ

کوئی معبود اس کے سوا نہیں۔ اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

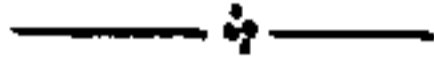
پھر فرمایا کہ کہاں اللہ کا یہ عظیم کلام اور کہاں سیکھ کذاب کا قول۔

”يَا ضَعْفَ نِقِي مَاتِنَقِينَ - لَا
الشَّرَابَ تَمْنَعِينَ وَلَا الْمَاءَ
تَكْدِرِينَ -“

پھر وہ اپنے قبیلے کے ان لوگوں کو لے کر الگ ہو گئے جو اسلام پر ثابت قدم رہ گئے تھے اور راہِ خدا میں جہاد اور اس کے دین کو زمین پر غالب کرنے کے لیے مرتدین کے ساتھ جنگ و قتال میں مشغول

ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ حضرت ثمامہ ابن اثال رضی اللہ عنہ کو اسلام اور مسلمانوں
کی طرف سے بہترین جزا دے اور اس جنت سے نوازے جس کا وعدہ
متقیوں سے کیا گیا ہے۔



حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ

اس جلیل القدر صحابی کا اسم گرامی خالد بن زید ابن کلیب تھا، ان کی کنیت ابویوب تھی اور ان کا تعلق انصار کے قبیلہ بنو نجار سے تھا۔ ہم مسلمانوں میں سے کون ہے جو حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ناواقف ہو! اللہ تعالیٰ نے سارے مسلمانوں کے مکانات کو چھوڑ کر ان کے مکان کو اس وقت اپنے رسولؐ کے قیام کے لیے منتخب فرما کر، جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لاتے، ان کے ذکر کو سارے عالم میں مشہور اور ان کے مقام کو ساری مخلوق میں بلند کر دیا اور تنہا یہی ایک بات ان کے فخر کے لیے کافی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابویوب رضی اللہ عنہ کے گھر میں نزول اجلاں فرمانے کی داستان بڑی دلکش اور شیریں داستان ہے جس کا ذکر کانوں کو ہر بار ایک نئی اور عجیب لذت سے آشنا کر جاتا ہے۔

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے تو اس کے باشندوں نے ادب و احترام اور عقیدت و محبت سے بھرے ہوئے دل و نگاہ کو فرشِ راہ کر دیا۔ انھوں نے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیے کہ آپ ان کی گہرائیوں میں اتر جائیں۔ انھوں نے اپنے گھروں کے پٹا کر دیے کہ آپ ان کے اندر پوری عزت و توقیر کے ساتھ جلوہ فرما ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز مدینہ کی مضافاتی بستی تبار میں گزارے اس دوران آپ نے وہاں ایک مسجد تعمیر کی۔ وہ پہلی مسجد تھی جس کی بنیاد تقوے پر رکھی گئی تھی۔ پھر

آپ وہاں سے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر نکلے اور یثرب کے تمام بڑے بڑے سردار اس کے رستے میں کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہ حسین آرزو کروٹیں لے رہی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں قیام کرنے پر آمادہ کرنے کا شرف حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ تمام سردارانِ یثرب باری باری اونٹنی کے آگے کھڑے ہو جاتے اور اس کا راستہ روک کر عرض کرتے:

”اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے یہاں قیام فرمائیں۔ ہم اپنی قوت، ساز و سامان اور کثیر افراد کے ذریعے آپ کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔“

لیکن آپ ہر ایک کو جواب دیتے کہ ”اے چھوڑ دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے۔“

اونٹنی اپنی متعین منزل کی طرف بڑھتی رہی اور پر شوق نگاہیں، آرزو مند قلوب کے جلو میں اس کا تعاقب کرتی رہی۔ جب وہ کسی مکان کے سامنے پہنچ کر اس سے لگے نکل جاتی تو اس کے مکیںوں پر حزن و ملال طاری ہو جاتا۔ ان کے اوپر مایوسی و ناامیدی مسلط ہو جاتی اور ان کے بعد والوں کے دلوں میں امید کی شمع جگمگا اٹھتی تھی۔ اونٹنی اسی طرح ایک ایک کر کے مختلف گھروں کے سامنے سے گزرتی رہی اور لوگ اپنی محرومی پر غم و اندوہ کی تصویر بنے اس خوش بخت کو جاننے کے شوق میں، جس کے حصے میں یہ نعمت سرمدی آنے والی تھی، اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ حتیٰ کہ اونٹنی حضرت ابویوب انصاریؓ کے مکان کے سامنے خالی پڑے ہوئے میدان میں پہنچ کر بیٹھ گئی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی پشت سے اتر کر نیچے تشریف نہیں لائے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی اور آگے چل پڑی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نکیل ڈھیلی چھوڑ دی۔ چند قدم چل کر اونٹنی مڑی اور واپس آکر دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں پہلی بار بیٹھی

تھی۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا دل فرحت و انبساط سے لبریز ہو گیا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ لپکے۔ انھوں نے آپ کا سامان اٹھا لیا اور اسے خوشی خوشی اپنے گھر میں اس طرح لائے جیسے دنیا کا سارا خزانہ ان کے ہاتھ آ گیا ہو۔

حضرت ابو ایوبؓ کا مکان دو منزلہ تھا۔ انھوں نے بالائی منزل کو اہل خانہ کے ساز و سامان سے خالی کر دیا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں قیام فرمائیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختی منزل کو بالائی منزل پر ترجیح دی اور اسے اپنے قیام کے لیے پسند فرمایا۔ حضرت ابو ایوبؓ نے آپ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور آپ کو اسی جگہ ٹھہرایا جسے آپ نے پسند فرمایا تھا۔

جب عات ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرمانے کے لیے اپنی خواب گاہ میں تشریف لے جا چکے تو حضرت ابو ایوبؓ اور ان کی اہلیہ بالائی منزل میں چلے گئے لیکن جیسے ہی انھوں نے دروازہ بند کیا معاً ان کے دل میں خیال آیا اور اپنی اہلیہ سے مخاطب ہوئے۔

”تمہارا بھلا ہو، یہ ہم نے کیا کیا؟ کیا یہ بات مناسب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اور ہم ان سے اوپر رہیں؟ کیا یہ بات ہم کو زیب دیتی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر چلیں؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وحی الہی کے درمیان حائل ہونا ہمارے لیے زیبا ہے؟ آہ! اس صورت میں تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔“

اس وقت دونوں میاں بیوی سخت حیرانی و پشیمانی سے دوچار تھے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ وہ دونوں رات بھر بے چین رہے۔ آخر کار ان کو اس وقت تھوڑا سا سکون میسر آیا جب وہ بالا خانے کے اس

گوشے میں سمٹ گئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر واقع نہیں تھا، وہ دونوں وہیں گوشہ گیر ہو گئے۔ اگر چلتے تو بیچ میں چلنے کے بجائے کنارے کنارے چلتے تھے۔ صبح کو حضرت ابو ایوبؓ نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ ”آج رات میں نے اور ام ایوب نے آنکھوں میں کائی ہے“ آپ نے وجہ پوچھی تو عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول! رات بھر ہم کو یہ احساس بے چین کیے رہا کہ ہم جس مکان کی بالائی منزل میں ہیں، آپ اس کے نیچے تشریف فرما ہیں اور جب ہم چلتے اور حرکت کرتے ہیں تو دھول اور گرد و غبار آپ کے اوپر گر کر آپ کے لیے اذیت کا سبب بنتی ہے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ ہم آپ کے اور وحی الہی کے درمیان حائل ہو رہے ہیں۔“

”ابو ایوب! اس کی فکر اور پرواہ مت کرو۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ”چونکہ بکثرت لوگ میرے پاس ملنے کے لیے آتے رہتے ہیں اس لیے مجھے ہی رہنا میرے لیے زیادہ مناسب اور آرام دہ ہے۔“ حضرت ابو ایوبؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر تسلیم خم کر دیا اور بالائی منزل میں قیام پذیر رہا۔ یہاں تک کہ ایک سرد رات کو ہمارا پانی کا گھڑا ٹوٹ گیا اور اس کا پانی اوپری منزل کے فرش پر پھیل گیا۔ ہم دونوں میاں بیوی اس کے پھیلے ہوئے پانی کو جذب کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اس وقت ہمارے پاس صرف ایک ہی کبیل تھا جس کو ہم لحاف کے طور پر استعمال کرتے تھے، اس خوف سے کہ کہیں یہ پانی نیچے ٹپک کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث پریشانی نہ بن جائے، ہم نے اسی کبیل میں پانی کو جذب کر لیا۔ پھر صبح کے وقت میں نے بارگاہ رسالت میں

حاضر ہو کر عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ سے اوپر رہوں اور آپ مجھ سے نیچے رہیں۔ پھر میں نے رات کو پیش آنے والا گھڑے کا واقعہ آپ کے گوش گزار کر دیا اور آپ سے بالائی منزل میں منتقل ہو جانے کی درخواست کی۔ آپ نے میری یہ درخواست منظور فرمائی اور اوپر کی منزل میں منتقل ہو گئے اور میں ام ایوب کے ساتھ نیچے آ گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوبؓ کے مکان میں تقریباً سات مہینے تک قیام پذیر رہے۔ یہاں تک کہ جب اس زمین میں مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی جس میں اونٹنی بیٹھی تھی تو آپ ان ٹھروں میں منتقل ہو گئے جو مسجد کے ارد گرد آپ کے اور آپ کی ازواج مطہرات کے لیے بنائے گئے تھے اور آپ حضرت ابو ایوبؓ کے پڑوس میں رہنے لگے۔ کتنے اچھے اور شریف پڑوسی تھے جو ان دونوں کو میسر آئے تھے۔

حضرت ابو ایوبؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے ایسی محبت تھی جس نے باہمی تکلفات کے سارے پردے درمیان سے اٹھا دیے تھے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت ابو بکرؓ گرمی کی ایک سخت دوپہر میں گھر سے نکل کر مسجد کی طرف آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھ کر پوچھا کہ ”ابو بکر! آپ اس وقت گھر سے کیوں نکلے ہیں؟“

”بھوک کی شدت اور بے چینی کی وجہ سے“ حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا۔
”خدا کی قسم میرے گھر سے نکلنے کا سبب بھی یہی ہے“ حضرت عمرؓ نے کہا۔

راتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے حجرے سے تشریف لائے اور ان دونوں حضرات سے دریافت کیا۔ ”آپ دونوں اس وقت کس غرض سے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکلے ہیں؟“

”واللہ ہم سب اس بھوک سے بے چین ہو کر نکلے ہیں جس کو ہم اپنے اندر شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔“ دونوں نے جواباً عرض کیا۔

”اس ہستی کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں نے بھی اسی سے پریشان ہو کر گھر سے قدم نکالا ہے۔“ آپ نے فرمایا ”اٹھیے! میرے ساتھ چلیے۔“ اور تینوں حضرات حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے حضرت ابو ایوب کا معمول تھا کہ وہ روزانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز بچا کر رکھتے تھے اور جب آپ کسی وجہ سے تاخیر کرتے اور وقت مقررہ پر تشریف نہ لاتے تو وہ کھانا گھر والوں کو کھلا دیتے۔ جب یہ لوگ دروازے پر پہنچے تو حضرت ام ایوب رضی اللہ عنہا سے منکل کر ان کے پاس پہنچیں اور بولیں۔ ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی تشریف آوری ہماری عزت افزائی کا باعث ہے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ ”ابو ایوب کہاں ہیں؟“

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سن لی۔ وہ قریب ہی اپنے کھجوروں کے باغ میں کام کر رہے تھے۔ وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے لپکے۔ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کا آنا ہمارے لیے باعث افتخار ہے۔“ پھر انھوں نے کہا ”اے اللہ کے رسول! یہ آپ کی تشریف آوری بے وقت کیسے ہوئی؟ آپ تو اس وقت کبھی تشریف نہیں لاتے تھے۔“ حضور نے فرمایا ”ابو ایوب تم ٹھیک کہتے ہو۔“

پھر حضرت ابو ایوبؓ باغ میں گئے اور اس میں سے کھجوروں کا ایک گچھا کاٹ لائے جس میں تمر، رطب، اور بسر ہر قسم کی کھجوریں لگی ہوئی تھیں۔ پیار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھ کر فرمایا۔

”اسے کاٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیوں نہیں تم نے اس میں سے صرف پکی ہوئی کھجوریں ہی توڑ لیں؟“

انہوں نے کہا کہ ”میں نے مناسب سمجھا کہ آپ اس میں سے تمر، رطب، اور بسر ہر قسم کی کھجور اپنی پسند کے مطابق تناول فرمائیں۔ اس کے علاوہ میں آپ کے لیے ایک بکری بھی ذبح کروں گا۔“ تو آپ نے فرمایا کہ ”اگر ذبح کرنا تو دودھاری بکری مت ذبح کرنا۔“

پھر حضرت ابو ایوبؓ نے بکری کا ایک سالہ بچہ لیا اور اسے ذبح کر دیا پھر انہوں نے اپنی اہلیہ سے کہا: ”ایوب کی ماں! آٹا گوندھ کر ہارے لیے روٹیاں پکالو۔ تم بہت عمدہ روٹیاں پکانا جانتی ہو۔“

اس کے بعد انہوں نے آدھا گوشت پکایا اور آدھے کو بھون لیا۔ جب کھانا پک کر تیار ہو گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں ساتھیوں کے سامنے رکھ دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت میں سے ایک ٹکڑا لیا اور اس کو روٹی میں رکھ کر فرمایا ”ابو ایوب! یہ ٹکڑا جلدی سے فاطمہ کو دے آؤ۔ اس کو کئی دنوں سے ایسا کھانا نہیں ملا ہے۔“

پھر جب سب لوگ کھا کر آسودہ ہو گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”روٹی، گوشت، تمر، رطب اور بسر۔“ یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ پھر ارشاد فرمایا۔

”قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہی وہ نعمت ہے

جس کے متعلق قیامت کے روز تم سے سوال کیا جائے گا۔ تو جب تم کو اس قسم کی نعمت ملے اور تم اسے کھانے کے لیے اپنے ہاتھ میں لو تو کہو بسم اللہ اور جب آسودہ ہو جاؤ تو کہو۔

اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو آسودگی
عَلَيْنَا فَأَنْصَلِ
بخشی ہم کو انعام سے نوازا اور ہمارے
اوپر مہربانی کی۔

پھر آپ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور چلتے چلتے حضرت ابو ایوب رضی سے فرمایا۔ ”کل ہمارے پاس آنا۔“ آپ کا معمول تھا کہ جب کوئی شخص آپ کے ساتھ احسان کرتا تو آپ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ اس کے احسان کا بدلہ چکا دیں، حضرت ابو ایوب رضی حضور کی یہ بات نہیں سن سکے تو حضرت عمر رضی نے ان سے کہا کہ:

”ابو ایوب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ کل تم میرے پاس آنا۔ حضرت ابو ایوب نے کہا کہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم میرے سر اور آنکھوں پر۔“

جب دوسرے دن حضرت ابو ایوب رضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو ایک لونڈی (جو آپ کی خدمت کیا کرتی تھی) سے کہتے ہوئے عنایت فرمائی ”ابو ایوب! اس کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا۔ یہ جب تک ہمارے یہاں رہی ہے ہم نے اس میں سوائے خیر کے کچھ نہیں دیکھا۔“

وہ لونڈی کو لیے ہوئے گھر لوٹے۔ جب ام ایوب نے دیکھا تو بولیں:

”ابو ایوب! یہ لونڈی کس کی ہے؟“

”ہماری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عنایت فرمائی ہے۔“
انہوں نے جواب دیا۔

یہ سن کر اُمّ ایوبؓ نے کہا ”کتنا عظیم ہے عطا کرنے والا اور کتنا عمدہ ہے
یہ عطیہ۔“

”اور آپ نے ہم کو اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی ہے۔“ حضرت
ابو ایوبؓ نے دوبارہ کہا۔

”ہم اس کے ساتھ کون سا رویہ اختیار کریں کہ آپ کی ہدایت پر پورا پورا
عمل کر سکیں؟“ انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”خدا کی قسم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کرنے کی اس
سے بہتر دوسری کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ اس کو آزاد کر دیں۔“ انہوں نے
حل پیش کر دیا۔

”آپ کو صحیح راہ سوجھی۔ آپ کو درست بات کی توفیق ملی۔“ حضرت
اُمّ ایوبؓ نے ان کی تائید کی۔ اور حضرت ابو ایوبؓ نے لونڈی کو آزاد کر دیا۔
یہ حضرت ابو ایوبؓ کی عام اور روزمرہ کی زندگی کی چند جھلکیاں تھیں۔
اگر آپ کو ان کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ زندگی کی کچھ جھلکیاں دیکھنے کا موقع ملے
تو یقیناً آپ حیرت و استعجاب سے دوچار ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے
اپنی پوری زندگی ایک غازی اور مجاہد کی طرح گزاری۔ کہا جاتا ہے کہ وہ عہد نبوی
سے لے کر دور معاویہؓ تک کسی غزوے سے پیچھے نہیں رہے جو مسلمانوں کو پیش
آیا، سوائے اس کے کہ وہ کسی دوسرے محاذ پر برسرِ پیکار ہوں۔

وہ غزوہ حضرت ابو ایوبؓ کا آخری غزوہ تھا۔ جب حضرت معاویہ ابن
ابی سفیانؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنے بیٹے یزید کی قیادت میں قسطنطنیہ

کی فتح کے لیے فوج بھیجی تھی۔ حضرت ابوایوبؓ اس وقت کافی عمر رسیدہ تھے۔ اس وقت ان کی عمر اسی سال کے قریب تھی لیکن یہ کبرسنی ان کو یزید کی فوج میں شامل ہونے اور معرکہ کارزار میں ایک مجاہد کی حیثیت میں داخل ہونے سے نہ روک سکی۔ وہ فوج میں ایک عام سپاہی کی طرح شریک ہوتے لیکن دشمن کے ساتھ جنگ چھڑے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان کے اوپر بیماری کا ایسا شدید حملہ ہوا جس نے ان کو شرکت جنگ سے معذور کر دیا۔ ان کی شدید علالت کی خبر پا کر قائد سپاہ اسلامی یزید بن معاویہؓ ان کی عیادت کے لیے آیا اور ان سے دریافت کیا۔

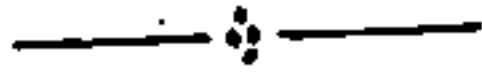
”ابوایوبؓ! آپ کی کوئی خواہش ہے؟“

”غازیانِ اسلام کو میرا سلام کہنا“ حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا۔ اور ان سے کہنا کہ ابوایوبؓ کی وصیت ہے کہ دشمن کی سرحد میں اندر تک گھس جاؤ اور مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤ اور میری لاش کو قسطنطنیہ کی فصیلوں کے نیچے دفن کر دو۔“ یہ کہتے کہتے میزبانِ رسولؐ نے آخری ہچکی لی اور طائرِ روحِ قفسِ عنصری سے آزاد ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مجاہدین نے صحابی رسولؐ کی آخری خواہش اور وصیت کا پورا پورا احترام کیا۔ انہوں نے دشمن پر پے درپے اور شدید حملے کیے اور اسے دھکیلتے ہوئے فصیل شہر تک پہنچ گئے۔ وہ حضرت ابوایوبؓ کی لاش مبارک کو ساتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ وہاں ان کی وصیت کے مطابق قبرتیار کی گئی اور اس میں ان کو دفن کیا گیا۔

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

انہوں نے اس کے سوا اور کسی صورت کو پسند نہیں کیا کہ اللہ کی
 راہ میں جہاد کرتے ہوئے میدان جنگ میں گھوڑے کی پیٹھ پر ان کو
 موت آئے۔ حالانکہ ان کی عمر اس وقت اسی سال کے قریب تھی۔
 اللہ تعالیٰ حضرت ابویوبؓ پر رحم فرمائے اور ان سے راضی ہو۔ آمین۔



حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ

عمرو بن جموح کا شمار دور جاہلیت میں یشرب کے زعماء میں ہوتا تھا۔ وہ قبیلہ بنو سلمہ کے ہردل عزیز سردار، مدینے کے مشہور صاحبِ خود ساختہ اور ارباب ثروت میں سے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں اشرف کی یہ امتیازی شان سمجھی جاتی تھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنے لیے خاص طور سے الگ الگ بت اپنے گھر میں رکھتا تھا تاکہ ہر صبح و شام اس سے برکت حاصل کرے۔ موسم حج میں اس کی خوشنودی حاصل کرے اور اظہار عقیدت کے طور پر اس کے لیے جانور ذبح کرے اور مصیبت اور پریشانی کی کٹھن گھڑیوں میں اس سے امان و پناہ کی درخواست کرے۔ اس وقت کے رواج کے مطابق عمرو بن جموح کے پاس بھی ایک بت تھا جس کا نام ”مناة“ تھا۔ اس کو آنکھوں نے بہت قیمتی اور نفیس لکڑی سے بنایا تھا۔ عمرو بن جموح اس سے غیر معمولی عقیدت رکھتے، اس کے رکھ رکھاؤ کا بڑا اہتمام کرتے، اس کی دیکھ دیکھ کے لیے برابر فکر مند رہتے اور ہمیشہ اس کو نفیس ترین خوشبو سے معطر کیے رہتے تھے۔

آفتاب اسلام کی شعائیں جس وقت مبشر اول حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ذریعہ یشرب کے ایک ایک گھر پر ضو فگن ہو رہی تھیں، عمرو بن جموح کی عمر ساٹھ سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اور اس وقت ان کے تینوں بیٹے معاذ، معوذ، خلاد اور ان کے ایک ہم جولی معاذ بن جبل ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام

ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان تینوں بیٹوں کے ساتھ ان کی ماں ہند بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں لیکن عمرو بن جموح اس سے بالکل بے خبر تھے۔

عمرو بن جموح کی بیوی نے دیکھا کہ اہل یثرب کی بڑی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا ہے اور ان کے شوہر اور معدودے چند لوگوں کے سوا قبائل کے سربراہ اور سرداروں میں سے کوئی بھی اب شرک پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ہند اپنے شوہر سے بہت زیادہ محبت کرتی اور ان کا غیر معمولی احترام کرتی تھیں اور ان کے متعلق اس بات سے ڈرتی تھیں کہ اگر انہوں نے کفر کو نہیں چھوڑا اور اسی حال میں ان کو موت آگئی تو وہ جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔ ادھر عمرو بن جموح اپنے لڑکوں کے متعلق یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں یہ لوگ آباء و اجداد کے دین کو چھوڑ کر اس داعی اسلام مصعب بن عمر کی پیروی نہ اختیار کر لیں، جس نے قبیل مدت میں بہت سے لوگوں کو ان کے دین سے پھیر کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل کر لیا ہے۔ اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”ہند! دیکھو اس بات کا خیال رکھنا کہ جب تک ہم کسی فیصلے پر نہ پہنچ جائیں۔ تمہارے لڑکے اس شخص سے ملنے نہ پائیں“

”میں اس کا خیال رکھوں گی“ ہند نے کہا۔ ”لیکن کیا آپ پسند کریں گے کہ اپنے بیٹے معاذ سے وہ باتیں سن لیں جو اس شخص سے سن کر بیان کر رہا ہے“

”تمہارا بھلا ہو، کیا وہ میری لائے علمی میں اپنے دین سے پھر گیا ہے؟“ عمرو بن جموح نے پوچھا۔ نیک بیوی کو ان کے اوپر ترس آیا اور انہوں نے جواب دیا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس داعی کی مجلس میں شامل ہوا تھا اور

وہاں اُس نے اس کی کچھ باتیں سن لی ہیں“

عمر نے کہا۔ ”اس کو میرے پاس بلاؤ۔“

اور جب معاذ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا کہ ”یہ شخص جو کچھ کہتا ہے اس میں سے کچھ باتیں مجھے سناؤ۔“ یہ سن کر بیٹے نے باپ کو کلام الہی کے یہ دل نشیں بول پڑھ کر سنائے۔

بسم الله الرحمن الرحيم -
الحمد لله رب العالمين - الرحمن
الرحيم - مالك يوم الدين -
اياك نعبد و اياك نستعين -
اهدنا الصراط المستقيم صراط
الذين انعمت عليهم غير
المغضوب عليهم ولا الضالين -

شروع کرتا ہوں اس خدا کے نام سے
جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔
ساری تعریفیں خدا کے لیے ہیں جو تمام
عالم کا رب ہے جو رحمان و رحیم اور روز
جزا کا مالک ہے۔ خدایا! یہ تم میری
ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تجھی سے
مدد مانگتے ہیں۔ خدایا! صراطِ مستقیم
کی طرف ہماری رہ نمائی فرما۔ ان لوگوں

کے راستے کی طرف جن پر تو نے انعام فرمایا جو نہ تیرے غضب کے مستحق ہیں نہ گم کردہ راہ۔
عمر بڑے غور و اہتمام کے ساتھ اپنے بیٹے کی زبان سے ادا ہونے والے
ان دل نشیں بولوں کو سننے رہے پھر انہوں نے سر اٹھایا اور بیٹے سے مخاطب
ہوئے۔ ”کتنا خوب صورت اور حسین ہے یہ کلام کیا اس کا سارا کلام ایسا
ہی ہے؟“

”اس کا کلام اس سے بھی خوب صورت ہے“ معاذ نے کہا۔ ”ابا جان
کیا آپ اس کی بیعت کرنا پسند کریں گے؟ آپ کا پورا قبیلہ اس کی بیعت کر چکا ہے“
یہ سن کر بڑے میاں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر بولے۔

”مناة“ سے مشورہ کیے بغیر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ دیکھتا ہوں وہ مجھے کیا

راتے دیتا ہے۔“

”ابا جان! مناة اس سلسلے میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہے۔ وہ تو لکڑی

کا ایک بے جان ٹکڑا ہے۔ سننے، سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت سے محروم، نوجوان
معاذ نے حقیقت کی نشاندہی کی۔

”میں کہہ چکا ہوں کہ اس سے راتے لیے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

بڑے میاں نے غصے سے تیز ہوتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد عمرو بن جموح وہاں سے اٹھ کر مناة کے پاس پہنچے۔ دہل جاہلیت

کا معمول تھا کہ جب وہ کسی بت سے بات کرنا چاہتے تھے تو اس کے پیچھے

کسی بوڑھی عورت کو کھڑا کر دیتے اور وہ ان کے زعم باطل کے مطابق جو بات

اس بڑھیلی کے دل میں ڈالتا وہی کہتی تھی، اور اس کے سانس اپنے سیدھے اور

تندرست پاؤں کے بل کھڑے ہو گئے۔ ان کا ایک پاؤں لنگڑا تھا۔ پہلے تو

انہوں نے بت کی بہترین حمد و ثناء کی۔ پھر بولے۔

”مناة! تجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ داعی جو مکے سے ہمارے

یہاں پہنچا ہے، وہ تیرے علاوہ کسی اور کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ وہ

صرف اس لیے یہاں آیا ہے کہ ہم کو تیری عبادت سے روک دے۔ اور میں

اس کی اچھی باتیں سن چکنے کے باوجود ان کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں،

جب تک تم سے مشورہ نہ کر لوں تو تم مجھے اس سلسلے میں مناسب مشورہ دو۔“

لیکن جب مناة نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو عمرو نے کہا

کہ ”شاید تم ناراض ہو گئے ہو اور میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا۔ جو تمہارے

لیے باعثِ اذیت ہو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں تم کو چند روز کی جہلت دیتا

ہوں تاکہ تمہارا غصہ فرو ہو جائے۔“

عمر بن جموح کے لڑکے مناتہ کے ساتھ اپنے باپ کے غیر معمولی تعلق خاطر کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کو یہ بات بھی خوب معلوم تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان کے لیے ایک جزو لازم بن چکا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ ان کے دل میں اس کی عقیدت و نیاز مندی کی بنیاد متزلزل ہو رہی ہے۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ اس کی عقیدت کو ان کے دل سے پورے طور پر نکال دیں۔ ان کو ایمان کی طرف لانے کی یہی ایک شکل تھی۔

عمر بن جموح کے لڑکے رات کی تاریکی میں اپنے دوست معاذ بن جبل کے ساتھ مناتہ کے پاس پہنچے اور اس کو اس کی جگہ سے اٹھا کر بنو سلمہ کے اس گڑھے پر لے گئے جس میں وہ کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالتے تھے۔ لڑکے اس کو گڑھے میں پھینک کر گھر لوٹ آئے۔ اور اس کا روانی کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ صبح کو جب عمر و اپنے بٹے کے پاس اظہار عقیدت کے لیے پہنچے تو اسے اپنی جگہ سے غائب پایا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے گھر والوں سے کہا کہ —

”تم لوگوں کا بڑا ہو۔ آج رات میرے معبود کے ساتھ کس نے زیادتی کی ہے؟“

لیکن کسی نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گھر کے اندر اور باہر اس کو تلاش کرتے پھرے۔ وہ شدت غضب میں چیخ چیخ کر گھر والوں کو دھمکی دیتے رہے۔ اور آخر کافی تلاش کرنے کے بعد وہ ان کو گڑھے میں منہ کے بل اوندھا پڑا ہوا مل گیا۔ انھوں نے اسے وہاں سے نکالا، اسے دھو کر صاف کیا اور خوشبو لگا کر دوبارہ اس کی جگہ پر رکھتے ہوئے بولے۔

”خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ تمہارے ساتھ کس نے یہ حرکت

کی ہے تو میں اسے سخت سزا دوں گا۔“

دوسری رات بھی لڑکوں نے مناء کے ساتھ وہی حرکت کی جو پہلی رات کر چکے تھے۔ صبح کو جب بڑے میاں نے اسے تلاش کیا تو اسی گڑھے میں گندگی میں ملوث پایا۔ آج بھی انھوں نے اس کو وہاں سے باہر نکال کر دھویا اور خوشبو لگا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

لڑکے ہر رات اس کے ساتھ یہی سلوک کرتے رہے یہاں تک کہ جب عمرو بن جموح ان کی اس حرکت سے بالکل تنگ آگئے تو رات سونے سے پہلے اس کے پاس گئے، اور اپنی تلوار اس کی گردن میں لٹکاتے ہوئے بولے۔

”اے مناء! خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ تیرے ساتھ یہ حرکت کون کرتا ہے، اگر تیرے اندر ذرا بھی خیر ہو تو تو اپنا دفاع کر۔ یہ تلوار تیرے پاس ہے“ یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ اور جب لڑکوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ بڑے میاں گہری نیند میں پہنچ کر گرد و پیش سے بے خبر ہو چکے ہیں تو وہ جھٹ پٹ بت کے پاس پہنچے، انھوں نے اس کی گردن میں پڑی ہوئی تلوار نکال لی اور اس کو گھر کے باہر لے گئے۔ اب کی بار انہوں نے ایک مردہ کتے کو اس کے ساتھ باندھ دیا اور دونوں کو بنو سلمہ کے اسی گڑھے میں پھینک دیا جس میں گندگی اور غلاطت بھری ہوئی تھی۔ صبح کو جب بڑے میاں سو کر اٹھے اور بت کو اپنی جگہ موجود نہیں پایا تو اس کی تلاش میں نکلے اور حسب معمول اس کو اسی گڑھے میں اس حال میں منہ کے بل پڑا ہوا پایا کہ اس کے ساتھ ایک مردہ کتا بندھا ہوا تھا اور تلوار اس سے چھین لی گئی تھی۔ اب کی بار انھوں نے اس کو گڑھے سے نہیں نکالا بلکہ جہاں لڑکوں نے اسے پھینکا تھا، وہیں چھوڑ دیا اور بولے۔

واللہ لوکنت الہالم تکن ”خدا کی قسم اگر تو واقعی معبود ہوتا تو

انت وکلب وسط بلذ فی قرن .
تو کتے کے ساتھ بندھا ہوا گرٹھے میں
نہ پڑا ہوتا۔“

پھر اس کے بعد انھیں خدا کے دین میں داخل ہوتے دیر نہ لگی۔
جب حضرت عمرو بن جموح نے حلاوت ایمان کا مزہ چکھ لیا تو اپنی عمر
کے اس ایک ایک لمحے پریشانی اور ندامت کا اظہار کرنے لگے جو شرک کی
حالت میں گزرا تھا، ایمان لانے کے بعد وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ
نئے دین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور اپنے نفس، اپنے مال اور اپنی اولاد کو خدا
اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے وقف کر دیا۔

حضرت عمرو بن جموح کے مشرف بہ اسلام ہونے کے کچھ عرصے کے بعد
اُحد کا معرکہ پیش آیا۔ انھوں نے اپنے تینوں بیٹوں کو دشمنانِ خدا سے مقابلہ
کی تیاریاں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ انھیں صبح دشام پھرے ہوئے شیروں کی طرح
آتے جاتے دیکھتے۔ ان کے چہرے دولت شہادت اور رضا، الہی کے حصول کے
شوق میں جگمگا رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے ان کے اندر بھی جوش و حمیت کو
برانگیختہ کر دیا اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت اپنے
بیٹوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کا ہنسیہ کر لیا۔ لیکن ان کے لڑنے کے ان کو
اس ارادے سے باز رکھنے پر متفق الرائے ہو گئے۔ کیونکہ وہ ایک سن رسیدہ
بوڑھے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاؤں میں شدید لنگ تھا اور ایسی حالت
میں اللہ تعالیٰ نے انہیں شرکت جہاد سے معذور قرار دیا تھا۔ ان کے بیٹوں
نے ان سے کہا کہ ”ابا جان! اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور قرار دیا ہے۔“ آپ خود
کو ایسی بات کا مکلف کیوں قرار دے رہے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو
معاف کر دیا ہے۔“ حضرت عمروؓ ان کی اس بات سے سخت ناراض ہوئے

اور ان کی شکایت کرنے کے لیے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوتے اور آپ سے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول! میرے یہ بیٹے مجھے اس خیر سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ میں لنگڑا ہوں اور معذور ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک ہونا میرے لیے ضروری نہیں ہے۔ خدا کی قسم مجھے اُمید ہے کہ میں اپنی اس ٹانگ سے جنت میں داخل ہوں گا۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ ذوق و شوق دیکھا تو ان کے لڑکوں سے فرمایا کہ ”ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان کو شہادت عطا فرمائے۔“ چنانچہ لڑکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق خاموش ہو گئے۔

جب مجاہدین کی روانگی کا وقت آیا تو حضرت عمرو بن جحوح اپنی اہلیہ سے ملے اور ان سے اس طرح رخصت ہوئے، جیسے انہیں لوٹ کر واپس نہیں آنا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے قبیلہ روہو کر اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے اور دعا کی۔

”خدا یا! مجھے شہادت کی دولت نصیب فرما۔ خدا یا! مجھے ناکام اور نامراد اور شہادت سے محروم کر کے واپس نہ لوٹا۔“

”اللہمَّ اِزْقِنِي الشَّهَادَةَ
وَلَا تَرُدَّنِي اِلَى اَهْلِي خَائِبًا.“

پھر وہ اس شان سے میدان جہاد کی طرف روانہ ہوئے کہ ان کے تینوں لڑکے اور ان کے قبیلہ بنو سلمہ کی ایک کثیر تعداد نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اور جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے تو یہ عجیب منظر دیکھنے میں آیا کہ حضرت عمرو بن جحوح

اپنی تندرست ٹانگ سے کودتے ہوئے مسلمانوں کی اس اگلی جماعت میں شامل ہو گئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے آگے بڑھی تھی۔ اور اس وقت تمنائے شہادت لفظوں کی شکل میں ان کے لبوں پر چل رہی تھی۔

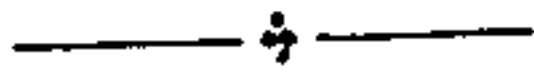
”انی لمشتاق الی الجنة۔ انی لمشتاق الی الجنة“ ”میں جنت کا

مشتاق ہوں۔ میں جنت کا مشتاق ہوں“

اس وقت ان کے ایک صاحب زادے حضرت خلد رضی اللہ عنہ عقب سے ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ وہ دونوں باپ بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے مشرکین سے برابر لڑتے رہے، یہاں تک کہ دونوں میدان جنگ میں شہید ہو کر گر پڑے۔ اور دونوں کی شہادت کے درمیان چند لمحات سے زیادہ کا وقفہ حائل نہ تھا۔

جب جنگ ختم ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہداء اُحد کی تجہیز و تکفین کے لیے کھڑے ہوئے اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ ”انھیں ان کے خون اور زخموں سمیت ہی دفن کر دو، میں ان کا گواہ ہوں“ پھر آپ نے فرمایا کہ ”جو مسلمان راہ خدا میں زخمی ہوگا، وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ زخموں سے اس کا خون جاری ہوگا، اس خون کا رنگ زعفرانی اور اس کی خوشبو مشک کی خوشبو کی طرح ہوگی“ پھر فرمایا۔ ”عمرو بن جموح کو عبداللہ بن عمرو کے ساتھ دفن کرنا۔ یہ دونوں اس دنیا میں ایک دوسرے کے نہایت گہرے اور مخلص دوست تھے۔

اللہ تعالیٰ حضرت عمرو بن جموح اور ان کے ساتھی شہداء اُحد سے راضی ہو۔ اور ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔ آمین۔



حضرت عبداللہ بن حش رضی اللہ عنہ

وہ صحابی جلیل جن کی زندگی کی چند جھلکیاں ہم اس وقت پیش کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا بہت گہرا اور مضبوط رشتہ تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے دعوت اسلامی کے اولین مرحلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کی والدہ محترمہ حضرت امیمہ بنت عبدالمطلب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برادر نسبتی تھے۔ ان کی ہمیشہ حضرت زینب بنت حش رضی اللہ عنہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ اور اہبات المؤمنین میں تھیں۔ وہ پہلے شخص تھے جن کو اسلام میں کسی فوجی مہم کی قیادت سونپی گئی۔ ان سب کے علاوہ وہ پہلے آدمی، جن کو امیر المؤمنین کے لقب سے پکارا گیا وہ بزرگ اور محترم صحابی حضرت عبداللہ بن حش اسدی رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن حشؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں داخل ہونے سے قبل مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ ان کا شمار سابقین اولین میں ہوتا تھا۔ جب نبیؐ نے قریش کی اذیت رسائیوں سے بچنے کے لیے اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے صحابہ کرامؓ کو ہجرت مدینہ کی اجازت مرحمت فرمائی تو قافلہ ہاجرین میں صرف ایک شخص ان سے آگے تھا۔ ان سے پہلے اس شرف کی طرف سولے حضرت ابو سلمہ کے کسی اور نے سبقت نہیں کی تھی۔

خدا کے لیے ہجرت کرنا اور اس کی راہ میں گھر بار اور اہل و عیال سے جدائی اختیار کرنا حضرت عبداللہ بن جحش کے لیے کوئی نیا تجربہ نہ تھا اس سے پہلے وہ اور ان کے گھرانے کے کچھ لوگ حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے لیکن اب کی بار ان کی ہجرت نہایت مکمل اور وسیع ہجرت تھی۔ اس بار ان کے اہل و عیال، ان کے متعلقین اور اہل خاندان سب نے ہجرت میں ان کا ساتھ دیا۔ ان میں سے مرد، عورتیں، بچے، بچیاں اور بوڑھے، جوان سبھی ان کے شریک سفر تھے کیوں کہ ان کا گھر اسلام کا گھر اور ان کا خاندان ایمان کا خاندان تھا۔

جب یہ لوگ مکہ چھوڑ کر نکل گئے تو ان کے مکانات رنج و ملال اور حزن و افسردگی کی تصویر پیش کر رہے تھے۔ ان کے اوپر اس طرح ویرانی اور ادا سی مسلط ہو گئی اور زندگی کی رونق اور چہل پہل کے آثار اس طرح وہاں سے مٹ گئے جیسے پہلے وہاں کوئی رہتا ہی نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن جحش اور ان کے اہل خانہ کو ہجرت کیسے ہوتے ابھی تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ ایک دن سردار قریش یہ معلوم کرنے کے لیے مکہ کے محلوں اور آبادیوں میں گشت کرنے نکلے کہ مسلمانوں میں سے کون کون سے لوگ مکہ چھوڑ کر جا چکے ہیں اور کون سے لوگ ابھی تک یہاں سکونت پذیر ہیں۔ ان گشت کرنے والوں میں ابو جہل بھی تھا اور عتبہ ابن ربیعہ بھی۔ عتبہ ابن ربیعہ نے دیکھا کہ بنو جحش کے مکانات میں گرد و غبار اڑاتی ہوئی ہوائیں نوہ کرتی پھر رہی ہیں اور ان کے دروازوں کے کھلے ہوئے پٹ آپس میں ٹکرا ٹکرا کر بڑی بھیان تک آواز پیدا کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا کہ بنو جحش کے مکانات ویران ہو گئے ہیں اور یہ اپنے کیمینوں کے فراق میں رو رہے ہیں۔ یہ سن کر ابو جہل نے کہا کہ یہ کیسے لوگ تھے کہ ان

کی جُدائی کے صدمے سے ان کے مکانات تک رو رہے ہیں۔ پھر ابو جہل نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے مکان پر قبضہ کر لیا اور اس پر اور اس میں باقی ماندہ سامان و اسباب پر مالکانہ طور پر تصرف کرنے لگا۔ جب اپنے مکان پر ابو جہل کے قبضے کی خبر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ہوئی اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ عبداللہ! کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے عوض تم کو جنت میں مکان عطا فرمائے۔ انھوں نے کہا کہ کیوں نہیں؟ اے اللہ کے رسول! میں اس پر راضی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم کو اس کے بدلے جنت میں اس سے عمدہ اور عالیشان مکان ملے گا۔ یہ سن کر ان کا جی خوش ہو گیا اور ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنی دونوں ہجرتوں کی مشقتیں جھیلنے کے بعد بھی مدینہ میں قرار و سکون کی دو گھڑیاں بھی نہیں گزار پائے تھے۔ قریش مکہ کے ہاتھوں دکھ اور اذیت برداشت کرنے کے بعد ابھی انصار مدینہ کے زیر سایہ اور ان کے حفظ و امان میں رہ کر وہ مکہ چین کے چند لمحات بھی نہیں بتا سکے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت نے انھیں ان کی زندگی کی سب سے کڑی آزمائش اور ان کے اسلام لانے کے بعد کے سب سے تلخ تجربے سے دو چار کر دیا۔

ہوایہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی اولین فوجی مہم کے لیے آٹھ صحابہ کرام کو جن میں حضرت عبداللہ بن جحش اور حضرت سعد بن ابی وقاص بھی شامل تھے، طلب فرمایا اور کہا کہ میں تمہارا امیر اس شخص کو مقرر کروں گا جو بھوک پیاس کی شدت سب سے زیادہ برداشت کر سکتا ہو۔ پھر آپ نے اس دستے کی قیادت حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائی۔

اس طرح حضرت عبداللہ بن حبشؓ سب سے پہلے مسلمان تھے جن کو مسلمانوں کے کسی فوجی دستے کی قیادت سونپی گئی۔

روانگی سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے سمت سفر کا تعین فرمایا اور ایک خط ان کے حوالے کرتے ہوئے یہ ہدایت کی کہ دو دن کی مسافت طے کرنے سے پہلے اس کو نہ پڑھیں۔ حسب ہدایت جب انہوں نے اس خط کو کھولا تو اس میں یہ ہدایت درج تھی:

”میرے اس خط کو پڑھنے کے بعد آگے بڑھ کر طائف اور مکہ کے درمیان ”نخلہ“ کے مقام پر پڑاؤ ڈالو اور وہاں ٹھہر کر قریش کی ٹوہ لگاؤ اور ان کے حالات سے واقفیت حاصل کرو۔“

حضرت عبداللہؓ نے خط پڑھ کر نبیؐ کے حکم پر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں مقام نخلہ پر پہنچ کر وہاں خفیہ طور پر قریش پر نظر رکھوں اور ان کے حالات سے آپ کو آگاہ کروں۔ انہوں نے مجھے تم میں سے کسی کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے تم میں سے جو شخص شہادت کا طالب اور اس کا آرزو مند ہو وہ میرے ساتھ چلے اور جس کا جی چاہے بلا خوفِ ملامت واپس چلا جائے لیکن سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم رسول اللہؐ کے حکم کو بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جہاں جانے کا حکم دیا ہے، چلے۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔

وہ لوگ وہاں سے آگے بڑھے اور نخلہ کے مقام پر پہنچ کر قریش کے حالات معلوم کرنے کے لیے مختلف راستوں پر چکر لگانے لگے۔ اس تلاش و جستجو کے دوران ان کی نظر دور سے آتے ہوئے قریش کے ایک تبارتی

نافلے پر پڑی جو چار آدمیوں عمرو بن حفص، عمر بن کیسان، عثمان ابن عبداللہ اور اس کے بھائی مغیرہ بن عبداللہ پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ قریش کا سامان تجارت تھا جس میں کھان اور کشمش وغیرہ وہ چیزیں تھیں جن کی وہ تجارت کرتے تھے۔

وہ تاریخ ماہ حرام (رجب) کی آخری تاریخ تھی۔ صحابہ نے آپس میں اس بات پر مشورہ کیا کہ قافلے کے ساتھ کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے۔ اگر ہم انھیں قتل کرتے ہیں تو ماہ حرام میں جنگ و خونریزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ماہ حرام کی حرمت پامال ہوگی اور ہم اہل عرب کی ناراضی اور ان کی ملامت کا ہدف بن جائیں گے اور اگر انھیں آج کی تاریخ گزرنے تک ہہلت دے دیں تو یہ حدود حرم میں داخل ہو کر ہماری پہنچ سے باہر ہو جائیں گے اور خود کو ہماری گرفت سے محفوظ کر لیں گے۔ وہ دیر تک اس مسئلے پر غور و فکر کرتے رہے آخر کار وہ ان کے اوپر حملہ کرنے، انھیں قتل کرنے اور ان کے مال و اسباب کو بطور غنیمت لے لینے پر متفق الرائے ہو گئے اور پھر... تھوڑی دیر میں وہ ان میں سے ایک کو قتل اور دو گرفتار کر چکے تھے۔ البتہ چوتھا شخص بھاگ کر اپنی جان بچا لینے میں کامیاب ہو گیا۔

حضرت عبداللہ اور ان کے ساتھی دونوں ایسروں اور سامان تجارت سے لدے ہوئے اونٹوں کو لیے ہوئے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کارروائی سے آگاہ ہوئے تو آپ نے ان کے اس فعل پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ان سے کہا:

”خدا کی قسم میں نے تمہیں جنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ میں نے تو

تم کو صرف قریش کے حالات معلوم کرنے کا حکم دیا تھا اور یہ ہدایت کی تھی کہ ان کی نقل و حرکت پر تحفیہ طور پر نظر رکھو۔“

آپ نے قیدیوں کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ ان کے معاملے کو

فی الحال ملتوی کر دیا۔ آپ نے مالِ غنیمت سے بھی اعراض فرمایا اور اس میں

سے کچھ نہیں لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے حضرت عبداللہ

بن حبشؓ اور ان کے ساتھیوں کو سخت صدمہ پہنچا اور انھیں اس بات کا یقین

ہو گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب

ہو کر مکمل طور پر تباہی و بربادی کا سامنا کر رہے ہیں۔ مزید برآں ان پر یہ بات

بھی شاق گزری کہ ان کے مسلمان بھائی انھیں ملامت کرنے لگے۔ جب

بھی ان کا گزر مسلمانوں کی کسی ٹولی کی طرف سے ہوتا وہ یہ کہتے ہوئے ان

کی طرف سے منہ پھیر لیتے کہ ”یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے“ اور انھیں اس وقت اور زیادہ

صدمہ پہنچا جب ان کو یہ بات معلوم ہوئی کہ قریش نے ان کی اس حرکت کو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم پر اعتراض کرنے اور ان کو قبائل میں بدنام کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔ مشرکین مکہ یہ

کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرتے پھرے تھے کہ ”محرّم نے حرام پہننے کو حلال کر لیا، اس

میں خونریزی کی، مال لوٹا اور آدمیوں کو گرفتار کیا“ پھر نہ پوچھیے کہ حضرت عبداللہ بن حبشؓ اور

ان کے رفقاء کو اپنی اس فردگذاشت پر کتنا گہرا رنج اور صدمہ ہوا اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے کتنی شرمندگی اور ندامت لاحق ہوئی کیونکہ ان کی اس کارروائی کی وجہ سے

آپؐ سخت ذہنی کوفت و اذیت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جب ان لوگوں کی بے چینی اور

پریشانی حد سے متجاوز اور ان کی قوت برداشت سے باہر ہو گئی تو اچانک

ایک شخص نے آکر انھیں یہ مرثدہ جانفزا سنایا کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی

ہو گیا اور اس نے اس سلسلے میں اپنے نبی پر قرآن نازل کیا ہے۔ یہ سن کر انھیں ناقابل بیان مسرت حاصل ہوئی۔ لوگ قرآن کی اس آیت کو پڑھتے ہوئے انھیں خوش خبری سناتے، انھیں مبارک باد دیتے اور ان کے ساتھ معانقہ کرتے۔

يسئلونك عن الشهر الحرام
قتال فيه - قل قتال فيه كبير -
وصد عن سبيل الله و كفر به
والمسجد الحرام - و اخراج امله
اكبر عند الله و الفتنه اكبر
من القتل -

لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو اس میں لڑنا بہت بُرا ہے مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بُرا ہے۔ اور فتنہ تو خونریزی سے شدید تر ہے۔

(البقرۃ - ۲۱۷)

جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جی خوش ہو گیا۔ آپ نے قافلے کا مال قبول کر لیا اور دونوں قیدیوں کو قیدیہ لے کر رہا فرما دیا۔ پھر آپ حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور ان کے رفقاء سے بھی راضی ہو گئے۔ کیونکہ ان کا یہ غزوہ مسلمانوں کی زندگی میں ایک بہت بڑے اور عظیم واقعے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس غزوہ میں حاصل ہونے والا مالِ غنیمت اسلام میں سب سے پہلا مالِ غنیمت تھا، اس میں قتل ہونے والا شخص پہلا مشرک تھا جس کا خون مسلمانوں نے بہایا۔ اس میں گرفتار ہونے والے قیدی پہلے قیدی تھے جو مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ اس کا جھنڈا پہلا جھنڈا تھا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک نے باندھا اور اس کے امیر حضرت عبداللہ بن جحشؓ وہ

شخص تھے جن کو امیر المؤمنین کے لقب سے پکارا گیا۔ پھر بدر کا معرکہ پیش آیا۔ اس میں حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے شجاعت و مردانگی کے وہ جوہر دکھائے جو ان کے ایمان کے شایانِ شان تھے۔ پھر غزوہ اُحد پیش آیا۔ جس میں حضرت عبداللہؓ اور ان کے دوست حضرت سعد بن ابی وقاص کے مابین ایک یادگار اور ناقابل فراموش واقعہ پیش آیا۔ حضرت سعدؓ اپنے اور اپنے دوست کے واقعے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

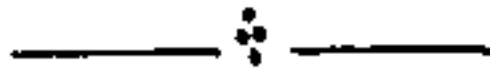
”غزوہ اُحد کے موقع پر عبداللہ بن جحشؓ مجھ سے ملے اور بولے: ”کیا تم اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرو گے؟“ میں نے جواب دیا: ”کیوں نہیں؟“ پھر ہم دونوں ایک طرف خلوت میں چلے گئے اور میں نے دعا کی، ”میرے رب! جب دشمن سے میری ٹڈ بھڑ ہو تو میرا مقابلہ کسی ایسے شخص سے کرانا جس کی گرفت نہایت سخت اور جس کا غیظ و غضب انتہائی شدید ہو۔ میں اس سے لڑوں، وہ مجھ سے لڑے، پھر تو مجھے اس کے اوپر غلبہ و کامرانی عطا فرما، حتیٰ کہ میں اسے قتل کر کے اس کے اسلحے کو اپنے قبضے میں کر لوں!“ عبداللہ بن جحشؓ نے میری اس دعا پر آمین کہی پھر انھوں نے دعا کی:

”خدا یا! میدانِ جنگ میں میرا مقابلہ ایسے شخص سے کرانا جو انتہائی غضبناک اور سخت گیر ہو۔ میں تیری راہ میں اس سے جنگ کروں اور وہ مجھ سے لڑے پھر وہ میرے اوپر غالب آجائے اور میری ناک اور میرے کان کاٹ لے اور جب قیامت کے دن میں تیرے سامنے حاضر ہوں تو، تو مجھ سے پوچھے کہ میرے بندے! تیری ناک اور تیرے کان کیوں کاٹے گئے۔ تو میں کہوں کہ: ”خدا یا! تیری اور تیرے رسولؐ کی راہ میں اور تو کہے کہ تو نے سچ کہا۔“

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن جحشؓ کی دعا میری دعا

سے اچھی تھی۔ میں نے دن کے آخری حصے میں دیکھا کہ انھیں قتل کر کے ان کا
 منہ کر دیا گیا ہے اور ان کی ناک اور کانوں کو ایک دھاگے کے ذریعہ درخت پر
 لٹکا دیا گیا ہے۔

اللہ نے حضرت عبداللہ بن حبش کی دعا قبول فرمائی اور انھیں شہادت
 کی نعمت سے نوازا جیسا کہ ان کے ماموں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو نوازا
 تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا۔
 اس وقت آپ کے مقدس آئسوان کی قبر کو ترک کر رہے تھے جو شہادت کی خوشبو
 سے معطر ہو رہی تھی۔



حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ

وہ پاکیزہ رو، خوش شکل، لاغر اندام اور سبک رفتار شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں دیکھ کر آنکھوں کو راحت ملتی اور ان سے مل کر روح کو سکون اور دل کو قرار میسر آتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ بے حد خوش اخلاق منکسر المزاج اور شرم حیا کے پیکر تھے۔ لیکن جب کوئی سخت معاملہ پیش آتا یا کوئی کٹھن گھڑی سامنے آتی تو وہ ایک بھرے ہوتے شیر کی مانند نظر آتے۔ وہ رونق و صفائی اور تیزی اور کاٹ میں تلوار کی دھار کے مشابہ تھے۔ یہ امت محمد کے امین حضرت ابو عبیدہ عامر بن عبداللہ بن جراح ہنری قرشی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”قریش کے تین آدمی سب سے زیادہ درخشندہ رو، سب سے زیادہ خوش اخلاق اور سب سے زیادہ باحیا ہیں۔ اگر وہ تم سے بات کریں گے تو کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے اور اگر تم ان سے بات کرو گے تو کبھی تمہاری تکذیب نہیں کریں گے وہ ہیں ابو بکر صدیق، عثمان بن عفان اور ابو عبیدہ ابن جراح رضوان اللہ علیہم“

حضرت ابو عبیدہؓ السابقون الاولون میں سے تھے وہ حضرت ابو بکرؓ کے مسلمان ہونے کے دوسرے دن انہی کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت ابو بکر ان کو، حضرت عبدالرحمن بن عوف کو حضرت عثمان بن

منظور کو اور حضرت ارقم بن ابی ارقم کو لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان لوگوں نے آپ کے روبرو کلمہ حق کا اعلان کیا۔ یہ لوگ بنیاد کی وہ نخت اولین تھے جس پر اسلام کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی۔

اگرچہ حضرت ابو عبیدہؓ نے مکہ میں رہتے ہوئے شروع سے آخر تک ان شدید ترین آزمائشوں کو برداشت کرتے ہوئے زندگی گزاری جن میں مسلمانوں کو بتلا کیا گیا۔ انھوں نے ابتدائی مسلمانوں کے ساتھ مصائب و آلام کی جو سختیاں جھیلیں، روتے زمین پر کسی دین کے متبعین نے نہ جھیلی ہوں گی۔ انھوں نے بڑی پامردی اور عزم و حوصلہ کے ساتھ ان ابتلاؤں کا مقابلہ کیا اور ہر موقع پر خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ سچی محبت کا ثبوت دیا لیکن غرور و بدر کے موقع پر وہ جس آزمائش میں مبتلا ہوئے اس کی سختی ہر خیال و تصور سے بالاتر تھی۔

وہ جنگ بدر میں صفوں کے درمیان اس طرح بڑھ بڑھ کر اور پینترے بدل بدل کر حملے کر رہے تھے جیسے ان کو نہ تو موت کا کوئی ڈر ہے نہ ہلاکت کا کوئی اندیشہ۔ ان کے حملوں نے مشرکین پر ان کی ہیبت طاری کر دی اور قریش کے بڑے بڑے شورا ما ان کا سامنا کرنے سے کترانے لگے لیکن ان میں سے ایک شخص ایسا تھا جو ہر وقت ان کا سامنا کرنے کی کوشش کرتا اور ہر موقع پر ان کے بالمقابل آجاتا مگر وہ اس کے راستے سے ہٹ جاتے اور اس کے ساتھ مقابلہ کرنے سے پرہیز کرتے۔ وہ شخص بار بار ان کے اوپر حملہ آور ہوتا اور وہ ہر بار کتر کر دوسری طرف نکل جاتے آخر کار اس نے ان کے لیے سارے راستے مسدود کر دیے، ان کے سامنے

آکھڑا ہوا اور ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ جب اس کی یہ حرکتیں حضرت ابو عبیدہؓ کی قوت برداشت سے باہر ہو گئیں تو انہوں نے اس کے سر پر تلوار کا ایک بھر پور ہاتھ مارا۔ اس کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہو گئے اور وہ بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔

قارئین کرام یہ اندازہ لگانے کی کوشش نہ کریں کہ یہ مرنے والا شخص کون ہو گا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت ابو عبیدہؓ کا امتحان ہر قسم کے خیال و گمان سے بلند تھا۔ اور آپ کا سر چکرا جائے گا جب یہ بات آپ کے علم میں آئے گی کہ حضرت ابو عبیدہؓ کے ہاتھ سے مارا جانے والا شخص کوئی اور نہیں خود ان کے والد عبداللہ بن جراح تھے۔ انہوں نے اپنے والد کو نہیں ان کی شخصیت میں پائے جانے والے کفر کو قتل کیا تھا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو عبیدہؓ اور ان کے والد کے متعلق قرآن نازل کرتے ہوئے فرمایا:

تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو مثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا

لا تجد قومًا يؤمنون بالله و
اليوم الآخر، يوادون من حاد
الله ورسوله ولو كانوا آباءهم
أو أبناءهم أو إخوانهم أو
عشيرتهم أولئك كتب في
قلوبهم الإيمان وایدہم
بروح منه ویدخلہم جنت
تجری من تحتها الانہار
خالدين فیہا۔ رضی اللہ عنہم

درضوا عنه - اولئك حزب
 الله الا ان حزب الله هم
 المفلحون -
 (مجادلہ: ۲۲)

کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان
 لوگوں کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا
 جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان
 میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے
 راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں، جب دربار ہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے
 والے ہیں۔

حضرت ابو عبیدہؓ کی طرف سے اس بات کا صادر ہونا کچھ حیرت انگیز
 اور تعجب نیز نہ تھا۔ وہ اپنی قوت ایمانی، دینی نصیح و نیر خواہی اور امت محمدیہ
 علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے امانت داری کے اس مقام بلند پر فائز
 تھے کہ بہت سے لوگوں کی رشک آمیز نگاہیں ان کی طرف اٹھتی رہتی تھیں۔
 محمد بن جعفر نے بیان کیا ہے کہ ایک بار نصاریٰ کا ایک وفد رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہوا اور اس نے آپ سے درخواست
 کی کہ ”ابو القاسم! آپ ہمارے ساتھ اپنے اصحاب میں سے کسی ایسے شخص
 کو بھیجئے جس کو آپ ہمارے لیے پسند کرتے ہوں تاکہ وہ ہمارے درمیان
 ان جائیدادوں کا فیصلہ کرے جن کے بارے میں ہمارے اندر اختلاف
 پیدا ہو گیا ہے“ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”تم دن کے
 وقت مجھ سے ملو۔ میں تمہارے ساتھ ایک قوی امین کو روانہ کروں گا۔“
 حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں ظہر کی نماز کے لیے بہت سویرے پہنچا۔
 اس روز کی طرح میرے دل میں امانت کی کبھی خواہش نہیں پیدا ہوئی۔

تھی اور امارت کی یہ خواہش میرے دل میں صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ ممکن ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ وصف کا میں ہی مصداق ٹھہروں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگے تو میں اچک اچک کر خود کو نمایاں کرنے لگا تاکہ آپ کی نظر میرے اوپر پڑ سکے لیکن آپ میری طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنی نگاہوں کو مجمع کے درمیان گردش دیتے رہے یہاں تک کہ آپ کی منتجس نظریں ابو عبیدہ بن جراح پر جا کر ٹپک گئیں۔ آپ نے ان کو اپنے پاس بلایا اور اہل وفد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

”ان کے ساتھ جاؤ اور ان کے درمیان پیدا شدہ نزاعی معاملے کا برحق اور مبنی برانصاف فیصلہ کر دو۔“ یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا، ”ابو عبیدہ اس فضیلت کو لے اڑے۔“

حضرت ابو عبیدہؓ صرف صفت امانت ہی سے متصف نہ تھے وہ امانت داری کے ساتھ ساتھ زبردست قوت ایمانی کے مالک بھی تھے اور بہت سے مواقع پر ان کی اس قوت کا اظہار بھی ہو چکا تھا۔ اس قوت کا اظہار خاص کر اس وقت ہوا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کا ایک دستہ قریش کے تجارتی قافلے سے تعرض کرنے کے لیے روانہ فرمایا اور حضرت ابو عبیدہؓ کو اس کا امیر مقرر کیا تھا۔ روانگی کے وقت آپ نے کھجوروں سے بھری ہوئی ایک تھیلی ان کے حوالے کی تھی انھیں زاد سفر کے طور پر دینے کے لیے اس وقت اس کے علاوہ دوسری کوئی چیز آپ کو پیش نہ تھی۔ حضرت ابو عبیدہؓ اپنے ساتھیوں میں سے ہر ایک کو روزا ایک ایک کھجور دیتے اور ہر شخص اس کھجور کو اس طرح چوستا جس طرح شیر خوا

بچہ ماں کی چھاتیوں کو چوستا ہے، اور اوپر سے پانی پی لیتا تھا اور یہی اس کی پورے ایک دن کی خوراک ہوتی تھی۔

ان کی قوت ایمانی کا اظہار اس وقت بھی ہوا تھا جب غزوہ احد کے موقع پر مسلمانوں کو شکست اور ان کے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کے بعد مشرکین پیہم آوازیں لگا رہے تھے۔ ”ہمیں بتاؤ! محمد کہاں ہے؟ بتاؤ، ہمیں کہاں ہے محمد؟ تو حضرت ابو عبیدہؓ ان دس افراد میں سے ایک تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے ان کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا تاکہ آپ کی طرف بڑھنے والے مشرکین کے نیزوں کو اپنے سینوں پر روک لیں۔

جنگ ختم ہوئی تو آپ کے سامنے کے دو دانت شہید ہو چکے تھے۔ پیشانی مبارک زخمی ہو گئی تھی اور رخسار مبارک میں خود کی کڑیاں چھب گئی تھیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان کو رخسار مبارک سے نکالنا چاہا تو حضرت ابو عبیدہؓ نے انہیں قسم دے کر کہا کہ یہ کام آپ میرے لیے چھوڑ دیں اور انہوں نے چھوڑ دیا کہ ابو عبیدہؓ یہ خدمت انجام دیں۔

حضرت ابو عبیدہؓ کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ ان کڑیوں کو ہاتھوں سے کھینچ کر نکالتے ہیں تو آپ کو تکلیف ہوگی۔ اس لیے انہوں نے ایک کڑی کو دانتوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑا اور زور لگا کر کھینچا تو وہ باہر آگئی مگر ساتھ ہی ان کا ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔ پھر انہوں نے دوسری کڑی کو بھی اپنے دانتوں کی مضبوط گرفت میں لے کر زور لگایا، کڑی پیشانی مبارک سے نکل گئی مگر ان کا دوسرا دانت بھی ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ حضرت ابو بکرؓ کہا کرتے تھے کہ ”ابو عبیدہؓ ان لوگوں میں سب سے اچھے

ہیں جن کے آگے کے دانت ٹوٹے ہوتے ہوں۔“

حضرت ابو عبیدہ رضی شروع سے آخر تک تمام غزوات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے اور جب سقیفہ بنی ساعدہ کا موقع آیا جس موقع پر حضرت ابو بکر صدیق رضی کے دست مبارک پر خلافت کی بیعت کی گئی تھی، تو حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابو عبیدہ رضی سے کہا کہ ”اپنا ہاتھ بڑھائیے آپ کی بیعت کروں، اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ سے یہ کہتے سنا ہے کہ ہر امت کا ایک امین ہوتا اور ہماری امت کے امین تم ہو۔“ تو انہوں نے جواب دیا کہ ”میں اس شخص سے آگے بڑھنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم مسلمانوں کا امام بنایا اور آپ کی وفات تک وہ ہماری امامت کرتا رہا۔“ اور اس کے بعد جب حضرت ابو بکر رضی کے دست مبارک پر خلافت کی بیعت ہو گئی تو حضرت ابو عبیدہ رضی حتی و صداقت کے معاملہ میں ان کے بہترین خیر خواہ اور خیر و فلاح میں ان کے قابل اعتماد معاون ثابت ہوئے۔

پھر جب حضرت ابو بکر رضی نے اپنے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کی وصیت کی اور اس کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں تو حضرت ابو عبیدہ رضی نے مکمل طور پر ان کی اطاعت کی اور ایک مرتبہ کے علاوہ کبھی ان کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ وہ کون سا موقع تھا جب حضرت ابو عبیدہ رضی نے خلیفۃ المسالمین کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی؟

ہوا یہ کہ جس زمانے میں وہ شام کے علاقے میں لشکر مجاہدین کی قیادت فرما رہے تھے اور یکے بعد دیگرے فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے، پورے علاقے کو فتح کرتے ہوئے ایک طرف مشرق میں

دریائے فرات اور دوسری جانب شمال میں ایشیائے کوچک تک پہنچ گئے تھے۔ شام میں اچانک طاعون کی زبردست اور غیر معمولی وبا پھوٹ پڑی جس نے بے شمار انسانوں کو اپنے بھیانک خونی پنچوں میں جکڑ لیا اور دیکھتے دیکھتے ان گنت انسان لقمہ اجل بن گئے۔ حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو وہ سخت تشویش میں مبتلا ہو گئے اور انھوں نے ایک قاصد کو اس پیغام کے ساتھ ابو عبیدہؓ کی خدمت میں روانہ کیا کہ ”اچانک مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے جس میں میرے لیے آپ سے مشورہ کرنا ناگزیر ہے۔ میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اگر میرا خط آپ کے پاس رات کے وقت پہنچے تو صبح کا انتظار کیے بغیر عازم سفر ہو جائیے اور اگر دن کو ملے تو شام ہونے سے پہلے زحمت سفر باندھ لیجئے۔“ حضرت ابو عبیدہؓ کو جب حضرت عمرؓ کا یہ خط ملا تو انھوں نے فرمایا:

”مجھے معلوم ہے کہ امیر المومنین کو مجھ سے کیا ضرورت ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کو بچانا چاہتے ہیں جو بچنے والا نہیں ہے۔“ پھر انھوں نے ان کے جواب میں لکھا: ”امیر المومنین! میں سمجھ گیا کہ آپ کو مجھ سے کیا ضرورت ہے۔ میں مسلمانوں کے شکر میں اور اپنے دل میں اس قسم کی کوئی خواہش نہیں پاتا کہ میں اپنے آپ کو اس وبا سے محفوظ کر لوں جس میں یہ سب لوگ مبتلا ہیں۔ میں اس وقت تک ان سے الگ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے بارے میں اپنا فیصلہ نافذ نہیں کر دیتا۔ اس لیے جب میرا یہ خط آپ کو ملے تو آپ مجھے اپنی قسم سے بڑی کر دیجئے اور مجھے یہاں ٹھہرنے کی اجازت مرحمت فرما دیجئے۔“ حضرت عمرؓ نے یہ خط پڑھا تو رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو

جاری ہو گئے، حاضرین نے ان کی شدتِ گریہ کو دیکھ کر پوچھا کہ کیا ابو عبیدہؓ کا انتقال ہو گیا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ”نہیں ان کا انتقال نہیں ہوا ہے مگر موت ان سے زیادہ دور نہیں ہے۔“ اور حضرت عمرؓ کا یہ اندیشہ غلط نہیں تھا اس لیے کہ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ طاعون میں مبتلا ہو گئے اور جب ان کی موت کی گھڑی قریب آگئی تو انھوں نے اپنی فوج کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا ”میں تم لوگوں کو ایک وصیت کر رہا ہوں، اگر اس پر عمل کرو گے تو ہمیشہ خیر و فلاح پر قائم رہو گے۔ دیکھو! نماز قائم کرو، ماہِ رمضان کے روز رکھو، صدقہ و خیرات کرتے رہو، حج اور عمرہ ادا کرو، آپس میں ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کیا کرو، اپنے امراء کے ساتھ خیر خواہی کرو، ان کے ساتھ خیانت اور فریب سے کام نہ لو اور دنیا تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اس لیے کہ اگر آدمی کو ہزاروں سال کی طویل زندگی بھی مل جائے تب بھی اس کے لیے اس انجام سے دوچار ہونا ضروری ہے جس سے اس وقت میں دوچار ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔“

پھر انھوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا ”معاذ! میرے بعد لوگوں کو نماز تم پڑھاؤ گے“ اور تھوڑی دیر بعد طائر روح قفسِ عنبری سے پرواز کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال کے بعد حضرت معاذ بن جبلؓ نے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

لوگو! تم ایک ایسے شخص کی موت کے صدے سے دوچار ہو کہ بخدا میں نے آج تک کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اس سے زیادہ مخلص و پاک طینت اور اس سے زیادہ شروکینہ سے دور ہو۔ نہ میں نے کسی ایسے شخص کو دیکھا جو اس سے زیادہ آخرت سے محبت کرنے والا اور مسلم عوام کا خیر خواہ ہو۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحم کی دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر رحم فرمائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

اس وقت وہ ایک کم سن اور قریب البلوغ لڑکے تھے۔ وہ روزانہ مکہ کے ایک رئیس عقبہ ابن معیط کی بکریوں کو لے کر انھیں چرانے کے لیے انسانی آبادی سے دور مکے کی پہاڑیوں اور وادیوں کی طرف نکل جایا کرتے تھے ان کا نام عبداللہ اور ان کے والد کا نام مسعود تھا لیکن عام طور سے لوگ انھیں "ابن ام عبد" کہہ کر پکارتے تھے۔

کم سن عبداللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں اکثر سنا کرتا تھا جو قریش میں اپنی نبوت کا اعلان کر چکے تھے، مگر ایک تو اپنی کم عمری اور دوسرے آبادی سے دور، انسانی سوسائٹی سے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں کر پاتا تھا۔ اس کا تو روز کا یہ معمول تھا کہ صبح منہ اندھیرے عقبہ ابن معیط کی بکریوں کے ساتھ نکل جاتا اور اس وقت واپس لوٹتا جب رات کی تاریکی پورے طور پر فضا کو اپنی سیاہ چادر میں چھپا لیتی تھی۔

ایک روز عبداللہ بن مسعود نے دور فاصلے پر ادھیڑ عمر کے دو آدمیوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا جو مکان سے چور اور تھکاوٹ سے نڈھال ہونے کی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور شدت تشنگی کے مارے ان کے ہونٹ اور حلق سوکھ کر کاٹھا ہو رہے تھے۔ وہ دونوں اس کے قریب پہنچ کر رُکے، اسے سلام کیا اور بولے:

”لڑکے! ہمارے لیے ان بکریوں کا دودھ دو جو جس سے ہم اپنی پیاس

بچھا سکیں اور اپنی رگوں کو تر کر سکیں۔“

”میں ایسا کرنے سے معذور ہوں۔ میں ان بکریوں کا دودھ آپ کو نہیں پیش

کر سکتا کیونکہ یہ میری نہیں ہیں بلکہ میری امانت میں ہیں۔ میں ان کا مالک نہیں،

ایمن ہوں۔“

لڑکے کا جواب سن کر ان دونوں نے کسی قسم کی ناگواری یا ناراضگی کا اظہار

نہیں کیا بلکہ ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہوں نے اس جواب کو

پسند کیا ہے۔ پھر ان میں سے ایک آدمی نے کہا:

”اچھا کسی ایسی بکری کی نشاندہی کرو جس نے کبھی بچہ نہ دیا ہو۔“ لڑکے نے

اپنے قریب ہی کھڑی ایک چھوٹی سی بکری کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ آدمی اس

کے قریب گیا۔ اسے پکڑا اور اللہ کا نام لے کر اس کے تھن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

لڑکے نے حیرت کے ساتھ دیکھا اور اپنے دل میں کہا کہ ایسا کیونکر ہو سکتا

ہے کہ ایسی بکریاں جو کبھی گا بھن نہ ہوتی ہوں، دودھ دینے لگیں۔ لیکن

دیکھتے ہی دیکھتے بکری کا تھن پھول کر بڑا ہو گیا اور اس میں تیزی کے ساتھ

دودھ بہنے لگا، دوسرے آدمی نے زمین پر پڑا ہوا ایک پیالہ نما گہرا سا پتھر

اٹھا کر اسے دودھ سے بھریا پھر اس دودھ کو ان دونوں نے پیا اور لڑکے

کو بھی پلایا۔ عبداللہ بن مسعود نے بتایا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے پیش آنے

والے اس واقعے پر مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ جب ہم سب لوگ اچھی طرح

آسودہ ہو گئے تو اس بابرکت شخص نے بکری کے تھن سے کہا: ”سکڑ جا“

اور وہ سکڑتے سکڑتے اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس وقت میں نے اس

بابرکت شخص سے کہا:

” وہ کلمات جو آپ نے ابھی کہے تھے، ان میں سے کچھ مجھے بھی سکھا دیجئے۔“ تو اس نے کہا:

” اَنْتَ غَلَامٌ مَّعْلَمٌ “ تم ایک سکھائے پڑھائے لڑکے ہو۔“

یہ اسلام سے عبداللہ بن مسعود کی شناسائی کی کہانی کا آغاز تھا اور وہ مبارک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ دونوں حضرات قریش کی شدید ایذا رسانی اور ابتلا و آزمائش سے بچنے کے لیے اس روز مکہ کی گھائیٹوں کی طرف نکل آتے تھے۔ لڑکے نے جس انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما سے اپنی محبت اور تعلق خاطر کا اظہار کیا اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما بہت خوش ہوئے۔ اس کی احتیاط اور امانت داری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کے اندر خیر و فلاح کی علامت کو محسوس کر لیا۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد عبداللہ بن مسعود نے اسلام قبول کر لیا اور خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے وقف کرتے ہوئے اپنے آپ کو بارگاہ نبوت میں پیش کر دیا اور اسی روز سے وہ سعادت مند اور خوش بخت لڑکا بکریوں کی گلہ بانی سے نکل کر سرور کائنات کی خدمت میں منتقل ہو گیا، وہ ہر وقت سفر میں، حضر میں، گھر کے اندر اور گھر سے باہر سائے کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ رہتے۔ جب آپ سو جاتے تو وہ آپ کو بیدار کرتے، جب آپ غسل کرتے تو وہ پردے کا انتظام کرتے، جب آپ باہر جانے کا ارادہ کرتے تو وہ آپ کو جوتے پہناتے، جب آپ گھر میں داخل ہوتے تو وہ جوتوں کو پائے مبارک سے نکالتے، وہ آپ

کے عصا اور مسواک کی حفاظت کرتے اور جب آپ کمرے میں داخل ہونے کا ارادہ فرماتے تو وہ اس سے پہلے اس میں داخل ہوتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے قرب و تعلق کا یہ حال تھا کہ آپ نے انہیں ہر وقت اپنے گھر آنے اور اپنے تمام رازوں سے واقف رہنے کی اجازت دے رکھی تھی، اسی وجہ سے وہ ”رازدانِ رسول“ کہے جاتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آپ کے زیر تربیت پروانِ چڑھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو آپ کے اخلاق و عادات کے سانچے میں ڈھال لیا۔ خود کو آپ کی صفات سے متصف کر لیا اور ہر کام میں آپ کی پیروی کو اپنا وظیفہ حیات بنا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اخلاق و عادات کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر تھے۔ انہوں نے مدرسہ رسول سے علوم قرآن کا درس لیا، وہ صحابہ کرام میں سب سے بڑے قاری، اس کے معانی کے سب سے بڑے رمز شناس اور شریعتِ الہی کے سب سے بڑے نکتہ دان تھے۔ ایک بار جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ میدانِ عرفات میں وقوف فرمائے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

”امیر المؤمنین! میں کوفہ سے آیا ہوں۔ میں نے وہاں ایک شخص کو دیکھا جو قرآن میں دیکھے بغیر زبانی اس کا املا کرتا ہے۔“ یہ سن کر انہوں نے خشکیں لہجے میں پوچھا:

”تیرا بڑا ہو، کون ہے وہ شخص؟“

”عبداللہ بن مسعود“ اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر بہ تدریج ان کے غصے کا اثر زائل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ

وہ اپنی معمولی اور نارمل حالت پر آگئے۔ پھر انہوں نے فرمایا :
 ”بخدا میں نہیں جانتا کہ ان سے زیادہ کوئی دوسرا شخص بھی اس کا
 حقدار ہے۔ اس کے متعلق میں تم سے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں :
 ”ایک رات کا ذکر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکرؓ کے یہاں
 تشریف فرما تھے۔ وہ دونوں حضرات مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں
 بات چیت کر رہے تھے۔ اس مجلس میں میں بھی موجود تھا۔ پھر رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم وہاں سے نکلے۔ ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ چلے۔ اچانک ہم
 نے دیکھا کہ کوئی شخص مسجد میں کھڑا نماز پڑھ رہا ہے۔ ہم اسے پہچان نہ سکے۔
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر کھڑے ہو کر اس کی قرأت سنتے رہے
 پھر ہماری طرف مڑتے ہوئے بولے :

من سرّہ ان یقرأ القرآن رطباً لما نزل فلیقرأہ علی قرأۃ ابن
 ام عبد“ جو شخص قرآن کو اس طرح پڑھنا چاہے جیسا کہ وہ نازل ہوا ہے تو اسے
 چاہیے کہ ابن ام عبد کی قرأت کے مطابق اسے پڑھے۔“ پھر جب عبد اللہ بن
 مسعود بیٹھ کر دعائے مانگنے لگے تو رسول اللہ کہتے جاتے ”سل تعطہ، سل تعطہ“
 ”مانگو دیا جائے گا، مانگو دیا جائے گا۔“

حضرت عمرؓ نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا : ”پھر میں
 نے اپنے دل میں کہا کہ بخدا میں صبح سویرے ان کے پاس جا کر ان کو رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کی دعائے آمین کہنے کی خوش خبری سناؤں گا۔ اور
 جب سویرے ان کو خوش خبری دینے کے ارادے سے ان کے یہاں گیا
 تو کیا دیکھتا ہوں کہ ابو بکرؓ مجھ سے پہلے ان کو یہ خوش خبری دے چکے ہیں۔ خدا
 کی قسم میں نے جب بھی کسی خیر میں ابو بکرؓ سے مسابقت کی، ابو بکرؓ نے

ہمیشہ مجھے پیچھے چھوڑ دیا۔“

کتاب اللہ کے علم میں ابن مسعود کا مقام اتنا بلند تھا کہ وہ خود فرماتے ہیں:
 ”قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، قرآن کریم کی جو آیت بھی
 نازل ہوئی اس کے بارے میں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کہاں اور کس
 کے متعلق نازل ہوئی۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اس کے متعلق کوئی شخص مجھ
 سے زیادہ علم رکھتا ہے اور اس کے پاس پہنچنا ممکن ہو تو میں وہاں پہنچ کر اس
 کے علم سے ضرور استفادہ کروں گا۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود نے اپنے متعلق جو کچھ فرمایا۔ اس میں ذرہ برابر
 مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے حضرت عمر بن خطابؓ ایک مرتبہ اپنے ایک سفر کے
 دوران ایک قافلے سے ملتے ہیں، رات اندھیری ہے، اس نے پورے قافلے کو
 تاریکی کے پردے میں چھپا رکھا ہے، اس قافلے میں ابن مسعود بھی ہیں، حضرت عمرؓ
 ایک شخص سے کہتے ہیں کہ پوچھو۔

”آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟“

ابن مسعود: ”فج عتیق سے۔“

حضرت عمرؓ: ”اور کہاں کا ارادہ ہے؟“

ابن مسعود: ”بیت عتیق کا۔“

یسن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس قافلے میں کوئی صاحب علم ہے، اور
 انہوں نے اپنے آدمی سے کہا پوچھو۔

”قرآن کا کون سا حصہ سب سے عظیم ہے؟“

ابن مسعود: اللہ لا الہ الا ہوا الحی القیوم۔ لا تأخذہ سنۃ ولا نوم۔ اللہ وہ
 زندہ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو نبھالے ہوئے ہے۔ اس کے سوا کوئی

خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے، نہ اسے اُونگھ لگتی ہے۔ (بقرہ: ۲۵۵)

حضرت عمرؓ: ”قرآن کا کون سا حصہ سب سے زیادہ محکم ہے؟“

ابن مسعودؓ: ”ان الله يامر بالعدل والاحسان وايتاء ذى القربى“ اللہ تعالیٰ

عدل واحسان اور رشتہ داروں سے صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔“ (نحل: ۹۰)

حضرت عمرؓ: ”قرآن کا کون سا ٹکڑا سب سے جامع ہے؟“

ابن مسعودؓ: ”فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره۔ ومن يعمل مثقال

ذرة شرا يره۔“ پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور

جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ (زلزال: ۷-۸)

حضرت عمرؓ: ”قرآن کا کون سا حصہ سب سے زیادہ خوفناک ہے؟“

ابن مسعودؓ: ”ليس بأمانيتكم ولا امانى اهل الكتاب۔ من يعمل سوءا يجزيه

ولا يجبد من دون الله ولي ولا نصيرا“ انجام کاڑنے تمہاری

آرزوؤں پر موقوف ہے، نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی برائی کرے گا اس کا

پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پاسکے گا۔“

(نسا: ۱۲۳)

حضرت عمرؓ: ”قرآن کا کون سا حصہ سب سے زیادہ اُمید افزا ہے؟“

ابن مسعودؓ: ”قل يا عبادى الذين اسرفوا على انفسهم لا تقنطوا من

رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعا، ان الله هو الغفور

الرحيم۔ (اسے نبی) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر

زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف

کر دیتا ہے۔ وہ تو غفور رحیم ہے۔“ (زمر: ۵۲)

حضرت عمرؓ نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ ”کیا تم میں عبد اللہ بن مسعود ہیں؟“

یوں والدوں نے جواب دیا کہ ”ہاں“

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صرف عالم وقاری اور عابد و زاہد ہی نہیں تھے بلکہ وہ بڑے ہمتی، نہایت ڈوراندیش اور زبردست مجاہد اور میدان کارزار میں پیکر جرات و شجاعت بھی تھے۔ وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے مشرکین کے مجمع میں باواز بلند قرآن پڑھ کر سنایا۔ ایک روز مسلمان (جب وہ قلیل التعداد اور کمزور تھے) مکہ میں اکٹھا ہوئے اور آپس میں کہنے لگے۔ بخدا، ابھی تک قریش نے باواز بلند کسی سے قرآن نہیں سنا۔ کون ہے جو ان کو سنادے؟ حضرت عبداللہؓ نے کہا ” میں انہیں قرآن سناؤں گا۔“ صحابہؓ نے کہا ” آپ اس کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ کام کوئی ایسا شخص انجام دے جس کی پشت پر اس کے قبیلے کی طاقت ہو کہ اگر قریش اس کے ساتھ بری نیت سے پیش آئیں تو اس کا قبیلہ اس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔“ لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ ” نہیں یہ کام مجھے ہی کرنے دو۔ اللہ تعالیٰ مجھے ان کے شر سے محفوظ رکھے گا اور ان کے مقابلے میں میری حمایت کرے گا۔“ پھر وہ چاشت کے وقت مسجد حرام میں داخل ہوئے اور مقام ابراہیم کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت سرداران قریش کعبہ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہؓ نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے قرآن کی تلاوت شروع کی: **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** ۵۔ **عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبِیَانَ** اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ نہایت مہربان، خدا نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔ (الرحمن: ۱-۵) وہ کتاب الہی کی آیات پڑھتے چلے گئے۔ آواز سن کر سرداران قریش ان

کی طرف متوجہ ہوتے اور بولے :

”یہ ابن ام عبد کیا پڑھ رہا ہے؟..... اسے اس کا ناس ہو۔ یہ تو اسی پیغام کا کوئی حصہ پڑھ رہا ہے جس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لائے ہیں، یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، تیزی سے ان کی طرف لپکے اور ان کے چہرے پر مارنے لگے لیکن انھوں نے تلاوت کا سلسلہ منقطع نہیں کیا وہ برابر پڑھتے رہے اور وہیں جا کر رُک کے جہاں تک وہ پہنچنا چاہتے تھے پھر وہ لوٹ کر اپنے ساتھیوں میں آئے۔ اس وقت ان کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ لوگوں نے ان کو اس حالت میں دیکھ کر کہا ”آپ کے متعلق ہم کو اسی بات کا اندیشہ تھا۔“ یہ سن کر انھوں نے کہا۔

”بخدا یہ دشمنانِ خدا آج سے پہلے میری نظر میں اتنے ذلیل و بے وقعت نہ تھے اگر آپ لوگ چاہیں تو میں کل بھی ان کو اسی طرح قرآن سننا سکتا ہوں۔“ لیکن ساتھیوں نے کہا کہ ”نہیں، بس اتنا کافی ہے، تم نے ان کو وہ چیز سنادی جس کا سننا انھیں گوارا نہیں ہے۔“ ابن مسعودؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت تک زندہ رہے جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت عثمانؓ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ مزاج پرسی کے بعد انھوں نے دریافت کیا ”آپ کو کس چیز کی شکایت ہے؟“

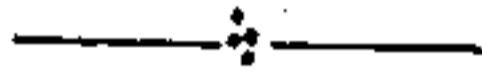
بولے ”اپنے گناہوں کی۔“ پوچھا ”کیا خواہش ہے؟“ بولے ”اپنے رب کی رحمت کی۔“

پوچھا ”کیوں نہ آپ کے وظیفے کی ادائیگی کا حکم جاری کر دوں جس کو لینے سے آپ نے پچھلے کئی سالوں سے انکار کر دیا ہے؟“ بولے ”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

کہنے لگے ”آپ کے بعد آپ کی بچیوں کے کام آئے گا“

بولے ”کیا آپ کو میری بیٹیوں کے متعلق محتاجی کا اندیشہ ہے؟ میں نے انھیں ہر رات سورہ واقعہ پڑھنے کی ہدایت کر دی ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ”من قرأ الواقعة کل لیلۃ لم تصبہ فاقۃ۔ جو شخص ہر رات کو سورہ واقعہ پڑھ لیا کرے گا وہ فقر وفاقہ سے دو چار نہ ہوگا۔“

اور جب رات آئی تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ اس وقت ان کی زبان مبارک اللہ کے ذکر اور اس کی آیات بیّنات سے تر تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔



حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

یہ کہانی ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جو عرصہ دراز تک حقیقت کی تلاش و جستجو میں اس کے پیچھے بھاگتا اور طویل مدت تک خدا کی یافت کے لیے سرگرواں و پریشاں رہا۔ یہ قصہ حضرت سلمان فارسی کا قصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور انہیں راضی کرے۔

یہ بات ہم اپنی پرچھوڑتے ہیں کہ وہ اپنے اس قصے کے واقعات و حوادث کو اپنی زبان سے بیان کریں کیوں کہ اس معاملے میں ان کا شعور نہایت گہرا اور ان کا بیان زیادہ مہنی برصداقت ہے۔ حضرت سلمان اپنی کہانی کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میں اصفہان کی ایک بستی "جیان" کا رہنے والا ایک ایرانی نوجوان تھا۔ میرے والد اس گاؤں کے زمیندار، اس کے باشندوں میں سب سے زیادہ مالدار اور سماجی لحاظ سے سب سے بلند مقام و مرتبہ کے مالک تھے۔ وہ میرے روز پیدائش ہی سے میرے ساتھ غیر معمولی محبت رکھتے تھے اور ان کی یہ محبت مرد و ایام کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی اور اس میں شب و روز ارتقار و اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے نقصان پہنچنے کے موبہوم خطرات کے پیش نظر انھوں نے لڑکیوں کی طرح میرے گھر سے نکلنے پر سخت پابندی عائد کر دی۔ میں نے اپنے آبائی مذہب مجوسیت کا علم حاصل کرنے اور اس

کے احکام و فرائض پر عمل کرنے میں غیر معمولی محنت اور دلچسپی سے کام لیا اور ترقی کر کے آتش کدہ کا مرزبان ہو گیا اور شب و روز اس کو دہکانے اور روشن رکھنے کی ذمہ داری میرے سپرد کر دی گئی۔

میرے والد کے پاس کافی زمین تھی جس سے بڑی مقدار میں غلہ حاصل ہوتا تھا۔ زمین کا انتظام اور فصلوں کی دیکھ بھال وہ بذاتِ خود کرتے تھے۔ ایک بار کسی مصروفیت کی وجہ سے وہ گاؤں نہیں جاسکے اس لیے مجھ سے کہا کہ بیٹے تم دیکھ رہے ہو کہ اپنی مصروفیت کے سبب سے میں کھیت پر نہیں جاسکتا۔ آج میری جگہ تم وہاں چلے جاؤ اور اس کی نگرانی کرو۔ والد صاحب کی ہدایت کے مطابق کھیت پر جانے کے ارادے سے گھر سے نکلا۔ راستے میں میرا گزر عیسائیوں کے ایک بگر جا کی طرف سے ہوا۔ اس وقت گر جا میں نماز ہو رہی تھی۔ ان کی آواز کانوں میں پڑی تو میری توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی۔ چونکہ میرے والد نے گھر سے نکلنے اور لوگوں کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے پر پابندی لگا دی تھی اس لیے میں نصاریٰ اور دیگر اہل مذاہب کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے ان کی آواز سنی تو یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، گر جا میں داخل ہو گیا۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو ان کی عبادت اور نماز کا یہ انداز مجھے بہت پسند آیا اور میرے اندر ان کے مذہب سے رغبت پیدا ہو گئی۔ میں نے دل میں کہا بخدا ان کا مذہب ہمارے مذہب سے بہتر ہے۔ پھر میں غروب آفتاب تک ان کے ساتھ رہا۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس دین کی اصل کہاں ہے؟ انھوں نے بتایا کہ اس کی اصل شام میں ہے۔ جب رات کو گھر واپس آیا تو میرے والد مجھ سے ملے اور انھوں نے میری کارگزاریوں کی روداد پوچھی۔ میں نے

کہا کہ ابا جان! میرا گزر کچھ لوگوں کی طرف ہوا جو کنیسہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ مجھے ان کا طریقہ عبادت بہت پسند آیا اور میں غروب آفتاب تک ان کی صحبت میں رکا رہا۔ میرے اس عمل سے والد صاحب بہت گھبرائے اور انھوں نے کہا کہ بیٹے! اس دین میں کوئی خیر نہیں ہے۔ تمہارا اور تمہارے آبا و اجداد کا دین اس سے بہتر ہے۔ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم! ان کا دین ہمارے دین سے اچھا ہے۔ میری بات سن کر والد صاحب کو اس بات کا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں میں اپنے دین سے پھر نہ جاؤں۔ چنانچہ انھوں نے مجھے گھر میں قید کر کے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔

موقع پاکر میں نے نصاریٰ کے یہاں پیغام بھیجا کہ اگر شام جانے والا کوئی قافلہ تمہارے پاس پہنچے تو مجھے آگاہ کرنا۔ خوش قسمتی سے چند ہی روز کے بعد شام جانے والا ایک قافلہ ان کے پاس پہنچ گیا اور انھوں نے مجھے اس کی اطلاع کر دی۔ میں نے کوشش کر کے اپنے آپ کو بیڑیوں سے آزاد کیا اور چپکے سے ان کے ساتھ شام پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دریافت کیا کہ دین مسیحیت کا سب سے افضل آدمی کون ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ پادری جو گر جا کا متولی و منتظم ہے، اس وقت کا سب سے افضل اور بہتر نصرانی ہے چنانچہ میں نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

”میں نصرانیت کی طرف مائل ہوں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس رہوں، آپ کی خدمت کروں۔ آپ سے اس کی تعلیم حاصل کروں اور آپ کے ساتھ نماز پڑھوں۔ اس نے میری درخواست قبول کر لی۔ اور مجھے اپنے ساتھ قیام کی اجازت دے دی۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ گر جا میں رہنے اور اس کی خدمت کرنے لگا لیکن چند ہی روز رہنے کے بعد مجھے معلوم

ہو گیا کہ اپنے اخلاق و عادات اور اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ اپنے متبعین کو صدقہ و خیرات کا حکم دیتا اور ثواب کی خوشخبری سناتا۔ جب حد کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے لوگ اسے مال دیتے تو وہ سب کچھ اپنے لیے جمع کر لیتا، فقراء و مساکین کو اس میں سے کچھ نہ دیتا۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے اس کے پاس کافی دولت جمع ہو گئی اور اس کے یہاں سونے سے بھرے ہوئے سات گھڑے اکٹھا ہو گئے اس کا یہ رویہ دیکھ کر مجھے اس سے شدید نفرت ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد جب اس کا انتقال ہو گیا اور نصرانی اس کی تجہیز و تکفین کے لیے جمع ہوئے تو میں نے ان کو بتایا کہ یہ بہت بُرا شخص تھا، تم لوگوں کو صدقہ و خیرات کا حکم دیتا مگر تمہاری دی ہوئی پوری کی پوری رقم اپنی ذات کے لیے جمع کر لیتا تھا اس میں سے محتاجوں اور ضرورت مندوں کو ایک جہہ نہیں دیتا تھا۔ انہوں نے کہا تم کو کیسے معلوم؟ میں نے کہا میں تم کو اس کا خزانہ دکھاتا ہوں اور میں نے وہ جگہ دکھادی۔ انہوں نے وہاں سے سات گھڑے نکالے جو سونے چاندی سے پر تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے کہا:

”بخدا ہم اس کو ہرگز دفن نہیں کریں گے“

پھر انہوں نے اس کی لاش کو صلیب پر لٹکا کر اس پر پتھروں کی بارش

کر دی۔

اس کے چند روز بعد انہوں نے اس جگہ ایک دوسرے شخص کو مقرر کر دیا اور میں اس کی صحبت میں رہنے لگا۔ میں نے دنیا میں کسی ایسے

شخص کو نہیں دیکھا جو اس سے زیادہ دنیا سے بے نیاز، آخرت کا مشاق اور عبادت کا پابند ہو۔ میں اس سے غیر معمولی محبت کرنے لگا اور ایک مدت تک اس کی صحبت سے مستفید ہوتا رہا۔ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو میں نے اس سے عرض کیا۔

”محترم! میرے لیے آپ کی کیا وصیت ہے؟ آپ مجھے اپنے بعد کس کی صحبت اختیار کرنے کی نصیحت فرما رہے ہیں؟“

”بیٹے! اپنے علم کی حد تک میں صرف ایک شخص کو جانتا ہوں جو اس دین پر قائم ہے جس پر میں تھا۔ وہ فلاں شخص ہے جو موصل میں رہتا ہے۔ اس نے صحیح دین میں کوئی تحریف نہیں کی ہے۔ حق اب صرف اسی کے پاس ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

جب میرے مرشد کا انتقال ہو گیا تو میں موصل پہنچا اور اس شخص کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کو اپنی پوری سرگزشت سے آگاہ کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ فلاں بزرگ نے اپنی موت کے وقت مجھے آپ کی صحبت اختیار کرنے کی وصیت کی تھی۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ اب صرف آپ ہی اس دین پر قائم ہیں جس پر وہ خود تھے۔ میری بات سن کر انھوں نے مجھے اپنے پاس ٹھہرنے کی اجازت دے دی اور میں وہاں رہنے لگا۔ میں نے ان کو بہترین حالت پر پایا لیکن بد قسمتی سے میں زیادہ دنوں تک ان کی صحبت سے استفادہ نہ کر سکا۔ ان کی موت کا پروانہ بہت جلد آ گیا، جب ان کے انتقال کی گھڑی قریب آگئی تو میں نے عرض کیا۔

”محترم! آپ کا وقت موعود آ گیا ہے اور آپ میرے مسئلے سے بخوبی واقف ہیں۔ اب آپ کی طرف سے میرے لیے کیا وصیت ہے؟ مجھے کس کے

پاس جانے کی ہدایت فرماتے ہیں؟“ میری بات سن کر انہوں نے فرمایا:
 ”بیٹے! سجدہ مجھے نہیں معلوم کہ ”نصیبین“ کے فلاں شخص کے سوا
 کوئی دوسرا آدمی اس دین پر باقی ہے جس پر ہم لوگ ہیں۔ بس تم وہیں جاؤ
 اور اسی کی صحبت اختیار کرو۔“

اس بزرگ کی تجہیز و تکفین کے بعد میں نصیبین والے بزرگ کی خدمت
 میں حاضر ہوا اور انہیں اپنے حالات اور اپنے مرشد کی ہدایت سے آگاہ
 کیا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر رضامندی ظاہر کی اور میں ان کے
 پاس مقیم ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اسی حق پر قائم ہیں جس پر پہلے دونوں
 بزرگ تھے لیکن مجھے ان کی صحبت میں رہتے ہوئے زیادہ عرضہ نہیں گزرا
 تھا کہ ان کا وقت بھی پورا ہو گیا جب ان کی موت کا وقت قریب آ گیا تو
 میں نے ان سے کہا۔

”آپ کو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ آپ جانتے ہیں
 کہ میرا مقصد کیا ہے جس کے لیے میں درد کی خاک چھاتا پھر رہا ہوں۔
 اب اپنے بعد آپ مجھے کس کے پاس جانے کی ہدایت فرما رہے ہیں؟“
 انہوں نے جواب دیا کہ :

”بیٹے! میری معلومات کی حد تک اب روتے زمین پر صرف ایک
 شخص رہ گیا ہے جو اس دین حق پر قائم ہے۔ وہ فلاں شخص ہے جو
 ”عموریہ“ میں رہتا ہے میرے بعد تم اسی کے پاس چلے جانا۔“
 میں ان کی ہدایت کے مطابق ”عموریہ“ پہنچا۔ تمام حالات و واقعات
 سے انہیں باخبر کیا اور بزرگ کی وصیت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی
 خدمت میں قیام کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے اجازت دے دی

اور میں ان کے ساتھ رہنے لگا۔ بخدا وہ مذکورہ بزرگوں کے طریقے پر قائم تھے۔ میں ان کی صحبت سے مستفیض ہونے لگا۔ ان کے یہاں رہتے ہوئے میں نے کچھ گائیں اور بکریاں پال لیں۔ جب ان کی موت کا وقت آیا پہنچا تو میں نے ان سے کہا:

”آپ میرے معاملے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میرے بارے میں کس کو دھیئت کر رہے ہیں اور مجھے کیا حکم دے رہے ہیں؟“

انھوں نے جواب دیا کہ:

”بیٹے! بخدا میرے علم کی حد تک رومے زمین پر اب ایسا کوئی شخص نہیں بچا ہے جو اس دین پر قائم ہو جس پر ہم تھے۔ لیکن وہ وقت قریب آ گیا ہے جب سرزمین عرب میں ایک نبی دین ابراہیمی کے ساتھ مبعوث ہوگا پھر وہ اپنے وطن سے کھجوروں والی زمین کی طرف ہجرت کرے گا جو حرّین کے درمیان واقع ہے۔ اس کی چند واضح نشانیاں ہیں۔ وہ ہدیہ قبول کرے گا، صدقہ نہیں کھائے گا اور اس کے دونوں کندھوں کے درمیان ہر نبوت ہوگی۔ اگر ہو سکے تو تم اسی علاقے میں چلے جاؤ۔“

ان کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک میں عموریہ میں مقیم رہا، ایک دن ادھر سے کچھ عرب تاجروں کا گزر ہوا جو قبیلہ بنی کلب سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر تم لوگ مجھے اپنے ساتھ عرب لیتے چلو تو میں تمہیں اپنی ساری گائیں اور بکریاں دے دوں گا۔ وہ تیار ہو گئے اور میں نے اپنے جانور ان کے حوالے کر دیے۔ جب قافلہ مدینہ اور شام

لے گیا کنکریوں والی سرزمین

کے درمیان واقع ایک مقام ”وادی القریٰ“ پر پہنچا تو انہوں نے میرے ساتھ غذاری کی اور مجھے غلام بنا کر ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اب میں ایک غلام کی حیثیت سے اس کی خدمت کرنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد بنو قریظہ کا ایک یہودی اس کے یہاں آیا اور مجھے خرید کر اپنے ساتھ ”یثرب“ لے گیا۔ میں نے وہاں کھجوروں کے پیڑ دیکھے جن کا ذکر عموریہ والے بزرگ نے کیا تھا۔ اس کی بیان کردہ علامتوں کی مدد سے میں نے مدینہ کو پہچان لیا۔ اب میں اپنے نئے یہودی آقا کے ساتھ مدینہ میں رہنے لگا۔

اس وقت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ ہی میں تھے اور اپنی قوم میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اس دوران اپنی غلامی کی مصروفیات اور عدیم الفرستی کے سبب ان کے متعلق کچھ معلومات نہیں حاصل کر سکا۔ پھر آپ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آگئے۔ ایک روز میں اپنے آقا کے باغ میں ایک کھجور پر چڑھا ہوا کچھ کام کر رہا تھا۔ میرا آقا اسی درخت کے نیچے بیٹھا تھا اتنے میں اس کے قبیلے کا کوئی شخص آیا اور کہنے لگا:

”اللہ تعالیٰ بنو قریظہ کو ہلاک کرے۔ وہ سب قبا میں ایک شخص کے گرد جمع ہیں جو آج ہی مکہ سے ان کے یہاں پہنچا ہے اور خود کو نبی بتا رہا ہے۔“ یہ سننے ہی میرے اوپر بخار کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور میرا پورا جسم کانپنے لگا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے آقا کے اوپر گر پڑوں گا۔ میں جلدی جلدی درخت سے اُترا اور اس آدمی سے پوچھنے لگا:

لے اوس و خورج کے قبیلے۔

”ابھی تم کیا کہہ رہے تھے ذرا وہ بات مجھے دوبارہ بتاؤ۔“
 اس پر میرا آقا غضب ناک ہو گیا اور اس نے مجھے ایک گھونسہ مار کر کہا:
 ”تمہیں اس سے کیا مطلب۔ چلو، جا کر اپنا کام کرو!“
 شام کو کچھ کھجوریں ساتھ لے کر جو میں نے جمع کر رکھی تھیں، رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا اور ان کی خدمت میں پیش
 کرتے ہوئے عرض کیا:

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں اور آپ کے کچھ
 غریب الوطن اور ضرورت مند ساتھی ہیں۔ یہ صدقے کی تھوڑی سی کھجوریں ہیں۔
 میرے خیال میں آپ لوگ اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔“
 آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کھاؤ، مگر خود اس میں سے کچھ نہیں
 کھایا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا: ”یہ پہلی علامت ہے۔“
 اس کے بعد میں واپس چلا آیا اور پھر کھجوریں پس انداز کرتا رہا اور جب
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبا سے مدینے آئے تو میں نے دوبارہ حاضر خدمت
 ہو کر عرض کیا:

”اس روز میں نے دیکھا کہ آپ نے صدقے کی کھجوریں نہیں کھائیں اس
 لیے آج یہ تھوڑی سی کھجوریں ہدیہ خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔“
 آپ نے ان کھجوروں میں سے خود بھی کھایا اور اپنے ساتھیوں کو بھی
 شریک کیا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا: ”یہ دوسری نشانی ہے۔“
 تیسری بار جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ بقیع میں تشریف
 فرماتے۔ وہاں آپ اپنے کسی صحابی کی تدفین میں شریک تھے۔ میں نے آپ
 کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس وقت آپ کے جسم پر دو چادریں تھیں۔ میں نے

قریب پہنچ کر سلام کیا اور گھوم کر پشت کی جانب آگیا کہ شاید میں وہ خاتم نبوت دیکھ سکوں جن کو مجھ پر یہ میں میرے مرشد نے بتایا تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی پشت مبارک کی طرف نظر اٹھائے ہوئے دیکھا تو میرا مقصد سمجھ گئے اور پشت پر سے چادر سرکادی۔ میں نے خاتم نبوت کو دیکھا، اسے پہچانا اور جھک کر اُسے بے ساختہ چومنے لگا۔ اس وقت میری آنکھوں سے مسرت کے آنسو جاری تھے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ”کیا بات ہے؟“

اور میں نے اپنی پوری سرگزشت بیان کر دی جس کو سن کر آپ مسرور ہوئے اور اس بات سے خوش ہوئے کہ آپ کے اصحاب نے میری زبان سے میری تلاش حق کی داستان سن لی۔ ان لوگوں نے بھی اس پر انتہائی حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور بے حد مسرور ہوئے۔

سلام ہو سلمان فارسی پر جس روز وہ تلاش حق کی راہ میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، اور سلام ہو ان پر جس روز وہ حق سے آگاہ ہوئے، اور سلام ہو ان پر جس روز وہ مرے اور جس روز زندہ کر کے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔



حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ

اس وقت وہ اپنی عمر کی تیسری دہائی میں تھے جب نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق و ہدایت کی دعوت کا برملا اظہار کیا تھا۔ وہ حسب و نسب کے اعتبار سے قریش کے معزز ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور دولت و ثروت کے لحاظ سے ان میں سب سے فائق تھے اگر ان کا باپ اڑھے نہ آتا تو وہ اس لائق تھے کہ اپنے ہم عمروں، سعد بن ابی وقاص اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما کی طرح بہت پہلے مشرف بہ اسلام ہو چکے ہوتے۔

قارئین کرام کو معلوم ہے کہ ان کا باپ کون تھا؟ وہ مکہ کا سب سے سرکش اور جابر شخص، شرک و کفر کا قافلہ سالار اور مسلمانوں کی ابتلا و آزمائش کا سب سے بڑا ذمہ دار تھا جس کی مکاری اور چال بازی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان و یقین کو پرکھا اور وہ اس معیار پر کھرے اترے۔ اس کے متعلق بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ ”ابو جہل“ تھا۔

یہ تو ان کا باپ تھا اور وہ خود عکرمہ ابن ابی جہل مخزومی ہیں۔ عکرمہ کا شمار قریش کے معدودے چند سربراہ اور رہنماؤں اور اس کے نامور شہسواروں میں ہوتا تھا۔

عکرمہ ابن ابی جہل نے خود کو اس حال میں پایا کہ وہ اپنے باپ کی مرضی کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ اس نے ان

کے ساتھ سخت عداوت کا رویہ اختیار کیا۔ ان کے ساتھیوں کو دردناک سزائیں اور اہل اسلام پر ایسی زہرہ گداز عقوبتیں نازل کیں کہ اس کے باپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔

جب اس کے باپ نے معرکہ بدر میں لشکرِ شرک کی قیادت کی اور لات و عزیٰ کی قسمیں کھا کھا کر اعلان کیا کہ محمدؐ کو شکست دے بغیر وہ مکہ واپس نہیں لوٹے گا۔ اس نے بدر کے مقام پر پڑاؤ ڈال کر وہاں تین دن قیام کیا۔ اس دوران وہ اونٹ ذبح کر کے ان کا گوشت کھاتا اور شراب پیتا رہا۔ اس کی دل بستگی کے لیے دن بجا بجا کر لونڈیاں اسے گانے سناتی رہیں۔ جس وقت ابو جہل اس معرکہ کی قیادت کر رہا تھا اس کا بیٹا اس کا قابلِ اعتماد دست و بازو تھا لیکن لات و عزیٰ بنے بنے اس کی پکار سنی نہ اس کی مدد کو آئے کیونکہ وہ سننے سے منذور اور مدد کرنے سے عاجز تھے۔ تو وہ ذلت کی موت مارا گیا اور اس کے بیٹے نے دیکھا کہ مسلمانوں کے پیارے نیرے اس کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اس نے اپنے کانوں سے اس کے حلق سے نکلنے والی آخری چیخ سنی تھی۔

عکرمہ بدر کے میدان میں قریش کے اس عظیم سردار کی لاش چھوڑ کر مکہ لوٹ آیا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد اس کے لیے یہ ممکن ہی نہ رہا کہ وہ اپنے باپ کی لاش اٹھا کر لاتا اور اسے مکہ میں دفن کرتا۔ راہِ نوار اختیار کرتے ہوئے وہ بادلِ نخواستہ اسے مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا اور مسلمانوں نے دوسرے مقتولین کے ساتھ اسے بھی بدر کے کنویں میں پھینک کر اس پر ریت ڈال دیا اور اسی روز سے اسلام کے ساتھ عکرمہ کے روئے نے دوسری صورت اختیار کر لی۔ پہلے تو وہ اپنے باپ

کی حمایت میں اسلام کا مخالف تھا مگر آج سے اس کے انتقام کے لیے اس سے
برسر پیکار ہو گیا اور یہیں سے عکرمہ اور اس کے دوسرے ہم نغیاں مشرکین قریش جن
کے آبار جنگ بدر میں مارے گئے تھے اور وہ ان کے انتقام کی آگ میں جل رہے تھے
اہل مکہ کے سینوں میں محمد کے خلاف عداوت کی آگ اور انتقام کے شعلے بھڑکانے
میں لگ گئے جس کے نتیجے میں احد کا خونریز معرکہ پیش آیا۔

جنگ بدر میں اپنی شکست کا بدلہ اور اپنے مقتولین کا انتقام لینے کے لیے قریش
کا جو لشکر جرار مکہ سے روانہ ہوا، عکرمہ اس میں شریک ہو گیا۔ اس نے اپنی بیوی
ام حکیم کو بھی ساتھ لیا تاکہ وہ ان عورتوں کے ساتھ شامل ہو کر صفوں کے پیچھے
کھڑی ہو جائے اور جب جانبازان قریش میں شکست کے آثار نظر آئیں تو وہ
دف بجا بجا کر انھیں قتالی پر برا بیگنہ کریں اور ان کو میدان جنگ میں ثابت قدم
رکھنے کی کوشش کریں۔

قریش نے اپنی فوج کے گھڑسوار دستے کی قیادت کے لیے اس کے میمنہ
پر خالد بن ولید اور یسرہ پر عکرمہ بن ابی جہل کو متعین کیا۔ اس روزان دونوں مشرک
سالاروں نے جرأت و شجاعت اور مردانگی و جوانمردی کے ایسے جوہر دکھائے کہ
قریش کا پد محمد اور ان کے اصحاب پر بھاری ہو گیا اور اس کے نتیجے میں وہ فتح و
کامرانی سے ہمکنار ہوئے جس پر الوسفیان فرط مسرت سے چیخ اٹھا تھا ”یہ جنگ
بدر کا بدلہ ہے۔“

غزوہ خندق کے موقع پر مشرکین نے مدینہ کا محاصرہ کر رکھا تھا جب محاصرے
نے کافی طول کھینچا تو عکرمہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ محاصرے کی
طوالت سے بدول ہو گیا۔ آخر اس نے خندق کے ایک تنگ حصے کو تار کا اور اپنا
گھوڑا گدا کر اس پار جا پہنچا۔ کچھ جری سواروں نے اس کی اقتدار کی اور وہ بھی

اس کے پیچھے خندق عبور کر کے دوسری جانب پہنچ گئے۔ ان میں سے عمرو بن عبدو
عامری مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا لیکن عکرمہ نے راہ فرار اختیار کی اور وہ اپنی
جان بچالے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

اور فتح مکہ کے موقع پر جب قریش نے دیکھا کہ محمدؐ اور ان کے اصحاب
کے سامنے ان کو تاب مقاومت نہیں ہے تو انہوں نے طے کیا کہ ان کے
راستے سے ہٹ جائیں۔ یہ فیصلہ انہوں نے اس لیے کیا کہ ان کو یہ بات

معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج کے سالاروں کو یہ حکم
دے رکھا ہے کہ وہ مکہ کے عام باشندوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں۔ وہ

صرف اپنی لوگوں سے جنگ کریں جو ان سے لڑیں۔ لیکن عکرمہ اور اس کے کچھ
ہم خیال ساتھی قریش کے اس فیصلے کے علی الرغم جنگ کا ارادہ لیے مکہ سے
بہکل پڑے اور مسلمانوں کے شکر جزار کے سامنے جا ڈٹے۔ لیکن حضرت خالد

بن ولید نے ایک معمولی جھڑپ کے بعد انہیں شکست دے کر بھاگنے پر مجبور

کر دیا۔ اس جھڑپ میں ان کے چند آدمی مارے گئے اور باقی میدان چھوڑ

کر بھاگ نکلے۔ مفزورین میں عکرمہ ابن ابی جہل بھی تھا۔ اس وقت وہ

سخت جہانی و سراسیمگی سے دوچار تھا۔ اہل مکہ کے مسلمانوں کے سامنے سرنگوں

ہو جانے کے بعد اس کے لیے وہاں کوئی جائے پناہ نہیں رہ گئی تھی۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ان تمام جرائم کو معاف کر دیا تھا جو انہوں نے

آپ کے مقابلے میں کیے تھے۔ البتہ اس عام مغافی سے چند مجرموں کو مستثنیٰ

قرار دیا گیا اور نام لے لے کر حکم دیا گیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے خواہ وہ غلاب

کعبہ میں چھپے ہوئے ہی کیوں نہ کیوں۔ ان لوگوں میں عکرمہ ابن ابی جہل کا نام

سرفہرست تھا اس لیے اپنی جان کے خوف سے وہ چھپ کر مکہ سے نکلنا اور

یمن کی طرف چل پڑا کیونکہ اس کے علاوہ اسے کسی دوسری جگہ پناہ ملنے کی امید نہ تھی۔

عکرمہ کی بیوی امّ حکیم اور ہند بنت بنتہ دس دوسری عورتوں کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے کے ارادے سے آپ کی قیام گاہ پر پہنچیں۔ اس وقت دو ازواج مطہرات، آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراء اور خاندان عبدالمطلب کی چند خواتین آپ کے پاس موجود تھیں۔ اس موقع پر ہند نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے پسندیدہ دین کو غائب کر دیا۔ میں آپ کے ساتھ اپنی سببی اور خاندانی قرابت کا واسطہ دے کر آپ سے خیر اور حسن سلوک کی خواستگار ہوں۔ میں آپ کی تصدیق کرنے والی ایک مسلمان عورت ہوں“ پھر اس نے اپنے چہرے سے نقاب سرکاتے ہوئے کہا: ”اللہ کے رسول! میں عتبہ کی بیٹی ہند ہوں“ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا:

”میں تمہیں مرجبا کہتا ہوں اور تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں“

اس نے پھر کہا:

”بخدا اے اللہ کے رسول! آج سے پہلے روتے زمین پر کوئی ایسا گھر نہ تھا جس کی ذلت و رسوائی مجھے آپ کے گھر کی ذلت و رسوائی سے زیادہ پسند ہو۔ مگر اب یہ حال ہے کہ دنیا کا کوئی گھر میرے نزدیک آپ کے گھر سے زیادہ معزز نہیں ہے۔“

اس کے بعد عکرمہ کی بیوی امّ جمیل کھڑی ہوئی۔ اس نے پہلے تو اپنے کا اظہار کیا پھر یوں گویا ہوئی:

”اے اللہ کے رسول! عکرمہ اس خوف سے بھاگ گئے ہیں کہ آپ انھیں قتل کر دیں گے۔ اللہ کے رسول! آپ انھیں امان بخش دیں اللہ آپ کو امان دے گا۔“

آپ نے اس کی درخواست سن کر ارشاد فرمایا: ”عکرمہ ابن ابی جہل کو امان دی جاتی ہے۔“

شوہر کی جاں بخشی کا اعلان سن کر ام حکیمؓ اسی وقت اپنے رومی غلام کو ساتھ لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑیں۔ جب وہ چلتے چلتے دُور نکل گئے تو دوران سفر غلام کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے ان کے اوپر دُور سے ڈالنا شروع کر دیے۔ وہ اسے اُمید دلاتی اور مالتی ہوتی عرب کے ایک قبیلہ میں پہنچ گئیں۔ وہاں پہنچ کر اہل قبیلہ سے مدد کی طالب ہوئیں اور اہل قبیلہ نے غلام کو اپنے پاس قید کر دیا اور ام حکیمؓ نے تن تنہا اپنا سفر جاری رکھا اور آخر کار تہامہ کے علاقے میں سمندر کے کنارے عکرمہ کو پا گئیں اس وقت وہ ایک مسلمان ملاح سے گفتگو کر رہا تھا کہ وہ اسے اس پار پہنچا دے۔ مگر ملاح اس بات پر مصر تھا کہ پہلے تم اخلاص کا اظہار کرو تب میں تم کو اس پار لے جاؤں گا۔ عکرمہ نے پوچھا کہ میں اخلاص کا اظہار کس طرح کروں؟ تو اس نے کہا کہ کہو ”اشہدہ ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدًا رسول اللہ۔“

عکرمہ نے جواب دیا کہ ”اسی سے بھاگ کر تو میں یہاں آیا ہوں۔۔۔۔۔“

ابھی ان دونوں کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ ام حکیم عکرمہ کے پاس پہنچ گئیں۔ اور اس سے بولیں:

”میرے ابن عم! میں تمہارے پاس سب سے افضل، سب سے نیک اور سب سے اچھے انسان کی طرف سے آئی ہوں۔ میں تمہارے پاس محمد بن

عبداللہ کی طرف سے آئی ہوں میں نے ان سے تمہاری جاں بخشی کا وعدہ لے لیا ہے۔ تم اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“

عکرمہ نے پوچھا کہ ”کیا تم نے خود ان سے بات کی ہے؟“ انھوں نے جواب دیا ”ہاں! میں نے خود بات کی ہے اور انھوں نے تم کو امان دی ہے۔“ وہ برابر سے اس کی جاں بخشی کا یقین دلاتی رہیں یہاں تک کہ وہ مطمئن اور ان کے ساتھ واپسی پر رضا مند ہو گیا۔ دورانِ راہ انھوں نے غلام کی اس نجابتِ نفس کا ذکر کیا جو اس نے سفر کے دوران کی تھی۔ اور عکرمہ نے مسلمان ہونے سے پہلے وہاں پہنچ کر اسے قتل کر دیا۔

اثنا تے سفر میں جب وہ دونوں ایک منزل پر رُکے تو عکرمہ نے بیوی سے خلوت کی خواہش ظاہر کی لیکن انھوں نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا:

”میں ایک مسلمان عورت ہوں اور تم ابھی مشرک ہو۔“

عکرمہ نے اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

”وہ بات جو تمہیں میرے ساتھ خلوت سے روک دے، یقیناً کوئی نہایت ہی بڑی بات ہوگی۔“

جب عکرمہ مکہ کے قریب پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا:

عکرمہ ابن ابی جہل بہت جلد ایک مومن و مہاجر کی حیثیت سے تمہارے پاس پہنچنے والا ہے اس کے باپ کو بُرا مت کہنا، مرنے کو بُرا کہنے سے زندہ کو اذیت پہنچتی ہے اور میت کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

”سیأتیکم عکرمۃ بن ابی جہل مؤمناً مہاجراً فلا تسبوا اباءہ فان سب المیت یؤذی الحی ولا یبلغ المیت۔“

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد عکرمہ اپنی بیوی ام حکیمہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پہنچ گیا۔ آپ اُسے دیکھتے ہی فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور چادر کے بغیر ہی اس کے استقبال کے لیے لپکے۔ پھر جب آپ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے تو عکرمہ نے کھڑے کھڑے عرض کیا۔

”محمد! ام حکیم نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے“

حضور نے جواب دیا ”اس نے صحیح کہا ہے۔ تم مامون ہو۔“

اس نے دوبارہ سوال کیا۔ ”اے محمد! آپ مجھے کس بات کی دعوت

دیتے ہیں؟“

”میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ تم گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا لائق عبادت و پرستش نہیں ہے اور اس بات کی کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں اور اس بات کی کہ تم زکوٰۃ دو“ آپ نے ارکانِ اسلام گناتے ہوئے فرمایا۔

”بخدا آپ نے حق کی دعوت دی اور حیر کا حکم دیا۔ . . . بخدا آپ اس دعوت کے پہلے بھی ہم میں سب سے سچے اور نیکو کار تھے۔“ یہ کہہ کر اس نے بیعت کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور کلمہ شہادت پڑھ کر دائرۃ اسلام میں داخل ہو گیا۔

اسلام لانے کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی: ”اللہ کے رسول! مجھے سب سے اچھی چیز بتا دیجئے تاکہ میں اسے برابر پڑھا کروں۔“

”اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدان محمدًا عبدہ ورسولہ“

پڑھا کرو“ آپ نے جواب دیا۔

بولے: ”اس کے بعد کیا؟“

فرمایا: ”یہ کہو کہ میں خدا سے تعالیٰ اور حاضرین کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں مسلم ہوں، مجاہد ہوں اور ہاجر ہوں“ اور عکرمہؓ نے اس کو کہہ دیا۔ اُس وقت آپ نے ان سے فرمایا کہ ”آج تم جو چیز بھی مجھ سے مانگو گے وہ تمہیں عطا کروں گا۔“

”میں چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ جتنی عداوت کی، جہاں کہیں بھی آپ کے مد مقابل ہوا اور آپ کے خلاف جو بات بھی، خواہ آپ کے روبرو یا پس پشت کہی ہو ان سب سے میرے لیے مغفرت کی دُعا فرمائیں“ عکرمہؓ نے زبانِ سوال کھولی۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا کی:

”اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ كُلَّ عِدَاوَةٍ
عَادَا فِيهَا دُكُلٌ مِّسِيرٌ سَارَفِيهِ
اِلَى مَوْضِعٍ يَرِيدُ بِهِ اَطْفَاءَ نَوْرِكَ
وَاغْفِرْ لَهُ مَا نَالَ مِنْ عَرَضِي
فِي دَجْحِي اَوْ اَنَا غَائِبٌ
عِنْدَهُ“

خدا یا! ہر اس عداوت سے عکرمہ کی مغفرت
فرما جو اس نے میرے ساتھ کی، اور معاف فرما
دے اس کی ہر اُس سرگرمی کو جس کے ذریعہ اس
نے تیرے نور کو بھجانے کی کوشش کی، اور
درگزر فرما اس کی ہر اُس حرکت کو جو اس نے
میری آبرو سے کھیلتے ہوئے میرے سامنے
یا میری عدم موجودگی میں کی ہو۔

اس دعا کو سن کر حضرت عکرمہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور انھوں نے کہا:
”اے اللہ کے رسول! خدا کی قسم آج سے پہلے اللہ کی راہ سے بندگانِ
خدا کو باز رکھنے کے لیے جتنا مال میں خرچ کرتا رہا ہوں، اب آج کے بعد سے
خدا کی راہ میں اس سے دوگنا خرچ کروں گا۔ اور آج سے پہلے خدا کے دین سے

روکنے کے لیے جتنی قوت سے لڑتا رہا، آج کے بعد سے اس سے دوگنی طاقت کے ساتھ راہِ خدا میں لڑوں گا۔“

اور اس روز سے مسلمانوں کی جماعت میں ایک ایسے شخص کا اضافہ ہوا جو میدانِ کارزار میں ایک شیر دل شہسوار اور مسجدوں میں ایک عابد شب زندہ دار اور قاری قرآن تھا۔ وہ قرآن کریم کو اپنے چہرے پر رکھ کر خدا کے خوف سے روتے ہوئے بڑے دالہانہ انداز میں کہتے: کتابِ ربّی... کلامِ ربّی... حضرت عکرمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ ان کے قبولِ اسلام کے بعد کفر و اسلام کے مابین جو بھی معرکہ پیش آیا اس میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوئے اور مسلمان جب بھی کسی مہم میں نکلے اس میں آگے آگے رہے۔ معرکہ یرموک میں تو حضرت عکرمہؓ میدانِ قتال کی طرف اس طرح لپکے تھے جیسے کوئی تشنہ لب شدید گرمی میں ٹھنڈے میٹھے پانی کی طرف لپکتا ہے۔ ایک موقع پر جب مسلمانوں پر دشمن کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا، وہ اپنے گھوڑے سے کود پڑے، تلوار کی نیام توڑ کر پھینک دی اور ننگی تلوار لے کر رومیوں کی صفوں میں گھس گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت خالد بن ولید نے فوراً ان کے پاس پہنچ کر کہا:

”عکرمہ! ایسا نہ کیجئے۔ اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالیے۔ آپ کا قتل ہو جانا مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ تلافی سانحہ ہوگا۔“

لیکن حضرت عکرمہؓ نے ان سے کہا: خالد! ہٹ جاؤ۔ میرا راستہ نہ روکو۔ صحبتِ رسولؐ کے استفادہ اور خدمتِ اسلام میں تم کو میرے اوپر سبقت حاصل ہے۔ میں اور میرا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر مخالف تھے اور میں آخری دم تک اس مخالفت پر قائم رہا اس لیے صحبتِ رسولؐ کا شرف میرے

حصے میں بڑی تاخیر سے آیا۔ مجھے چھوڑ دو۔ آج میں گزشتہ کوتاہیوں اور محرومیوں کی تلافی کر لینا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ پھر قدرے توقف کے بعد فرمایا :

”میں بہت سے مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جم کر لڑا۔ کیا آج ان رومیوں کے مقابلے میں راہ فرار اختیار کر لوں؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔“

پھر انھوں نے مسلمانوں کو پکارا ”موت پر کون بیعت کرتا ہے؟“ ان کی پکار پر تقریباً چار سو مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان بیعت کرنے والوں میں ان کے چچا حضرت حارث بن ہشام اور حضرت ضرار بن ازور بھی شامل تھے ان لوگوں نے حضرت خالد بن ولید (قائد لشکر) کے خیمے کے گرد و پیش سخت چھوڑیز جنگ کی اور دشمن کے بڑھتے ہوئے حملوں کا بہترین انداز میں دفاع کیا۔ جب فضائے یرموک پر سے جنگ و قتال کے بادل چھٹے اور مسلمانوں کی عظیم الشان فتح کا آفتاب طلوع ہوا تو یرموک کی زمین پر تین مجاہد زخموں کے چور پڑے ہوئے تھے اور وہ تھے حضرت حارث بن ہشام، حضرت عیاش بن ربیع، اور حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہم ورضواعنہ۔

شدت تشنگی سے بے تاب حضرت حارث نے پانی مانگا جب پانی ان کو پیش کیا جا رہا تھا، حضرت عکرمہ نے ان کی طرف دیکھا حضرت حارث نے پہلے ان کو پانی پلانے کا اشارہ کیا اور جب پانی ان کے پاس لے جایا گیا تو حضرت عیاش نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا حضرت عکرمہ نے اشارہ کیا کہ پہلے ان کی پیاس بجھائی جائے اور جب پانی پلانے والے ان کے قریب گئے تو دیکھا کہ وہ اس سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ جب وہ پلٹ کر پہلے دونوں صحابیوں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ لوگ بھی اب کوثر سے اپنی پیاس بجھا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں سے راضی ہو اور انھیں خوش کوثر سے اس طرح سیراب کرے کہ اس کے بعد انھیں تشنگی نہ محسوس ہو اور انھیں جنت الفردوس کی سرسبزی و شادابی مرحمت فرمائے جس سے وہ ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں۔ آمین

حضرت زید الخیر رضی اللہ عنہ

(ایک صحابی رسول جو ایمان لانے کے بعد کسی ادنیٰ ترین گناہ کے بھی مرتکب نہ ہوئے)

انسان فطری طور پر خیر و شر کا سرچشمہ ہے۔ جو لوگ اپنے دور جاہلیت میں بہتر ہوتے ہیں ان لوگوں میں اسلام لانے کے بعد بھی خیر و صلاح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی کی دو تصویریں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک تصویر جاہلیت کے ہاتھوں نے بنائی ہے۔ اور دوسری اسلام کی انگلیوں کی مرہون منت ہے۔

وہ صحابی حضرت زید الخلیل ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ انھیں اسی نام سے پکارتے تھے۔ اور اسلام لانے کے بعد رسول کریم نے انہیں زید الخیر کے نام سے یاد فرمایا۔

عربی ادب کی کتابوں میں ان کی پہلی تصویر کے نقوش ابھارے گئے ہیں۔ امام شیبانی نے قبیلہ بنو عامر کے ایک بزرگ کا بیان ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

”ایک سال ہمارے علاقے میں زبردست قحط اور خشک سالی نے ایسی قیامت برپا کی کہ کھیت اور باغ سوکھنے اور جانور ہلاک ہونے لگے۔ حالت کی سختی سے تنگ آکر ہمارے قبیلے کا ایک شخص اپنے اہل و عیال

کو لے کر حیرہ چلا گیا۔ اور انھیں وہاں چھوڑ کر ان سے رخصت ہوتے ہوئے

بولا۔

”جب تک میں تمہارے پاس لوٹ کر نہ آ جاؤں تم لوگ یہیں میرا انتظار کرنا۔“ پھر اس نے قسم کھانی کہ میں ان کے پاس آؤں گا تو مال و

دولت کے ساتھ ورنہ اسی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا۔“

پھر اس نے کچھ زادِ راہ اپنے ساتھ لیا اور پیدل ہی چل پڑا۔ وہ دن بھر چلتا رہا۔ رات کے سائے گہرے ہونے لگے تو اس نے دیکھا کہ سامنے ایک خیمہ نصب ہے اور اس کے قریب ہی گھوڑے کا ایک بچھرا بندھا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر اس نے اپنے دل میں کہا۔

”یہ پہلا مال غنیمت ہے جو میرے ہاتھ لگا ہے۔“

پھر وہ بچھرے کے پاس پہنچا اور اس کی رسی کھول لی۔ اور ابھی اس پر سوار ہونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں آواز آئی۔ ”اے چھوڑ دو اور جان کی خیر چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔“

وہ بچھرے کو چھوڑ کر آگے چل پڑا اور سات روز تک چلتا رہا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں اونٹوں کا ایک باڑا تھا۔ باڑے کے قریب ہی بالوں کا ایک بہت بڑا خیمہ اور اس کے اندر چمڑے کا ایک چھوٹا سا گول خیمہ تھا۔ یہ چیزیں اپنے مالک کے صاحب ثروت اور خوش حال ہونے کا پتہ دے رہی تھیں۔ اس نے اپنے جی میں کہا۔ اس باڑے میں رہنے والے اونٹ بھی ہوں گے اور اس خیمے میں رہنے والے اس کے مکین بھی، پھر اس

لے عراق کا ایک شہر جو بخت اور کوفہ کے درمیان واقع ہے۔

نے خیمہ کے اندرونی ماحول پر ایک نظر ڈالی — سورج اب افق مغرب کے
 آخری سرے پر پہنچ کر غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا — تو اس نے خیمے
 کے وسط میں ایک نہایت ضعیف العمر شخص کو دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے جا کر
 بیٹھ گیا۔ مگر بوڑھے کو اس کا بالکل علم نہیں ہوا۔ چند لمحوں کے بعد آفتاب غروب
 ہو گیا۔ اور اسے سامنے سے آتا ہوا ایک سوار نظر آیا جو بے مثل قد و قامت
 اور ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ وہ ایک بلند و بالا گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا اور
 دو غلام اس کی دونوں جانب پیدل چل رہے تھے۔ باڑے میں پہنچ کر
 سب سے پہلے بڑا اونٹ بیٹھا۔ پھر باقی اونٹ بھی اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔
 ”اس اونٹنی کو دوہو“ سوار نے ایک موٹی سی اونٹنی کی طرف اشارہ کرتے
 ہوئے ایک غلام کو حکم دیا۔ ”اور شیخ کو پلاؤ“

غلام نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اونٹنی کو دوہا اور دودھ سے بھرا ہوا برتن
 بوڑھے کے آگے رکھ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ بوڑھے نے اس میں سے ایک
 دو گھونٹ دودھ پی کر برتن نیچے رکھ دیا۔ اس آدمی نے کہا کہ میں آہستہ سے
 اس کی طرف کھسک کر گیا، برتن اٹھایا اور اسے منہ سے لگا کر خالی کر دیا۔ اور
 پھر واپس زمین پر رکھ دیا۔ غلام نے آکر برتن اٹھایا اور باہر چلا گیا۔ اور اپنے
 مالک سے بولا ”آقا! شیخ نے پورا دودھ پی لیا۔“

سوار یہ سن کر بہت خوش ہوا اور دوسری اونٹنی کی طرف اشارہ کرتے
 ہوئے بولا ”اسے بھی دوہو اور شیخ کو پیش کرو۔“

غلام اس کا حکم بجالایا اور دودھ سے بھرا ہوا برتن بوڑھے کے آگے
 رکھ دیا۔ بوڑھے نے اس میں سے صرف ایک گھونٹ پیا اور برتن نیچے رکھ
 دیا۔ میں نے اسے اٹھا کر اس میں سے آدھا دودھ پیا اور باقی دودھ اس

نحیال سے بچا دیا کہ کہیں سوار کے دل میں کوئی شبہ نہ پیدا ہو جائے۔

پھر سوار نے دوسرے غلام کو ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس نے حسب حکم بکری کو ذبح کر دیا۔ تو سوار اٹھ کر اس کے پاس آیا اور بوڑھے کے لیے اس میں سے کچھ گوشت بھونا اور اسے اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ جب وہ آسودہ ہو گیا تو باقی ماندہ گوشت اس نے اور اس کے دونوں غلاموں نے کھایا۔ پھر وہ سب اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند میں ڈوب کر خراٹے لینے لگے۔ اب میں چپکے سے اٹھ کر بڑے اونٹ کے پاس پہنچا۔ اور اس کی رسی کھول کر اس پر سوار ہو گیا۔ اونٹ تیزی سے چل پڑا۔ دوسرے اونٹ بھی اس کے پیچھے لگ گئے۔ میں رات بھر چلتا رہا۔ صبح کا اُجالا پھیلنے لگا تو میں نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مگر کوئی شخص میرا تعاقب کرتا ہوا نظر نہیں آیا۔ میں نے اونٹ کی رفتار اور تیز کر دی اور برابر چلتا رہا حتیٰ کہ سورج کافی بلند ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو دور فاصلے پر کوئی چیز نظر آئی جیسے کوئی گدھ یا کوئی دوسرا بہت بڑا پرندہ ہو۔ وہ چیز مجھ سے قریب ہوتی گئی۔ جب اس کی شکل صاف اور واضح طور پر نظر آنے لگی تو میں نے دیکھا کہ وہ کوئی آدمی ہے جو گھوڑے پر سوار چلا آ رہا ہے۔ وہ برابر میرے نزدیک آتا گیا۔ یہاں تک کہ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی سوار تھا اور اونٹوں کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک آپہنچا تھا۔ اس وقت میں نے اونٹ کو باندھ دیا اور ترکش سے ایک تیز نکال کر کمان پر چڑھا لیا۔ اور اونٹ کو اپنے پیچھے رکھا۔ یہ دیکھ کر سوار کچھ دور فاصلے پر رک گیا۔ اور مجھ

کے بولا۔

”اونٹ کی رسی کھول دو۔“

” ہرگز نہیں۔ میں اس کی رسی ہرگز نہیں کھولوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں اپنے پیچھے حیرہ میں بھوک سے پلکتے ہوئے بچوں اور فاقہ کی سختیاں جھیلنے ہوتے پریشان حال اہل و عیال کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ اور یہ قسم کھائی ہے کہ میں ان کے پاس مال لے کر لوٹوں گا ورنہ اسی کوشش میں مر جاؤں گا۔“ تو سمجھ لو کہ تم مر چکے ہو۔ تمہارا برا ہو۔ اونٹ کی رسی کھول دو۔“ اس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے گرج کر کہا ” ہرگز نہیں کھولوں گا۔“ میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

تب اس نے کچھ نرم ہوتے ہوئے کہا ” تم بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ اور دھوکا کھا رہے ہو۔“ پھر بولا۔ ” اچھا اونٹ کی نیکیں لٹکاؤ۔“ نیکیں میں تین گرہیں تھیں۔ ” اور بتاؤ کون سی گرہ میں تیر ماروں۔“

میں نے بیچ والی گرہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے تیر چھوڑا اور وہ آکر اس کے بیچوں بیچ اٹک گیا۔ جیسے اپنے ہاتھ سے اس میں پھنسا یا ہو۔ پھر اس نے یکے بعد دیگرے دونوں باقی گرہوں کو بھی اپنے تیروں کا نشانہ بنایا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے تیر کو ترکش میں واپس رکھ دیا اور گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میرے قریب آیا اور اس نے میری تلوار اور کمان کو اپنے قبضے میں کرتے ہوئے مجھ سے اپنے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب میں چپ چاپ اس کے پیچھے سوار ہو گیا تو مجھ سے مخاطب ہوا۔ ” تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کروں گا۔“

” بہت برا“ میں نے جواب دیا۔

” یہ کیوں؟“ اس نے دریافت کیا۔

” اس لیے کہ میں نے تمہارے ساتھ غلط طریقہ اپنایا اور تمہیں سخت پریشانی میں مبتلا کیا۔ اور اب اللہ نے تمہیں میرے اوپر قابو دے دیا ہے۔“

میں نے احساسِ ندامت کے ساتھ کہا۔

اس نے کہا ”تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کوئی بُرا سلوک کروں گا جب کہ تم مہلہل کے ساتھ کھانے پینے میں شریک اور رات ان کے ہم نشین رہ چکے ہو؟“

مہلہل کا نام سنا تو میں نے اس سے کہا کہ ”تم زید انجیل ہو؟“

”ہاں میں زید انجیل ہوں“ اس نے جواب دیا۔

”تب تو میں ایک بہترین شخص کا قیدی ہوں۔ امید ہے کہ تم میرے ساتھ عمدہ اور شریفانہ برتاؤ کرو گے۔“

”تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی“ اُس نے کہا اور مجھے لے کر اپنی منزل

کی طرف روانہ ہو گیا۔

”خدا کی قسم اگر یہ اونٹ میرے ہوتے تو انہیں تمہارے حوالے کر دیتا لیکن یہ میری بہن کے ہیں۔ اب تم چند روز میرے پاس ٹھہرو۔ میں عنقریب ایک جگہ حملہ کرنے والا ہوں۔ اس میں مجھے کافی مالِ غنیمت ہاتھ آنے کی توقع ہے“ اس نے منزل پر پہنچ کر مجھے اطمینان دلاتے ہوئے کہا اور تین دن کے بعد ہی اس نے بنی منیر پر حملہ کیا اس حملہ میں تقریباً سو اونٹ اس کے ہاتھ آئے۔ اس نے وہ سارے اونٹ مجھے دے دیے اور میری حفاظت کے لیے اپنے کچھ غلاموں کو میرے ساتھ کر دیا۔ اور میں بخیر و عافیت حیرہ پہنچ گیا۔“

یہ زید انجیل کی ان کے دورِ جاہلیت کی تصویر تھی۔ ان کے زمانہ اسلام کی تصویر کے نقوش کتب سیرت میں اس طرح نمایاں کیے گئے ہیں۔ جب نبی کریمؐ کی بعثت کی خبر زید انجیل کے کانوں میں پہنچی اور وہ ان

کی دعوت سے کسی قدر آگاہ ہوئے تو انھوں نے اپنی سواری کو سفر کے لیے تیار کیا اور اپنے قبیلے کے بڑے بڑے سرداروں کو شرب چلنے اور نبیؐ سے ملاقات کرنے کے لیے بلایا۔ بنی طے کا جو وفد ان کے ساتھ روانہ ہوا اس میں زرا بن سدوس، مالک بن جبیر اور عامر ابن جؤن جیسے اکابر قبیلہ شامل تھے۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو سب سے پہلے مسجد نبوی کا رخ کیا اور اس کے دروازے پر پہنچ کر اپنی اپنی سواریوں سے اتر پڑے۔ اس وقت نبی کریمؐ منبر پر تشریف فرما تھے اور مسلمانوں کو وعظ و نصیحت فرما رہے تھے۔ حضورؐ کا خطاب سن کر اور آپ کے ساتھ صحابہ کرام کی گرویدگی اور ان کی توجہ و اثر پذیری کو دیکھ کر وفد کے لوگ سخت حیران و استعجاب سے دوچار ہوئے۔ رسول اللہؐ نے ان لوگوں کو دیکھا تو مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔

”میں تمہارے لیے عزتی اور تمہارے دوسرے تمام معبودوں سے بہتر ہوں۔“ ”میں تمہارے لیے بہتر ہوں اس سیاہ اونٹ سے جس کی خدا کو چھوڑ کر تم پرستش کرتے ہو۔“

رسول اللہؐ کی یہ بات سن کر زید الخلیل اور ان کے ساتھیوں پر دو مختلف اور الگ الگ قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔ کچھ لوگوں نے حق کی اس دعوت پر بیک کہا اور آگے بڑھ کر اسے قبول کر لیا۔ اور کچھ لوگوں نے اس سے اعراض کیا اور ازراہ تکبر اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

زرا بن سدوس نے مسلمانوں کی نگاہوں میں آپ کے لیے بے پناہ جذبات عقیدت و احترام کا عکس دیکھا تو وہ حسد کی آگ میں جلنے لگا۔

اور اس کا دل خون سے بھر گیا۔ اس نے اپنے ساتھ والوں سے کہا۔

”میری نگاہیں ایک ایسے شخص کو دیکھ رہی ہیں جس کے آگے تمام

عرب کی گردنیں جھک جائیں گی۔ خدا کی قسم میں ہرگز اس کے سامنے
تسلیم و اطاعت خم نہیں کر سکتا۔“

اس کے بعد وہ شام کی طرف نکل گیا اور وہاں اس نے راہبوں کی
طرح اپنا سر منڈا کر نصرانیت اختیار کر لی۔ البتہ زید النخیل اور ان کے دوسرے
ساتھیوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ حضورؐ نے جیسے ہی اپنا خطبہ
ختم کیا۔ زید النخیل مسلمانوں کے مجمع میں کھڑے ہو گئے۔ وہ نہایت شکیل و
وجیبہ، متناسب الاعضار اور طویل القامت شخص تھے۔ جب گھوڑے پر
سوار ہوتے تو ان کے دونوں پاؤں زمین تک پہنچ جاتے۔ ایسا لگتا کہ وہ
گھوڑے پر نہیں کسی گدھے پر سوار ہیں۔ انھوں نے کھڑے ہو کر اُوپچی
اور بلند آواز میں کہا۔

”یا محمد اشهد ان لا اله الا الله وانك رسول الله۔“

رسول اللہؐ نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا ”تم کون ہو؟“

”میں زید النخیل ابن مہلہل ہوں“ انھوں نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

”تم زید النخیل نہیں۔ زید الخیرؓ ہو“ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

”خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو یہاں تک پہنچایا اور تمہارے دل کو

قبولِ اسلام کے لیے نرم کر دیا۔“ اس کے بعد وہ زید الخیرؓ کے نام سے

معروف ہو گئے۔ پھر رسول اللہؐ ان کو اپنے مکان پر لے گئے۔ اس وقت آپ

کے ساتھ حضرت عمرؓ ابن خطاب اور صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی جب

یہ لوگ گھر پہنچے تو رسول اکرمؐ نے زیدؓ کے بیٹھنے کے لیے ایک مسند زمین

پر ڈال دیا۔ حضرت زیدؓ نے آپ کے سامنے اس پر بیٹھنے کو بے ادبی پر محمول

کرتے ہوئے اسے آپ کی طرف واپس کر دیا۔ یہ عمل دونوں جانب سے

تین بار دہرایا گیا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو رسول اللہ نے حضرت زید الخیرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

”زید الخیرؓ! تمہارے علاوہ اس سے پہلے جس کسی کے اوصاف میرے سامنے بیان کیے گئے اور بعد میں میں نے اس کو دیکھا تو اسے اس کے بیان کردہ اوصاف سے کمتر ہی پایا“ پھر فرمایا:

”زید! تمہارے اندر دو ایسی خصلتیں ہیں جو خدا اور اس کے رسول کے نزدیک نہایت پسندیدہ اور محبوب ہیں۔“

”اے اللہ کے رسول! وہ دونوں خصلتیں کون سی ہیں؟“ زیدؓ نے پرشوق لہجے میں سوال کیا۔

”وقار اور حلم“ آپ نے جواب دیا۔

”خدا کا شکر ہے کہ اس نے میرے اندر ایسی خصلتیں پیدا کی ہیں جو اس کو اور اس کے رسول کو پسند ہیں“ زیدؓ نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔ اور خوشی ان کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔ پھر انھوں نے سر اٹھا کر رسول اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اے اللہ کے رسول! آپ مجھے صرف تین سو سواروں کا ایک دستہ دے دیں میں اس بات کی آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ میں ان کو ساتھ لے کر بلا دروم پر حملہ کروں گا اور زبردست فتح و کامرانی حاصل کروں گا۔“ آپ نے ان کی اس بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کو دیکھا تو فرمایا۔

”شاہد باش اے زید! تم کتنے باعزم اور حوصلہ مند ہو۔“

اس گفتگو کے بعد حضرت زید الخیرؓ کے ساتھ جانے والے ان کی قوم کے تمام لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

جب حضرت زید الخیرؓ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے وطن نجد کی طرف واپسی کا ارادہ کیا تو رسول اکرمؐ نے انہیں رخصت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ شخص کتنا عظیم ہے۔ اگر یہ مدینہ کی وبائے محفوظ رہ گیا تو آئندہ زبردست کارنامے انجام دے گا۔“

(اس زمانے میں مدینہ منورہ میں وبائی بخار پھیلا ہوا تھا)

مدینہ منورہ سے روانگی کے قبل ہی حضرت زید الخیرؓ اس وبائی بخار سے متاثر ہو چکے تھے۔ انہوں نے اثنائے سفر میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ قبیلہ بنی قیس کے علاقے سے کتر کے نکل چلو۔ جاہلیت میں ہمارے اور ان کے درمیان زبردست معرکہ آرائیاں اور گھمنان کی جنگیں ہو چکی ہیں۔ اور خدا کی قسم اب میں کسی مسلمان سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔

حضرت زید الخیرؓ شدید بخار کے باوجود مسلسل سفر کرتے رہے۔ ان کا بخار ہر آن بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنے قبیلہ میں پہنچ جائیں اور قبیلہ والے ان کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوں۔ راستے بھران کے اور موت کے درمیان کشمکش جاری رہی۔ آخر کار موت نے اس جوان حوصلہ اور پر عزم انسان کو مغلوب کر لیا۔ انہوں نے راستے ہی میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور ہمدتِ اسلام کی تمام حسین آرزوں کو سینے سے لگائے ہوئے اپنے مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ

ہجرت نبوی کے نویں سال شاہان عرب میں سے ایک شخص اپنی شدید نفرت و بیزاری، پیہم تکبر و اعراض اور مسلسل جود و انکار کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ وہ بادشاہ تھا عدی بن حاتم طائی جس کے باپ کی سخاوت و فیاضی آج تک ضرب المثل ہے۔

ریاست و حکومت عدی کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی چنانچہ اس کے قبیلے قبیلہ بنی طے نے اس کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ ماں غنیمت کا چوتھائی حصہ اس کے لیے مقرر کیا اور قبیلے کی قیادت دسربراہی کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی الاعلان اسلام کی دعوت کا آغاز کیا اور عرب کے بہت سے قبائل ایک ایک کر کے ان کے حلقہ اطاعت میں آتے چلے گئے تو عدی نے محسوس کیا کہ اس دعوت کے پس پردہ ایک ایسی قیادت ابھر رہی ہے جو اس کی قیادت کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے اور اس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس پیغام کے زیر سایہ ایک ایسی ریاست نشوونما پا رہی ہے جو اس کی ریاست کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے گی۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت اور ان کے ساتھ بغض و عداوت پر کمر بستہ ہو گیا حالانکہ نہ تو وہ اس سے پہلے براہ راست رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف تھا نہ آپ کے دیدار سے مشرف ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے تقریباً بیس قیمتی سال اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی نذر کر دیے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے کو قبولیتِ حق کے لیے کھول دیا۔

حضرت عدی بن حاتم کے مسلمان ہونے کی کہانی ایک دلچسپ اور ناقابل فراموش کہانی ہے۔ ہم یہ بات انھیں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس کہانی کو اپنی زبان سے بیان کریں کیونکہ وہی اس کے لیے زیادہ مناسب ہیں اور انہی کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے۔ حضرت عدی اس کہانی کا آغاز کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

”جس وقت میں نے محمدؐ کی نبوت اور ان کی دعوتی سرگرمیوں کا حال سنا اس وقت عرب کے کسی شخص کو مجھ سے زیادہ ان کے ساتھ نفرت نہ تھی۔ میں اپنے قبیلے سے مالِ غنیمت کا چوتھائی وصول کیا کرتا تھا، جس طرح میرے علاوہ دوسرے سردار اپنے اپنے قبائل سے وصول کیا کرتے تھے۔ جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سنا تو مجھے سخت ناگوار گزرا اور جب ان کی قوت و شوکت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا اور ان کے لشکر اور فوجی دستے عرب کے مشرق سے لے کر مغرب تک دھاوا مارنے لگے تو میں نے اپنے غلام کو، جو میرے اونٹ چرایا کرتا تھا، ہدایت کی:

”میرے سفر کے لیے چند تندرست و توانا اور سیدھی سادی اونٹنیاں ہر وقت تیار رکھو اور انھیں میرے قریب باندھ دو اور جب سنو کہ محمدؐ کا لشکر یا ان کا کوئی فوجی دستہ اس علاقے میں داخل ہو گیا ہے تو مجھے اس کی خبر دو۔“

ایک دن صبح کے وقت غلام نے مجھ سے کہا :
 ”آقا! آپ اپنے علاقہ میں محمدؐ کے سواروں کی آمد پر جو کچھ کرنے کا
 ارادہ رکھتے ہیں اب اسے کر گزریے۔“

میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا :
 ”میں نے کچھ جھنڈے اس علاقے میں حرکت کرتے ہوئے دیکھے
 ہیں۔ ان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ محمدؐ کا لشکر ہے۔“
 میں نے اس سے کہا :

”جن اونٹنیوں کو تیار رکھنے کا میں نے تم کو حکم دیا تھا انھیں فوراً میرے
 پاس لے آؤ۔“

پھر میں اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے اہل و عیال کو اپنے پیارے
 وطن کو چھوڑ کر کوچ کرنے کا حکم دے دیا اور تیز رفتاری کے ساتھ سرزمین
 شام کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ اپنے ہم مذہب نصاریٰ کے پاس پہنچ کر
 وہاں قیام کروں۔ میں عجلت میں اپنے گھر کے تمام افراد کو جمع نہ کر سکا۔
 جب خطرے کی حدود سے نکل کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میں اپنی بہن کو
 قبیلہ طے کے باقی ماندہ افراد کے ساتھ اپنے وطن نجد ہی میں چھوڑ آیا ہوں۔
 اب میرے لیے اس کے پاس پلٹ کر جانے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مجھ کو
 اسے چھوڑ کر اپنے ساتھ آئے اہل خانہ کو لیے شام چلا گیا اور وہاں اپنے
 ہم مذہبوں میں قیام پذیر ہو گیا اور میرے پیچھے میری بہن میری توقع کے
 مطابق ان حالات سے دوچار ہوئی جن کا پہلے ہی سے مجھے اندیشہ تھا۔

شام میں مجھ کو اطلاع ملی کہ محمدؐ کے سواروں نے ہمارے علاقے پر
 حملہ کیا۔ میری بہن کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ

یٹرب لے جایا گیا اور مسجد کے دروازے کے قریب ایک احاطے میں بند کر دیا گیا۔ مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر میری بہن کی طرف سے ہوا تو اس نے اٹھ کر ان سے عرض کیا :

”اے اللہ کے رسول! میرے والد فوت ہو چکے ہیں، میرا سر پرست غائب ہے، آپ مجھ پر احسان کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ پر احسان کرے گا۔“
تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا :

”کون ہے تمہارا سر پرست؟“

وہ بولی۔ ”عدی بن حاتم۔“

”کون عدی بن حاتم؟ اللہ اور اس کے رسول سے بھاگنے والا؟“
اتنا کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ دوسرے روز بھی جب آپ کا گزر اس کی طرف سے ہوا تو اس نے دوبارہ وہی باتیں کہیں جو کل کہہ چکی تھی اور آپ نے بھی وہی جواب دیا جو کل دے چکے تھے اور جب تیسرے دن آپ ادھر سے گزرے تو چونکہ وہ مایوس ہو چکی تھی اس لیے خاموش رہی، آپ سے کچھ نہیں کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے ایک شخص نے اسے اشارہ کیا کہ اٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرو۔ چنانچہ اس نے کہا :

”اے اللہ کے رسول! میرا باپ فوت ہو چکا ہے اور میرا سر پرست لاپتہ ہے۔ آپ میرے اوپر احسان فرمائیے، اللہ تعالیٰ آپ پر احسان فرمائے گا۔“ اور آپ نے اس پر احسان فرماتے ہوئے اس کی رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔ رہائی پا کر اس نے کہا کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس شام جانا چاہتی ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ جب تک تمہارے قبیلہ کا کوئی قابل اعتماد آدمی

نہیں مل جاتا روانگی میں جلدی نہ کرنا اور جب کوئی قابلِ اعتماد شخص مل جائے تو مجھے بتانا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد اس نے اس آدمی کے متعلق دریافت کیا جس نے اسے بات کرنے کا اشارہ کیا تھا، تو معلوم ہوا کہ وہ علی بن ابی طالب تھے۔

وہ مدینہ میں ٹھہری رہی۔ اسی دوران کچھ لوگوں کا وفد وہاں آیا جس میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے اوپر وہ اعتماد کر سکتی تھی۔ اس نے بازگاہِ نبوی میں عرض کیا کہ میرے قبیلے کے کچھ لوگ یہاں آئے ہیں، مجھے ان کے اوپر مکمل اعتماد ہے، وہ مجھے میری منزل تک پہنچادیں گے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اے پہننے کے کپڑے، سواری کی اونٹنی اور بقدر ضرورت زادِ راہ دے کر رخصت کیا اور وہ ان کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

عدی نے سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:

ادھر شام میں ہم کو برابر اس کے حالات کی اطلاع ملتی رہتی تھی اور ہم اس کے شام پہنچنے کے منتظر تھے۔ حالانکہ میں نے محمدؐ کے مقابلے میں جو رویہ اپنایا تھا اس کے پیش نظر ہمارے دل ان اطلاعات کی تصدیق کرنے پر آمادہ نہیں تھے جو میری بہن کے ساتھ محمدؐ کے اس احسانِ عظیم کے سلسلے میں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

انہیں حالات میں ایک روز میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک عورت پر پڑی جو اپنے ہودج میں بیٹھی ہماری طرف چلی آ رہی تھی۔ میرے دل نے کہا: ”یہ حاتم کی بیٹی ہے۔ یہ میری بہن ہے!“ جب وہ کچھ اور قریب آئی تو ہم نے اسے صاف طور پر پہچان لیا۔ واقعی

وہ میری بہن ہی تھی۔ وہ ہمارے پاس پہنچ کر سواری سے اترتے ہی خفگی کے لہجے میں بولی:

”بے مروت.... ظالم.... تو نے اپنی بیوی اور بچوں کو تو اپنے ساتھ

لے لیا اور اپنے باپ کی اولاد اور اپنی عزت کو پیچھے چھوڑ کر چلا آیا۔“

میں نے کہا ”پیاری بہن! صرف اچھی باتیں کہو،“ اور میں اسے راضی کرنے لگا۔ آخر کار وہ مجھ سے راضی ہو گئی اور پھر اس نے اپنے سارے حالات

تفصیل سے بیان کیے جو بالکل وہی تھے جو ہم کو پہلے پہنچتے رہے تھے۔ پھر میں

نے اس سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ نہایت دور اندیش، عقلمند اور

سمجھ دار عورت تھی۔ ”اس شخص (محمدؐ) کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟“

اس نے کہا کہ ”میری رائے یہ ہے کہ تم جلد از جلد ان کی خدمت میں پہنچ جاؤ۔

اگر واقعی وہ نبی ہیں تو تمہارے جیسے آدمی کا ان کی تصدیق و تائید میں کیسے رہ

جانا بڑی افسوسناک بات ہوگی اور اگر وہ بادشاہ ہیں تو ان کے یہاں

تمہاری ناقدری نہیں ہوگی۔“

عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ پھر میں نے سفر کی تیاری کی اور رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ پہنچا۔ میں نے اس سے پہلے نہ تو ان کے

پاس اپنے پہنچنے کی اطلاع بھیجی تھی نہ ان سے اپنے لیے امان حاصل کی تھی

البتہ مجھے اس بات کی اطلاع ہو گئی تھی کہ انہوں نے میرے متعلق اپنے

اصحاب سے فرمایا ہے کہ ”مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ عدی بن حاتم کا ہاتھ

میرے ہاتھ سے دے دے گا۔“

جب میں مدینہ پہنچا تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں

تشریف فرما تھے۔ میں نے حاضر خدمت ہو کر آپ کو سلام کیا تو پوچھا:

”کون ہو؟“

”عدی۔ حاتم طائی کا بیٹا“ میں نے جواب دیا۔

یہ سن کر آپ اپنی جگہ سے اٹھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کی طرف لے چلے۔ آپ مجھے ساتھ لیے چلے جا رہے تھے کہ راستے میں انھیں ایک نہایت بوڑھی عورت ملی جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ ان کو روک کر اپنی کسی ضرورت کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ آپ ٹھہر کر پوری توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سنتے رہے۔ دوران گفتگو میں وہیں کھڑا رہا۔ کھڑا کھڑا میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ ”بخدا یہ بادشاہ نہیں ہو سکتے۔“

بڑی بی بی سے فارغ ہو کر آپ نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا اور چلتے ہوئے اپنے گھر پہنچ گئے۔ گھر میں پہنچ کر آپ نے چمڑے کا ایک تکیہ اٹھایا جس میں کھجور کے ریشے بھرے ہوئے تھے۔ آپ نے اس کو میری طرف ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اس پر بیٹھ جاؤ۔ مگر آپ کے سامنے اس پر بیٹھتے ہوئے مجھے شرم آئی اور میں نے اسے بے ادبی پر محمول کرتے ہوئے عرض کیا، نہیں، اس پر آپ شریف رکھیں لیکن آپ نے اصرار کر کے مجھے اس پر بٹھایا اور خود زمین ہی پر بیٹھ گئے کیونکہ گھر میں اس کے علاوہ دوسرا تکیہ نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اس میں کہا ”بخدا یہ انداز کسی بادشاہ کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“ اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد آپ نے مجھے مخاطب کیا:

”عدی! بتاؤ کیا تم رکوسی نہ تھے؟ تم ایک ایسے دین کو اختیار کیے ہو نہ تھے جو نصرت اور صابنیت کے درمیان تھا؟“

”بے شک میں رکوسی تھا اے اللہ کے رسول!“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تم اپنی قوم سے مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ وصول نہیں کرتے

تھے، کیا تم ان سے وہ مال نہیں لیتے تھے جو تمہارے دین میں حلال نہ تھا؟“ آپ نے دوبارہ فرمایا۔

”ہاں، اے اللہ کے رسول! میں ایسا کرتا تھا اور اس وقت مجھے یقین

ہو گیا کہ یہ نبی مرسل ہیں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

”عدی! شاید تم اس دین کو قبول کرنے سے اس لیے ہچکچا رہے ہو کہ آج مسلمان مفلس اور تنگ دست ہیں لیکن خدا کی قسم وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب ان کے یہاں مال و دولت کی اتنی فراوانی ہو جائے گی کہ اسے کوئی لینے والا نہیں ملے گا۔ یا شاید تم اس دین میں داخل ہونا اس لیے ناپسند کرتے ہو کہ آج مسلمانوں کی تعداد کم اور ان کے دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن خدا کی قسم عنقریب تم سنو گے کہ ایک عورت تن تنہا اپنے اونٹ پر سوار ہو کر حج بیت اللہ کے لیے قادیسیہ سے نکلتی ہے اور دوران سفر اسے خدا کے سوا کسی کا خوف نہیں محسوس ہوتا۔ یا شاید اس دین کو قبول کرنا تم کو اس لیے گوارا نہیں ہے کہ تم دیکھ رہے ہو کہ آج زمام حکومت دوسروں کے ہاتھوں میں ہے اور مسلمان اس سے محروم ہیں لیکن خدا کی قسم تم جلد ہی سن لو گے کہ بابل کے سفید محلات مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گئے اور کسریٰ کے خزانے ان کے قبضے میں آ گئے۔“

”کیا؟ کسریٰ ابن ہرمرز کے خزانے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

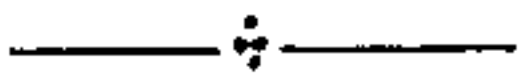
”ہاں، ہاں۔ کسریٰ ابن ہرمرز کے خزانے“ آپ نے پورے وثوق کے

ساتھ فرمایا۔

”اسی وقت کلمہ شہادت پڑھ کر میں دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔“

حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے طویل عمر پائی تھی۔ وہ کہتے ہیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو پیشین گوئیاں تو حروف بہ حروف پوری ہو چکی ہیں صرف ایک باقی رہ گئی ہے اور خدا کی قسم وہ بھی یقیناً پوری ہو کر رہے گی۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ قادسیہ سے اونٹ پر سوار ہو کر نکلی اور بلا خوف و خطر مکہ پہنچ گئی۔ اور میں اس فوج کے اگلے دستے میں تھا جس نے کسریٰ کے خزانوں پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کیا تھا، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تیسری پیشین گوئی بھی ضرور پوری ہوگی۔“

اللہ کی مشیت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پوری ہوئی اور تیسری پیشین گوئی بھی خلیفہ زاہد و عابد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ خلافت میں پوری ہو گئی۔ اس وقت مسلمان مالی اعتبار سے اس قدر خوش حال ہو گئے تھے کہ خلیفہ کا منادی فقرا و مساکین کو زکوٰۃ کا مال لینے کے لیے پکارتا مگر کوئی اس کو لینے والا نہ تھا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات صحیح اور حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ کی قسم پوری ہوئی۔



حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

غفار کا قبیلہ و ددان کی وادی میں آباد تھا جو مکہ کو باہر کی دنیا سے جوڑتی تھی۔ قبیلہ غفار کی گزر بسر کا دار و مدار ان قلیل بخششوں اور عطیات پر تھا جو شام کی طرف آتے جاتے قریش کے تجارتی قافلوں سے انھیں حاصل ہوتی تھیں۔ بارہا ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر یہ قافلے ان کی مرضی کے مطابق انھیں مال نہ دیتے تو یہ انھیں بے دریغ لوٹ لیا کرتے تھے۔

مُحَمَّدُ بْنُ جُنَادَةَ جو عام طور سے اپنی کنیت ابوذر کے ساتھ مشہور ہیں، اسی قبیلے کے ایک فرد تھے مگر وہ اپنی شجاعت و دلیری، حلم و دانشمندی اور دُور اندیشی و بانخ نظری کی بنا پر ان میں سب سے ممتاز تھے۔ وہ اپنے زمانے قبیلہ میں اس لحاظ سے بھی امتیازی خصوصیت کے مالک تھے کہ وہ ان بتوں سے سخت بیزار اور دل برداشتہ تھے جن کو ان کے قبیلے نے خدا کے مقابلے میں اپنا معبود بنا رکھا تھا۔ عرب میں پایا جانے والا دینی بگاڑ اور فرسودہ عقیدہ انھیں سخت ناگوار تھا۔ وہ کسی نئے نبی کے منتظر تھے جو لوگوں کی عقل و ذہن کو مظہر کر دے اور انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ ابوذر کے پاس، جبکہ وہ اپنی بستی میں تھے، مکہ میں ظاہر ہونے والے نئے نبی کی خبریں پہنچیں تو انھوں نے اپنے بھائی اُنیس کو بلا کر کہا:

”پیارے بھائی! تم مکہ چلے جاؤ اور اس شخص کے حالات معلوم کر دو جو

اس بات کا دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور اس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ اس سے اس کی باتیں سنو اور یہ ساری معلومات میرے پاس لاؤ۔“

انیس مکہ پہنچے۔ وہاں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر کے ان کی باتیں سنیں اور اپنے قبیلے میں واپس آگئے۔ ابوذر، جو بڑی بے چینی کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، ان سے ملے اور بڑے اشتیاق سے نئے نبی کے حالات دریافت کیے۔ انیس نے انہیں بتایا:

”بخدا میں ایک ایسے شخص سے ملا جو مکارم اخلاق کی دعوت دیتا ہے اور ایسا کلام سناتا ہے جو شعر و شاعری سے بہت بلند چیز ہے۔“

”لوگ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟“ ابوذر نے پوچھا:

”کہتے ہیں کہ یہ جادوگر ہے، کاہن اور شاعر ہے۔“ انیس نے جواب دیا۔

”واللہ تمہاری باتوں سے میرا اطمینان نہیں ہوا، نہ میری وہ ضرورت پوری ہوئی جس کے لیے میں نے تم کو بھیجا تھا۔ میں خود وہاں جا کر براہ راست اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری غیر موجودگی میں میرے اہل و عیال کی کفالت کی ذمہ داری سنبھال سکتے ہو؟“ ابوذر نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں یہ ذمہ داری بخوشی ادا کروں گا۔ آپ جائیے۔ مکہ

والوں سے محتاط رہیے گا۔“ انیس نے جواب دیا۔

ابوذر نے زاہد راہ کا انتظام کیا۔ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا پانی کا برتن لیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے مکہ کی سمت چل پڑے۔ وہ مکہ پہنچ گئے۔ مگر دل ہی دل میں ڈر رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ قریش

اپنے معبودوں کی حمایت میں سخت غیظ و غضب میں بھرے ہوئے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ہر اس شخص کو سخت اور عبرت ناک سزائیں دیتے ہیں جو محمدؐ کے اتباع کا خیال بھی اپنے دل میں لاتا ہے۔ اس لیے انھوں نے کسی سے ان کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ انھیں معلوم نہیں تھا کہ جس شخص سے وہ پوچھیں گے وہ ان کو ماننے والوں میں سے ہوگا یا مخالفین میں سے۔

رات کو وہ مسجد ہی میں لیٹ گئے۔ اتفاقاً ادھر سے حضرت علیؑ کا گزر ہوا تو ایک غریب الوطن پر دیسی سمجھ کر انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ رات انھوں نے ان کے گھر گزاری اور صبح کو اپنی چھانگل اور سامان کا تھیلا اٹھا کر مسجد میں واپس آگئے۔ اس دوران ان دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ ابوذر نے دوسرا دن بھی اسی طرح گزار لیا اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔ رات کو وہ پھر مسجد ہی میں لیٹ گئے۔ حضرت علیؑ کا ادھر سے گزر ہوا تو انھوں نے ان سے کہا: ”کیا تمہیں ابھی تک اپنی منزل نہیں معلوم ہوئی؟“ وہ پھر ان کو اپنے ساتھ لے گئے اور انھوں نے دوسری رات بھی ان کے یہاں بسر کی۔ آج بھی دونوں خاموش رہے لیکن تیسری رات حضرت علیؑ نے ان سے مکہ آنے کا سبب دریافت کیا تو ابوذر نے کہا:

”اگر وعدہ کرو کہ مجھے میرے مطلوب تک پہنچا دو گے تو میں اپنے آنے کی غرض بتا سکتا ہوں۔“ حضرت علیؑ کے وعدہ کرنے پر انھوں نے کہا:

”میں دور دراز سے قطع مسافت کر کے نئے نئے جگہ سے ملنے اور ان کا پیغام معلوم کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔“ یہ سن کر حضرت علیؑ کا چہرہ خوشی سے

چمک اٹھا اور بولے کہ ”واقعی وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہ اور وہ
 دیکھو، صبح کو میں جدھر جاؤں میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ اگر میں تمہارے
 لیے کوئی خطرہ محسوس کروں گا تو اس طرح کھڑا ہو جاؤں گا جیسے پانی گرا رہا ہو،
 اور جب چلنے لگوں تو میرے پیچھے لگ جانا، اور جہاں جاؤں چلے آنا۔“
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق ویدار اور ان پر نازل شدہ وحی
 کو سننے کی آرزو میں انہوں نے پوری رات آنکھوں میں کانٹا۔ صبح کو حضرت
 علیؓ اپنے مہمان کو ساتھ لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی طرف
 مڑے بغیر چلتے رہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے
 تو ابوذر نے کہا:

”السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ!“

”وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةٌ وَبَرَكَاتٌ.“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 ان کے سلام کا جواب دیا۔

اس طرح ابوذر پہلے شخص تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کو اسلامی طریقے سے سلام کیا اور بعد میں سلام و تحیۃ کا یہی طریقہ مسلم
 معاشرہ میں عام ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے
 اسلام کی دعوت رکھی اور قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا اور انہوں نے
 کسی پس و پیش کے بغیر کلمہ حق کا اعلان کر دیا اور اپنی جگہ چھوڑنے
 سے پہلے نئے دین میں داخل ہو گئے۔ وہ مسلمان ہونے والے چوتھے یا
 پانچویں شخص تھے۔ قبول حق کی اس سنہری داستان کی بقیہ تفصیل انہی
 سے سنئیے:

”اس کے بعد کچھ دنوں تک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ مکے میں مقیم رہا۔ اس دوران آپ نے مجھے اسلام کی تعلیم دی اور قرآن پڑھنا سکھایا پھر فرمایا: ”مکے میں کسی شخص کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر نہ ہونے دینا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تم کو قتل کر دیں گے“ لیکن میں نے کہا کہ ”جب تک مسجد حرام میں جا کر قریش کے سامنے دعوتِ حق کا برملا اظہار نہ کر لوں، مکہ نہیں چھوڑ سکتا“ اس کے بعد میں مسجد گیا۔ اُس وقت قریش کے لوگ بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان کے درمیان کھڑے ہو کر باآواز بلند کہا:

”قریش کے لوگو! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں“

جول ہی میری آواز ان کے پردہ سماعت سے ٹکرائی وہ سب بُری طرح دہشت زدہ ہو گئے، تیزی سے اپنی جگہوں سے لٹھے اور یہ کہتے ہوئے میرے اوپر پل پڑے:

”مارو اس بے دین کو“ اور مجھے بُری طرح زد و کوب کرنے لگے۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم عباس بن عبدالمطلب کی نظر پڑی۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا اور ان سے بچانے کے لیے میرے اوپر جھک گئے۔ پھر ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا:

”تمہارا بُرا ہو۔ تم قبیلہ غفادہ کے ایک آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو جبکہ تمہارے تجارتی قافلے ان کی طرف سے ہو کر گزرتے ہیں؟“ تب جا کر انھوں نے مجھے چھوڑا۔

جب میرے ہوش و حواس بجا ہوئے تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے میری یہ درگت دیکھ کر فرمایا:

”کیا میں نے تم کو اپنے اسلام کے اعلان سے منع نہیں کیا تھا؟“
 ”یہ میرے دل کی ایک خواہش تھی جو پوری ہو گئی“ میں نے عرض
 کیا۔

پھر آپ نے مجھے حکم دیتے ہوئے فرمایا:
 ”اپنے قبیلے میں جاؤ۔ جو کچھ یہاں دیکھا اور سنا ہے انھیں بتاؤ اور
 ان کو اللہ کی طرف بلاؤ۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے ان کو
 فائدہ پہنچائے اور تمہیں اس کا اجر عنایت فرمائے اور جب سن لینا کہ
 میں غالب آ گیا ہوں تو میرے پاس چلے آنا۔“

جب میں اپنے قبیلے میں واپس آیا تو میرا بھائی انیس مجھ سے ملا
 اور پوچھا کہ آپ نے کیا کیا؟ میں نے اس کو بتایا کہ میں محمدؐ کی تصدیق کر کے
 مسلمان ہو گیا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو قبولِ اسلام کے
 لیے کھول دیا۔ اس نے کہا کہ مجھے آپ کے دین سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔
 میں بھی اس میں داخل ہوتا اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ اس کے بعد ہم
 اپنی ماں کے پاس گئے اور انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے
 کہا کہ تم لوگوں کے دین پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں بھی مسلمان
 ہوتی ہوں۔ اور اسی روز سے اس مسلمان گھرانے نے قبیلہ بنو غفار میں دعوتِ الی
 اللہ کا کام شروع کر دیا۔ ان کی دعوتی جدوجہد کے نتیجے میں بنو غفار کی ایک
 بڑی اکثریت دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئی اور ان کے اندر نماز قائم کی
 گئی۔ البتہ ان کے کچھ افراد نے کہا کہ ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے اور
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئیں گے تو اسلام قبول کریں گے چنانچہ
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد وہ لوگ

بھی مسلمان ہو گئے۔ اس وقت آپ نے کہا :
 ” غفارٌ غفر اللہ لہما واسلم سالما اللہ“ : ” اللہ تعالیٰ غفار کی
 مغفرت فرمائے اور اسلم کو سلامت رکھے“

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے میں سکونت پذیر رہے یہاں
 تک کہ بدر، احد اور خندق کے معرکے گزر گئے۔ پھر وہ مدینہ منتقل ہو گئے اور
 ہر طرف سے کٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو رہے چنانچہ وہ آپ
 کی صحبت سے متمتع اور آپ کی خدمت کی سعادت سے بہرہ مند ہوتے رہے۔
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کا لحاظ کرتے اور انھیں دوسروں پر
 ترجیح دیتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی ان سے مصافحہ کرتے ہوئے
 اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار فرماتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب مدینہ منورہ
 آپ کی پرکشش شخصیت اور نورانی مجالس سے خالی ہو گیا تو حضرت ابوذر
 رضی اللہ عنہ کے لیے وہاں ٹھہرنے کا یارانہ رہا چنانچہ وہ شام کے ایک
 گاؤں میں چلے گئے اور حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ
 عنہما کے زمانہ خلافت تک وہیں مقیم رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت
 میں وہاں سے منتقل ہو کر دمشق میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں انھوں نے
 دیکھا کہ مسلمان عام طور سے دنیا طلبی میں منہمک اور عیش و عشرت میں
 غرق اور آخرت سے غافل ہیں۔ اس بدلی ہوئی صورتِ حال کو انھوں نے
 بڑی شدت سے محسوس کیا۔ سختی سے اس کا نوٹس لیا اور بڑے تند و تیز
 لہجے میں اس پر اعتراضات کرنے لگے۔ لوگ ان کے اس رویے سے تنگ
 آ گئے۔ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک پہنچی۔ انھوں نے حضرت ابوذر

کو مدینہ طلب کر لیا۔ خلیفہ کی طلبی پر وہ مدینہ چلے گئے۔ لیکن وہاں بھی وہ اسی صورت حال کا سامنا کر رہے تھے جس سے دمشق میں ان کو سابقہ پیش آچکا تھا۔ وہاں بھی لوگوں کو دنیا کی طرف مائل دیکھ کر بہت جلد بد دل ہو گئے اور لوگ بھی ان کی سخت گیری اور تلخ و تند باتوں سے بے زار ہو گئے۔ آخر کار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں ”ربذہ“ چلے جانے کا حکم دیا۔ ”ربذہ“ مدینہ کی ایک مضافاتی بستی تھی۔ وہ وہاں منتقل ہو گئے اور لوگوں سے دور، دنیاوی ساز و سامان سے بے نیاز اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کے اس طریقے پر چلتے ہوئے زندگی بسر کرنے لگے جو انھوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے ہوئے اختیار کیا تھا۔

ایک مرتبہ ایک شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا وہ ان کے گھر میں چاروں طرف اپنی نظریں دوڑاتا رہا جب اس کو وہاں کوئی سامان نظر نہیں آیا تو ان سے پوچھا: ”ابو ذر! آپ کا سامان کہاں ہے؟“

”وہاں، آخرت میں ہمارا ایک گھر ہے، ہم اپنے اچھے اور بیش قیمت سامان وہیں بھیج دیتے ہیں۔“ حضرت ابو ذر نے جواب دیا۔ اس آدمی نے ان کی بات سمجھتے ہوئے کہا: ”پھر بھی، جب تک آپ اس دنیا میں رہیں، زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ سامان تو ضروری ہے۔“

”لیکن گھر کا مالک ہم کو یہاں نہیں چھوڑے گا۔“ حضرت ابو ذر نے کہا۔

ایک دفعہ شام کے گورنر نے اس ہدایت کے ساتھ ان کے پاس تین ہزار دینار بھیجے کہ ”انھیں اپنی ضروریات پر خرچ کریں۔“ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر رقم واپس کر دی کہ ”کیا شام کے گورنر کو مجھ سے

زیادہ ذلیل کوئی شخص نہیں ملا تھا؛
 ہجرت نبوی کے بیسویں سال گردش زمانہ کے ہاتھوں نے اس عابد
 زاہد صحابی کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم نے فرمایا تھا:

ما اقلّت الغبراء ولا اطلّت الخضراء من رجل اصدق من ابی ذر۔
 ”زمین کی پشت پر اور آسمان کے زیر سایہ کوئی شخص ابو ذر سے زیادہ
 سچا نہیں ہے۔“



حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ

وہ کون ہے جس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سات آسمانوں کی بلندی سے سخت ترین عتاب نازل کیا گیا؟ وہ کون ہے جس کی شان میں خدائے تعالیٰ کے یہاں سے وحی لے کر جبریل آتے تھے؟ وہ موزن رسول حضرت عبداللہ بن ام مکتوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔

ابن ام مکتوم مکہ کے باشندے اور خاندان قریش کے چشم و چراغ تھے۔ حمی رشتے کے ذریعہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کے والد کا نام قیس بن زائد اور والدہ کا اسم گرامی عاتکہ بنت عبداللہ تھا جو عام طور سے اپنی کنیت ام مکتوم کے ساتھ مشہور تھیں کیونکہ حضرت عبداللہ پیدائشی نابینا تھے۔

سرزمین عرب جس وقت نیر اسلام کی ضیا پاشیوں سے متور ہوئی، حضرت عبداللہ موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے کو ایمان کے لیے کھول دیا۔ وہ اہل اسلام کے اس گروہ میں شامل ہو گئے جس نے اولین مرحلے میں داعی اسلام کی پکار پر لبیک کہا اور انھوں نے ان مصائب و آلام کا نہایت پامردی اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کیا جن سے مسلمان دو چار ہوئے۔ انھوں نے اس راہ میں کسی قسم کی قربانی اور فداکاری و

جان۔۔ پارسی سے دریغ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے رفقاہ کے ساتھ قریش کی اذیتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کی زیادتیوں کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔ اس راہ میں نہ تو ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر غزشت پیدا ہوئی نہ ان کا حوصلہ پست ہوا نہ ان کی قوت ایمانی میں کسی رُخ سے کمزوری کے آثار ظاہر ہوئے بلکہ ان مصائب نے ان کے اندر خدا کے دین سے ربطِ محکم، اس کی کتاب سے تعلق، اس کی شریعت سے اکتسابِ فیض اور بارگاہِ رسالت میں شوقِ حاضری کو مزید جلا بخشی۔

ان کے اندر بارگاہِ رسالت میں حاضری اور حفظِ قرآن کا شوق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ ہر فرصت کو غنیمت سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھاتے اور ہر موقع کو قیمتی جان کر اس کی طرف تیزی سے لپکتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس شوق میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسروں کے حصے کا وقت بھی لے لیتے تھے۔ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی طرف بڑی شدت کے ساتھ متوجہ تھے۔ آپ کے دل میں یہ نیک تمنا ہر وقت سر اٹھاتی رہتی تھی کہ روساءِ قریش دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ انہی دنوں کی بات ہے ایک دن آپ عتبہ ابن ربیعہ، اس کے بھائی شیبہ ابن ربیعہ، عمرو بن ہشام (ابو جہل)، امیہ ابن خلف اور خالد سیف اللہ کے والد ولید بن مغیرہ سے ملے۔ آپ ان کے ساتھ تنہائی میں گفتگو کر کے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ وہ لوگ اسلام قبول کر لیں یا کم از کم آپ کے ساتھ اہل ایمان کی اذیت رسانی سے باز آجائیں۔ انھی آپ گفتگو کر رہے تھے کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ وسلم

سے کتاب اللہ کی کوئی آیت پڑھنے کے لیے یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے:
 ”اے اللہ کے رسول! مجھے اس میں سے کچھ سکھا دیجئے جو اللہ تعالیٰ
 نے آپ کو سکھایا ہے۔“

”لیکن آپ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس کے برعکس آپ
 کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے اور اس امید میں کہ یہ اسلام قبول
 کر لیں گے اور ان کا اسلام خدا کے دین کی قوت اور اس کے رسول کی دعوت
 کی تائید کا ذریعہ بنے گا، آپ بدستور ان قریشیوں کی طرف متوجہ رہے۔
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ملاقات سے فارغ ہو کر ابھی گھر
 جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ آپ کے اوپر نزولِ وحی کی کیفیت طاری
 ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

عبس و توئی، ان جاءہ الاعمی، وما یدریک لعلہ یزکی، اویذکر
 فتفعبہ الذکری، اما من استغنی، فانت لہ تصدی، وما علیک
 الا یزکی، واما من جاءک یسعی، وهو یخشی، فانت عنہ تلحی، کلا
 انها تذکرۃ، فمن شاء ذکرہ، فی صحف مکرّمۃ، مرفوعۃ مطہرۃ،
 بایدی سفرۃ، کرام برۃ۔

ترجمہ: ”ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا۔
 تمہیں کیا خبر شاید وہ سُدھر جائے اور نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت
 کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو
 تم توجہ کرتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟“

اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے اس سے تم بے رنجی برتتے ہو، ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں، مسزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔“

یہ وہ سولہ آیتیں ہیں جنہیں حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ کی شان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کیا۔ یہ آیات اپنے یوم نزول سے اب تک تلاوت کی جا رہی ہیں اور قیامت تک برابر پڑھی جاتی رہیں گی۔

اس روز کے بعد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم کا بہت لحاظ کرنے لگے۔ وہ جب بھی آپ کے یہاں قیام کرتے آپ ان کی بڑی خاطر تواضع کرتے۔ وہ جب بھی آپ کی مجلس میں آتے آپ انہیں اپنے قریب بٹھاتے، ہمیشہ ان کی خیریت دریافت کرتے اور ان کی ضروریات پوری کرتے رہتے تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے یہ عبداللہ ابن ام مکتومؓ ہی تو تھے جن کے بارے میں سات آسمانوں کی بلندی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت ترین عتاب نازل ہوا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان پر قریش کا غیظ و غضب حد سے فزوں ہو گیا اور ان کے ظلم و ستم کی کوئی انتہا نہ رہی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ اجازت ملنے ہی حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے ترک وطن کرنے میں بڑی پھرتی سے کام لیا۔ چنانچہ اصحاب رسولؐ میں سے وہ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ سب سے پہلے مدینہ پہنچے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ نے یثرب پہنچتے ہی اپنے رفیق حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ساتھ مل کر لوگوں سے ملاقات کرنے، انھیں پڑھانے اور دین کی دعوت دینے کا سلسلہ شروع کر دیا اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ نے حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم اور حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہما کو موزن مقرر کیا تاکہ وہ دن میں پانچ مرتبہ کلمہ توحید کا اعلان کریں، انھیں بہترین عمل و نماز کے لیے بلائیں اور خیر و فلاح پر ابھاریں۔ عام طور پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دیتے اور حضرت ابن ام مکتومؓ نماز کے لیے اقامت کہتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اذان حضرت ابن ام مکتومؓ دیتے اور اقامت بلالؓ کہتے تھے۔ رمضان المبارک کے پہینے میں تو ان دونوں کی شان ہی نرالی ہوتی تھی۔ مدینے کے مسلمان ایک کی اذان پر سحری کھاتے اور دوسرے کی اذان پر اس سے رک جاتے تھے۔ حضرت بلالؓ رات کے پچھلے پہر اذان دے کر سوتے ہوتے لوگوں کو نیند سے بیدار کرتے اور حضرت ابن ام مکتومؓ طلوع فجر کا انتظار کرتے رہتے اور طلوع صبح صادق کے ساتھ ہی نماز کے لیے اذان دے دیتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ابن ام مکتومؓ کی عزت افزائی اور قدر دانی کا یہ حال تھا کہ آپ نے اپنی عدم موجودگی کے مختلف مواقع پر دسیوں بار ان کو مدینہ پر اپنا نائب مقرر کیا۔ ان میں سے ایک موقع وہ بھی تھا جب آپ نے فتح مکہ کے لیے مدینہ چھوڑا تھا۔

غزوہ بدر کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی شان کو بڑھاتے، جہاد سے جی چرانے والوں پر ان کی فضیلت جتاتے، مجاہدین کو جہاد پر

اکساتے اور جہاد میں شرکت نہ کرنے والوں کے رویے پر اظہارِ ناگواری کرتے ہوئے اپنے نبی پر قرآن کریم کی چند آیتیں نازل کیں تو حضرت ابن ام مکتومؓ کے دل پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور اس شرفِ ہمسے محرومی ان کو بہت شاق گزری اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

”اے اللہ کے رسول! اگر میرے پاس استطاعت ہوتی تو میں جہاد میں ضرور شریک ہوتا۔“ پھر انہوں نے نہایت سوز و گداز کے ساتھ اللہ سے دعا کی کہ وہ ان کے اور ان کے جیسے دوسرے معذور لوگوں کے بارے میں قرآن نازل فرمائے جو اپنی جسمانی معذوریوں کے سبب شرکتِ جہاد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وہ بڑے خشوع و تضرع کے ساتھ دعا مانگتے:

اللّٰهُمَّ انزل عذری..... اللّٰهُمَّ انزل عذری..... خدایا! میرے عذر کے متعلق قرآن نازل فرمادے.... خدایا!..... اور اللہ تعالیٰ نے جلد ہی ان کی اس دعا کو شرفِ قبولیت سے نواز دیا۔

کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ:

”ایک روز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں بیٹھا تھا کہ یکایک آپ کے اوپر سکینت و وقار کی کیفیت طاری ہو گئی اور اسی حالت میں آپ کا زانوئے مبارک میرے زانو سے جا کر ٹک گیا، اس سے میرے زانو پر زبردست بوجھ پڑنے لگا، ایسا بوجھ کہ اس سے زیادہ وزن میں نے اب تک کسی چیز میں محسوس نہیں کیا تھا۔ جب آپ کے اوپر سے یہ کیفیت دور ہوئی تو مجھ سے فرمایا کہ ”زید! لکھو، اور میں نے لکھا:

”لا یتوی القاعدون من المؤمنین والمجاهدون فی سبیل

اللہ باموالہم و انفسہم“ (النار-۹۵) مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو گھربٹھے رہتے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔“

تو ابن مکتوم نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ ”اے اللہ کے رسول! جو لوگ جہاد میں شریک ہونے کی استطاعت سے محروم ہیں ان کا کیا ہوگا؟“ ان کی اس بات کے ختم ہوتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پھر وہی کیفیت طاری ہوئی۔ اس بار بھی آپ کا زانوئے مبارک میرے زانو پر پڑا اور میں نے وہی وزن محسوس کیا جو پہلی بار کیا تھا۔ پھر جب آپ کے اوپر سے نزول وحی کی وہ کیفیت دور ہوئی تو فرمایا:

”زید! جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھو“ تو میں نے پڑھا لا یتوی القاعدون من المؤمنین“ تو آپ نے فرمایا کہ لکھو: ”غیر ادلی الضرر“ ”کسی معذوری کے بغیر“ اس طرح وہ استثنا نازل ہوا جس کی تمنا حضرت ابن ام مکتوم نے کی تھی۔ باوجودیکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عبداللہ ابن ام مکتومؓ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو شرکت جہاد کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا تھا، ان کا نفس بلند میں معذوروں کے ساتھ بیٹھ رہنے پر رضامند نہ ہوا۔ انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہونے کا عزم بالجزم کر لیا۔ کیونکہ نفوس عالیہ جہاد امور کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے کاموں پر قانع نہیں ہوا کرتے چنانچہ اسی روز انہوں نے طے کر لیا کہ وہ کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ انہوں نے میدان جنگ میں اپنے لیے ڈیوٹی بھی متعین کر لی تھی وہ کہتے تھے کہ ”مجھے دو صفوں کے درمیان کھڑا کر کے علم میرے ہاتھ میں دے دو۔ میں اسے بلند رکھوں گا اور اس کی حفاظت کروں گا کیونکہ نابینا ہونے کی وجہ سے میں بھاگ نہیں سکتا“

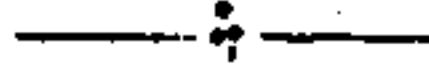
حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ۳۳ھ میں ایرانیوں کے ساتھ ایک ایسی فیصلہ کن جنگ کا عزم مصمم کیا جو ان کی حکومت کو زیر کر دے اور ان کی سلطنت کا خاتمہ کر کے عساکر اسلام کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ صاف کر دے۔ اس لیے انھوں نے اپنے صوبائی گورنروں کو ہدایت بھیجی۔

”ہر اس شخص کو جلد از جلد میرے پاس بھیج دو جس کے پاس اسلحہ یا گھوڑا یا قوت و شجاعت یا جنگی سوجھ بوجھ ہو۔“

اور مسلمانوں نے فاروق اعظمؓ کی اس پکار پر بیک کہا اور وہ جوق در جوق مرکز خلافت مدینہ کی جانب اُٹھ پڑے۔ ان بیک کہنے والوں میں نابینا مجاہد حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس شکر کی قیادت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور انھیں ہدایات و نصائح کے ساتھ رخصت کیا۔ جب یہ لشکر قادسیہ کے مقام پر پہنچ کر خیمہ زن ہوا اور جنگ کا دن آیا تو حضرت ابن ام مکتومؓ زرہ پہن کر پورے طور پر تیار ہو کر نکلے اور خود کو مسلمانوں کی علمبرداری اور اس کی حفاظت یا اس کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دینے کے لیے پیش کیا۔

دونوں فوجوں میں تین دن تک سخت خونریز معرکہ آرائی ہوئی رہی۔ دونوں فریق ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرائے کہ جنگوں کی تاریخ سے اس کی مثال بمشکل پیش کی جاسکتی ہے۔ آخر کار تیسرے روز مسلمانوں کی زبردستی فتح کے ساتھ اس جنگ کا خاتمہ ہوا اور دنیا کی عظیم ترین سلطنت کا نام و نشا صفحہ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا اور کفر و بت پرستی کی سرزمین پر توحید کا جھنڈا لہرانے لگا۔

اس فتحِ مبین کی قیمت ہزاروں شہداء نے اپنے خون سے ادا کی تھی۔ ان شہیدوں میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ بھی تھے۔ وہ میدانِ جنگ میں اس حال میں پڑے ہوئے پائے گئے کہ اپنے خون میں لت پت، علمِ اسلام کو اپنے کندھے سے چمٹائے ہوئے تھے۔



حضرت مجزاة بن ثور سدوسی رضی اللہ عنہ

یہ ہیں اللہ کے بہادر اور جیالے سپاہی جو معرکہ قادسیہ سے ظفریاب فتح مند ہو کر واپس لوٹے ہیں، جنگ کے گرد و غبار کو اپنے اوپر سے جھانٹتے ہوئے اللہ کی نصرت و تائید پر اظہار مسرت کر رہے ہیں، اپنے شہید ہونے والے بھائیوں کو عطا ہونے والے زبردست اجر و ثواب پر مسرور ہیں اور اگلے کسی ایسے ہی معرکہ کے لیے سراپا شوق و انتظار ہیں جو اپنے حسن و جمال اور ہیبت و جلال میں معرکہ قادسیہ کے مثل ہو۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ جہاد کے اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے امیر المومنین کا حکم آجائے تاکہ وہ کسریٰ کی سلطنت اور ایرانی شہنشاہیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ اور ان مبارک و فرخندہ فال لوگوں کو زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔

وہ رہا امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظمؓ کا قاصد جو مدینے سے کوفہ کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ کوفہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھ کر بصرہ سے آنے والی اسلامی فوج کے ساتھ مل جائیں اور دونوں فوجیں ساتھ ساتھ مل کر "ہواز" کی طرف پیش قدمی کریں ہرمزان کا تعاقب کر کے اس پر فیصلہ کن ضرب لگائیں اور "تسر" پر قبضہ کر لیں، جو تاج کسریٰ کا ایک درخشندہ ہیرا اور

بلاد فارس کا تابندہ موتی ہے۔

امیر المومنین حضرت فاروق اعظمؓ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام جو حکم نامہ آیا ہے اس میں اس بات کی تاکید ہے کہ وہ قبیلہ بنو بکر کے سردار، عرب کے مشہور اور بہادر شہسوار حضرت مجزاة بن ثور سدوسی کو ضرور اپنے ساتھ لے لیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فوج میں خلیفہ کے اس حکم کی تہنیر کرائی، اپنی فوج کی ترتیب درست کی اور اس کے پیسرہ کی کمان حضرت مجزاة ابن ثور کے سپرد کر کے آگے بڑھے اور بصرہ سے آنے والے اسلامی لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے اور پھر دونوں فوجیں ایک ساتھ مل کر راہِ خدا میں جہاد کے لیے آگے روانہ ہو گئیں۔ یہ لوگ شہروں پر قبضہ کرتے اور قلعوں کو دشمنوں کے وجود سے پاک کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے رہے اور ہرمزان ان کے آگے بھاگتا ہوا تتر پہنچ کر قلعہ بند ہو گیا۔

تتر جس میں ہرمزان نے پناہ لی تھی — ایران کا نہایت خوبصورت شہر تھا۔ اس کی آب و ہوا نہایت خوشگوار تھی اور اس کے حفاظتی انتظامات بہت سخت، قابل اعتماد اور ناقابلِ تسخیر تھے۔ اس وقت وہ نہایت ترقی یافتہ اور متمدن شہر تھا جس کے تذکرے تاریخ کے صفحات میں آج تک محفوظ ہیں۔ وہ ایک ایسی سطح مرتفع پر آباد تھا جس کی شکل گھوڑے سے مشابہ تھی۔ اس کو ایک بڑا دریا، دریائے دُجیل سیراب کرتا تھا۔ اس کے اوپر ایک فوارہ تھا جسے ایران قدیم کے نامور اور عظیم حکمران شہنشاہ شاہ پور نے بنوایا تھا۔ دریائے دُجیل کا پانی زیر زمین سُرنگوں سے گزار کر اس فوارے تک پہنچایا جاتا تھا۔

تستر کا فوارہ اور اس کی سترنگیں دنیا کے تعمیری عجائبات میں شمار ہوتی تھیں۔ اسے بڑے بڑے مضبوط پتھروں سے اُونچا کیا گیا تھا، اس کے ستون ٹھوس لوہے کے تھے اس کے فوارے اور اس کی سترنگوں کو سیسے سے پلاسٹر کیا گیا تھا۔

شہر تستر کے اردگرد ایک عظیم الشان بلند و بالا فصیل تھی۔ جس نے پورے شہر کو اپنے احاطہ میں لے رکھا تھا۔ مورخین کہتے ہیں کہ وہ دنیا کی پہلی اور عظیم ترین فصیل ہے۔

پھر ہرمزان نے فصیل شہر کے اردگرد ایک گہری اور ناقابل عبور خندق کھدوا کر اس کے اندر ایران کی آزمودہ کار اور منتخب فوج جمع کر رکھی تھی، مجاہدین اسلام کے لشکر نے تستر پہنچ کر اس کے خندق کے چاروں طرف خیمہ زن ہو کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے کو پورے اٹھارہ مہینے گزر گئے مگر مسلمان اس مدت میں اس خندق کو عبور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس طویل مدت میں مسلمانوں، اور ایرانیوں کے درمیان اسٹی دفعہ معرکہ آرائی ہوئی، ہر معرکہ فریقین کے دو بہادروں کے درمیان مبارزت سے شروع ہوتا اور بعد میں گھمان کی جنگ میں بدل جاتا۔

حضرت مجزاة بن ثور نے ان لڑائیوں میں ایسی غیر معمولی شجاعت و مردانگی کا مظاہرہ کیا کہ اس کو دیکھ کر دوست اور دشمن بھر حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے۔ انھوں نے انفرادی جنگ میں دشمن کے ایک تنو بہادروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور دشمنوں کے دلوں میں ایسی ہیبت طاری کر دی کہ ایرانی سپاہی لرزہ بر اندام ہو جاتے اور ان کے ان کارناموں پر مسلمانوں کے سر نخر سے اونچے

ہو جاتے۔ ان کے ان کارناموں کو دیکھ کر لوگوں کی سمجھ میں
 میں یہ بات آگئی کہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ لشکر مجاہدین میں ان کی
 شمولیت کے کیوں اتنا زیادہ خواہشمند تھے۔

آخری جنگ میں مسلمانوں نے ایرانیوں پر ایسا زوردار حملہ کیا کہ ایرانی اس
 کے مقابلے کی تاب نہ لاسکے اور خندق کے اوپر بنے ہوئے پل کو مسلمانوں
 کے لیے خالی چھوڑ کر خود شہر کے اندر پناہ گزیں ہو گئے اور اپنے پیچھے شہر
 کے مضبوط قلعے کا پھاٹک بند کر لیا۔

اس صبر طویل کے بعد مسلمان اب جن حالات کا سامنا کر رہے تھے وہ
 پہلے سے بھی زیادہ سخت صبر آزما تھے۔ ایرانی مسلمانوں کے اوپر برجون سے
 پیہم تیروں کی بارش کر رہے تھے اور وہ فصیلوں کے اوپر سے لوہے کی زنجیریں
 لٹکاتے جن کے سروں پر انکس لگے ہوتے تھے جو آگ میں تپانے کی وجہ سے
 سرخ انگاروں کی طرح دہک رہے ہوتے۔ جب کوئی مسلمان فصیل کے قریب
 پہنچنے یا اس پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو ایرانی اسے انھیں دیکھتے ہوئے انگوٹوں
 میں پھنسا کر اوپر کھینچ لیتے اور اس کا جسم جل جاتا، بدن کا گوشت گر جاتا اور
 اس طرح اس کا کام تمام ہو جاتا۔

مسلمان سخت کرب و الم میں مبتلا تھے وہ نہایت خشوع و خضوع اور
 اور انتہائی گریہ و زاری کے ساتھ دعا مانگ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کی
 ان پریشانیوں کو دور فرمائے اور دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کرے۔

اسی اثناء میں کہ حضرت موسیٰ اشعریؓ تستر کی اس عظیم الشان فصیل
 کو عبور کرنے کی تدابیر پر غور کر رہے تھے اور اس سے قریب قریب ٹاپوس
 ہو چکے تھے کہ اچانک ان کے سامنے ایک تیراگر گرا جو ان کی طرف

فصیل کے اوپر سے پھینکا گیا تھا۔
حضرت ابو موسیٰؓ نے اسے دیکھا۔ اس میں کاغذ کا ایک پرزہ بندھا ہوا
تھا۔ جس میں یہ پیغام تھا۔

”مسلمانو! میں تم لوگوں پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اپنی جان، اپنے
مال، اپنے اہل و عیال اور اپنے متبعین کے لیے امان طلب کر رہا ہوں اس
کے بدلے میں تم لوگوں کو ایک ایسے خفیہ راستے کی نشان دہی کروں گا جس
سے گزر کر تم لوگ شہر میں داخل ہو سکتے ہو۔“ جواب میں حضرت ابو موسیٰؓ نے
ایک کاغذ پر امان کی تحریر لکھی اور اسے تیر کے ذریعے واپس اس کے پاس
پھینک دیا۔ اس شخص کو مسلمانوں کی طرف سے دیے ہوئے امان پر پورا اطمینان
ہو گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمان اپنے وعدے کے کتنے سچے اور عہد کے
کتنے پکے ہوتے ہیں۔ وہ تاریکی کے پردے میں خاموشی سے ان کے پاس آیا
اور حضرت موسیٰ اشعریؓ کو اپنی پوری حقیقت بتا دی۔

”ہم اس قوم کے سربراہ اور وہ لوگوں میں سے ہیں۔ ہرمزان نے میرے
بڑے بھائی کو قتل کر کے اس کے مال و جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اس کے
اہل و عیال پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں۔ وہ میرے لیے بھی اپنے سینے
میں بغض و عداوت کے جذبات چھپاتے ہوئے ہے۔ میں خود کو اور اپنے
بال بچوں کو اس کی دست درازی سے محفوظ نہیں سمجھتا۔ اس لیے میں نے
آپ لوگوں کے عدل و انصاف کو اس کے جور و ستم پر اور آپ لوگوں کے
ایفائے عہد کو اس کی غداری پر ترجیح دی ہے۔ اور میں طے کر چکا ہوں کہ
آپ لوگوں کو ایک ایسے خفیہ راستے کی نشان دہی کروں گا جس سے گزر
کر آپ لوگ شہر تک پہنچ سکتے ہیں۔ آپ ایک ایسے آدمی کو میرے ساتھ

کر دیجئے جو شجاعت و جرأت اور عقل و فہم سے پورے طور پر آراستہ ہو۔
اس کے ساتھ ساتھ وہ بہترین تیراک بھی ہوتا کہ میں اس کی نشان دہی
کر دوں۔“

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت مجزاة ابن ثورؓ کو طلب فرمایا اور پوری
بات ان کے گوش گزار کر کے فرمایا کہ ”آپ اپنے قبیلے سے ایک ایسا آدمی
مجھے دیجئے جو صاحب عقل و فہم ہونے کے علاوہ تیرنے کے فن میں بھی ہمارا
رکھتا ہو۔“

حضرت مجزاة نے کہا ”اس کے لیے میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔“
”اگر آپ اس کے لیے تیار ہیں تو پھر ٹھیک ہے خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔“
حضرت ابو موسیٰؓ نے فرمایا۔ اس کے بعد حضرت ابو موسیٰؓ نے ان کو نصیحت
فرمائی کہ وہ راستے کو اچھی طرح اپنے ذہن میں مستحضر کر لیں، دروازہ کی جگہ
کو خوب پہچان لیں، ہرمزان کی قیام گاہ اور اس کی شخصیت کو ٹھیک سے
ذہن نشین کر لیں اور اس کے علاوہ اپنی طرف سے کوئی اور اقدام نہ کریں۔

حضرت مجزاة بن ثورؓ اپنے ایرانی رہبر کے ساتھ تاریکی میں روانہ ہوئے
اور اس زیر زمین سرنگ میں داخل ہوئے جو دریا اور شہر کے درمیان بنائی
گئی تھی۔ سرنگ کہیں کہیں اتنی کشادہ تھی کہ پانی میں کھڑے ہو کر چلنا
ممكن ہوتا اور کہیں کہیں اتنی تنگ تھی کہ اس میں سے تیر کر گزرنا پڑتا،
کہیں شاخ درشاخ، کہیں ٹیڑھی میڑھی اور کہیں بالکل سیدھی تھی۔ اس
طرح چلتے ہوئے وہ اس جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے شہر میں داخل ہونے کا
راستہ نکلتا تھا۔ ایرانی رہبر نے انہیں اپنے بھائی کے قاتل ہرمزان کو
دکھایا اور اس کی جگہ کی بھی نشان دہی کی جہاں وہ قیام پذیر تھا۔ جب

حضرت مجزاةؓ نے ہرمزان کو دیکھا تو ان کے جی میں آیا کہ اس کے حلق میں ایک تیر مار کر اسے ہلاک کر دوں مگر فوراً ہی انھیں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی یہ نصیحت یاد آگئی کہ وہاں کوئی اور اقدام نہ کرنا۔ انھوں نے فوراً اپنی اس خواہش پر لگام لگائی اور طلوع فجر سے پہلے اسلامی کیمپ میں واپس آگئے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے تین تاسو ایسے جانبازوں کو تیار کیا جو شجاعت و ثبات قدمی میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ تیراکی میں بھی ماہر تھے۔ حضرت مجزاة ابن ثورؓ کو ان کا قائد مقرر کیا۔ اور انہیں رخصت کرتے وقت کچھ نصیحتیں فرمائیں۔ اور شہر پر لشکر مجاہدین کے حملہ آور ہونے کے لیے ان کی تکبیر کو ”شعار“ قرار دیا۔

حضرت مجزاةؓ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جہاں تک ممکن ہو وہ ہلکے پھلکے کپڑے پہن لیں کہ پانی میں بھینکنے سے ان کا وزن زیادہ نہ ہو جائے۔ اور انہیں تاکید کر دی کہ اپنے ساتھ تلوار کے علاوہ دوسرا کوئی اسلحہ نہ رکھیں انہوں نے یہ بھی تاکید کر دی کہ سب لوگ اپنی اپنی تلواروں کو اپنے کپڑوں کے نیچے جسم کے ساتھ باندھ لیں۔ پھر ایک تہائی رات گزرنے کے بعد انہیں اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔

حضرت مجزاة بن ثورؓ اور ان کے جانباز تقریباً دو گھنٹے تک اسی خطرناک سرنگ کے دشوار گزار مراحل سے برد آزما رہے۔ کبھی وہ ان دشواریوں پر غالب آجاتے اور کبھی وہ انہیں زیر کر لیتیں۔ جب یہ لوگ سرنگ کے اس آخری سرے پر پہنچے جو شہر میں داخل ہونے والے راستے سے متصل تھا تو حضرت مجزاةؓ نے دیکھا کہ سرنگ ان کے دوسو بیس جانبازوں کو نگل گئی ہے اور ان میں سے صرف اسی آدمی بچے ہیں۔

حضرت مجزاةؓ اور ان کے ساتھیوں نے شہر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اپنی تلواریں بے نیام کر لیں اور قلعہ کے پہرہ داروں پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر وہ لوگ دروازوں کی طرف جھپٹے اور انہیں کھولتے ہوئے زور سے بکیر کی آواز بلند کی۔ دروازہ کے باہر سے مسلمانوں نے ان کی بکیروں کا جواب دیا۔ اور صبح ہوتے ہوئے انہوں نے شہر پر ایک زوردار حملہ کر دیا۔ پھر ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان ایک ایسی ہلاکت خیز اور گھمسان کی جنگ چھڑ گئی جس کی مثال جنگوں کی تاریخ میں بہت کم گزری ہوگی۔

دوران جنگ حضرت مجزاةؓ کی نظر ہرمزان پر پڑی۔ وہ میدان جنگ میں ایک جگہ کھڑا ہو کر اپنی فوج کی کمان کر رہا تھا۔ حضرت مجزاةؓ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور تلوار لے کر جھپٹ پڑے لیکن پھر لڑنے والوں کی بھیر میں وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ نظر آیا۔ حضرت مجزاةؓ تیزی سے اس کی طرف لپکے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت مجزاةؓ اور ہرمزان دونوں نے اپنی تلواروں سے ایک ساتھ ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ مگر بد قسمتی سے حضرت مجزاةؓ کا وار چوک گیا اور ہرمزان کا وار ٹھیک اپنے نشانے پر پڑا۔ حضرت مجزاةؓ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے اور دولت شہادت سے ہم کنار ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد بھی مسلمانوں نے لڑائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح و نصرت سے نوازا اور ہرمزان گرفتار کر لیا گیا۔

امیر المومنین حضرت فاروق اعظمؓ کو اس فتح کی خوش خبری سنانے کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت اس شان سے روانہ ہوئی کہ ان کے

آگے آگے ہر مزان تھا۔ اس کے سر پر اسی کا ہیروں سے مرصع تاج تھا اور اس کے کندھے پر زردوزی سے مزین اس کی خوبصورت اور بیش قیمت چادر پڑی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ فتح کی بشارت سنانے والے خلیفہ کے لیے ان کے جانباز اور بہادر شہ سوار حضرت مجزاة بن ثورؓ کی شہادت کی اندوہناک خبر بھی لیے جا رہے تھے۔



حضرت اُسَید بن حَضِیر رضی اللہ عنہ

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکہ سے تاریخ اسلامی کی اولین دعوتی سفارت پر یثرب پہنچے اور قبیلہ خزرج کے ایک رئیس حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ انھوں نے ان کے مکان کو اپنی قیام گاہ، دعوتِ اسلامی کی نشر گاہ اور نبوتِ محمدیؐ کے اعلان و اظہار کا مرکز قرار دیا۔ باشندگانِ یثرب بڑے پیمانے پر اس نوجوان داعی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی مجلسوں کی جانب متوجہ ہوئے ان کی شیریں گفتاری، ان کے پر زور استدلال، ان کی نرم طبعی اور ان کے پھرے سے پھوٹنے والے ملکوتی حسن میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ لوگ بڑی تعداد میں ان کی مجالس میں شریک ہونے کے لیے پروانہ دار کھینچے چلے آتے تھے۔ ان سب کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی تھی جو ان لوگوں کے لیے باعثِ کشش تھی، اور وہ تھی اللہ کی عظیم کتاب جس کی آیات کی تلاوت جب وہ اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز اور دلکش و شیریں لہجے میں کرتے تھے تو سخت سے سخت دل موم ہو جاتے اور آنکھوں سے بے تحاشہ اشکوں کا سیلاب رواں ہو جاتا اور ان کی ہر مجلس میں کچھ نہ کچھ لوگ اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شمولیت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیتے تھے۔

ایک دن اسعد بن زرارہ اپنے ہمجان، داعیِ اسلام حضرت مصعب بن عمیر

کے ساتھ قبیلہ بنی عبدالاشہل کے کچھ لوگوں سے ملاقات کرنے اور ان کو اسلام کی دعوت سے روشناس کرانے کے ارادے سے نکلے۔ وہ دونوں بنو عبدالاشہل کے ایک باغ میں گھس گئے اور کھجوروں کے سائے میں ایک کنویں کے پاس بیٹھ گئے اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کے گرد کچھ مسلمان اور بعض دوسرے لوگ جو ان کی زبان سے قرآن کریم کی آیات اور اسلام کی دعوت سننا چاہتے تھے، جمع ہو گئے۔ وہ انہیں اسلام کی دعوت سمجھا رہے تھے اور اس کے اجر و ثواب کی خوشخبری سن رہے تھے اور لوگ ان کی گفتگو کے حسن سے مسحور، خاموش و ہمہ تن گوش بیٹھے تھے۔ اسی دوران ایک شخص قبیلہ ادس کے سرداروں، اُسید بن حضیر اور سعد بن معاذ کے پاس پہنچا اور ان کو بتایا کہ مکے سے آیا ہوا داعی ان کے مکان کے قریب ہی ٹھہرا ہوا ہے اور یہ جرأت اس کو اسعد بن زرارہ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ یہ اطلاع پا کر سعد بن معاذ نے اُسید بن حضیر سے کہا:

”اُسید! اس مکی نوجوان کے پاس جاؤ جو یہاں آکر ہمارے کمزوروں کو بہکانے اور ہمارے معبودوں کو سفاہت و حماقت کی طرف منسوب کرنے میں مصروف ہے۔ اس سے ڈانٹ کر کہہ دو کہ خبردار آئندہ وہ ہمارے قبیلے میں قدم نہ رکھے.....“ تھوڑی دیر رک کر اس نے پھر کہا:

”اگر وہ میرے خالہ زاد بھائی اسعد بن زرارہ کا ہمان اور اس کی پناہ میں نہ ہوتا تو میں خود ہی اس سے نمٹ لیتا۔ تم کو زحمت نہ دیتا۔“

اُسید اپنا نیزہ اٹھا کر باغ کی طرف روانہ ہوا۔ جب حضرت اسعد بن زرارہ نے اس کو آتے ہوئے دیکھا تو مصعب بن عمیر سے بولے:

”مصعب! یہ اپنے قبیلہ کا سردار، ان میں سب سے زیادہ حلیم و بردبار اور صاحبِ فضل و کمال شخص ”اُسید بن حضیر“ ہے۔ اگر یہ شخص اسلام

قبول کر لے تو اس کی اقتدار میں بہت سے لوگ دائرۃ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ خدا کے دین کی دعوت اس کے سامنے پورے خلوص و دل سوزی اور سلیقے سے پیش کرنا۔“

اسید بن خضیر ان لوگوں کے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے حضرت مصعبؓ اور ان کے دوست کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا:

”تم دونوں کو ہمارے محلے میں آنے اور ہمارے کمزور لوگوں کو گمراہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟“

حضرت مصعبؓ نے اسید کی طرف چہرہ اٹھایا جو ایمان کے نور سے جگمگا رہا تھا۔ اور بڑے پُر خلوص و دل کش لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”اے سردار! کیا آپ پسند کریں گے کہ میں آپ کے سامنے اس سے بھی اچھی بات پیش کروں؟“

”وہ کون سی بات ہے؟“ اسید نے پوچھا۔

”آپ اطمینان سے یہاں تشریف رکھیں اور غور سے ہماری باتیں سنیں۔ اگر پسند آئیں تو انھیں قبول کر لیجیے گا اور ناپسند ہوں تو ہم یہاں سے واپس چلے جائیں گے اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کریں گے“ حضرت مصعبؓ نے فرمایا۔

”تم نے انصاف کی بات کہی“ یہ کہتے ہوئے اسید اپنا نیزہ زمین پر گرا کر وہیں بیٹھ گیا۔ پھر جب حضرت مصعبؓ نے اسے اسلام کی حقیقت سمجھائی اور قرآن کریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی شکنیں دور ہو گئیں، چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور وہ بولا:

”کتنی عمدہ ہیں یہ باتیں جو تم بتا رہے ہو اور اتنا جلیل القدر ہے یہ کلام جس کی تم تلاوت کر رہے ہو... جب تم لوگ اسلام میں داخل ہونا چاہتے ہو تو کیا کرتے ہو؟“

”اس کے لیے آپ غسل کیجئے اور اپنے کپڑوں کو پاک کر کے اس بات کا اقرار اور اعلان کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود اور لائق پرستش نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، پھر دو رکعت نماز پڑھیے“

اسیڈاٹھ کر کنویں پر گئے، انھوں نے اس کے پانی سے طہارت حاصل کی اور اس بات کی گواہی دی کہ خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور پھر انھوں نے دو رکعت نماز ادا کی اور اس طرح اس روز عرب کا ایک قابل رشک شہسوار اور قبیلہ اوس کا ایک مشہور سردار لشکر اسلام میں شامل ہو گیا۔ عقل و دانائی میں ان کی برتری اور حسب و نسب میں ان کے فضل و شرف کی وجہ سے ان کے قبیلے نے ان کو ”کامل“ کے لقب سے نوازا تھا۔ وہ سیف و قلم دونوں کے دھنی تھے۔ وہ شہسواری اور تیراندازی میں کامل دست گاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معاشرے میں قرأت و کتابت کے وصف سے متصف تھے جس میں ایسے افراد نہایت کمیاب تھے جو پڑھنا لکھنا جانتے ہوں۔ ان کا قبول اسلام سعد بن معاذ کے قبول اسلام کا سبب بنا اور ان دونوں کا دائرہ اسلام میں داخل ہونا قبیلہ اوس کی ایک بڑی تعداد کے لیے مشرف بہ اسلام ہونے، مدینہ کے، رسول اللہ کے لیے دار ہجرت، اسلام کی پناہ گاہ اور اس کی عظیم سلطنت کا پایہ تخت بننے کا ذریعہ بن گیا۔

حضرت اسیڈ نے جب سے حضرت مصعب بن عمیر سے قرآن سنا تھا، وہ

اس طرح اس کے گردیدہ ہو گئے تھے جیسے کوئی محب اپنے محبوب پر فریاد کرتا ہے اور وہ اس کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے تھے جیسے کوئی پیارا ماں تخت گرنے کے دن میں بیٹھے اور ٹھنڈے پانی کے گھاٹ کی طرف اپنا سبب۔ انھوں نے قرآن عظیم کی تلاوت کو اپنا شب و روز کا مشن بنا لیا تھا۔ وہ یا تو خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے نظرات یا تہذیبی امور میں تامل کی تلاوت میں مشغول دکھائی دیتے تھے۔

ان کا آواز بڑی پرسوز، ان کا لہجہ نہایت واضح اور ان کی ادائیگی بہت صاف تھی۔ عام طور سے قرآن کی تلاوت ان کو اس وقت بہت بھلی معلوم ہوتی تھی جب رات پرسکون ہوتی، ماحول پرسکون اور گہرا سناٹا طاری ہوتا، لوگ سوچے ہوتے اور دلوں میں تکدر نہ ہوتا اور صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ حضرت انسؓ کی تلاوت کے اوقات کے منتظر رہتے اور ان کی تلاوت کو سننے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شخص خود کو بڑا خوش قسمت تصور کرتا جس کو ان سے قرآن سننے کا موقع مل جاتا، جیسا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ ان کی تلاوت قرآن کی شیرینی و حلاوت سے آسمان والے بھی آبی طرح محفوظ ہوتے تھے جس طرح زمین والے اس سے لذت اندوز ہوتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت انسؓ آدھی رات کو اپنے مکان کے پھوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے صاحبزادے یحییٰ ان کی بغل میں سو رہے تھے اور ان کا گھوڑا، جس کو انھوں نے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پال رکھا تھا، ان سے کچھ فاصلے پر بندھا ہوا تھا۔ رات خاموش اور تاریک تھی، آسمان صاف و شفاف اور خوبصورت تھا اور ستاروں کی بیدار نگاہیں پرسکون

زمین کو رقت و لطافت کے ساتھ تک رہی تھیں۔ حضرت اسید کے جی میں آیا کہ وہ اس نمناک فضا کو قرآن کی خوشبو سے معطر کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی دلکش آواز میں تلاوت شروع کی۔

الم۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔
 هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ
 بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَ
 مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ۔ وَالَّذِينَ
 يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَ
 مِمَّا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ، وَبِالْآخِرَةِ
 هُمْ يُوقِنُونَ۔

الف، لام، م۔ یہ اللہ کی کتاب ہے،
 اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان
 پر سزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان
 لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم
 نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے
 ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی
 قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی
 گئیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت
 پر یقین رکھتے ہیں۔

(البقرہ: ۱-۴)

اچانک انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا گھوڑا اس طرح اچھل کود رہا ہے
 جیسے وہ اپنی رسی توڑ لے گا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ ان کے خاموش ہوتے ہی
 گھوڑا پرسکون ہو گیا۔ پھر جب انھوں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا:

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔
 تو گھوڑا پہلے سے زیادہ اچھل کود کرنے لگا۔ وہ پھر خاموش ہو گئے۔ گھوڑا
 پھر پرسکون ہو گیا۔ حضرت اسید نے وقفے وقفے سے تلاوت کا عمل کئی بار دہرایا
 وہ جب بھی تلاوت شروع کرتے گھوڑا بھڑکنے اور بدکنے لگتا اور جب وہ
 حرکت جاتے تو گھوڑا بھی پرسکون ہو جاتا۔ انھیں اپنے پیٹے یحییٰ کے متعلق یہ
 خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں گھوڑا اسے کھل نہ دے۔ اس لیے وہ اس کو جگانے

کے لیے اس کے پاس گئے۔ یکایک ان کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ آسمان پر بادلوں کی چھتری سی تہی ہوئی ہے۔ وہ ایسا خوبصورت اور دلکش منظر تھا جو اس سے پہلے کبھی ان کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان بادلوں کے ساتھ چراغوں کی طرح کی کچھ روشنیاں معلق ہیں یہاں تک کہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر جب انھوں نے رات کا واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا:

”اُس سیدہ فرشتے تھے جو تمہاری تلاوت سننے کے لیے آئے تھے۔ اگر تم نے اپنی قرأت کا سلسلہ منقطع نہ کیا ہوتا تو لوگ انھیں کھلم کھلا دیکھ لیتے“ جس طرح حضرت اُسید کو کتاب الہی سے غیر معمولی عشق تھا اسی طرح انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بے انتہا محبت تھی۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ دو اوقات ایسے ہیں جن میں ان کے قلب کی صفائی اور ایمان کی جلا اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، جب وہ قرآن پڑھ یا سن رہے ہوں اور جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے یا گفتگو کرتے دیکھ رہے ہوں۔

ان کے دل میں اکثر یہ تمنا کر دہیں لیتی رہتی تھی کہ ان کا جسم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک سے مس ہو جائے اور وہ جھک کر آپ کے جسد مبارک کا بوسہ لے لیں اور حسن اتفاق سے ایک بار ان کو یہ موقع نصیب ہو گیا۔ ایک دن حضرت اُسید لوگوں کو اپنی طرافت اور بذلہ سنجی سے محظوظ کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے خوش ہو کر اپنے ہاتھ کی انگلی ان کی کوکھ میں ہلکے سے چھوئی۔ انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ!

آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی۔ تو آپ نے کہا کہ اسید! تم مجھ سے اس کا بدلہ لے لو۔ حضرت اسید نے کہا کہ آپ کے جسم پر اس وقت قیض ہے اور جب آپ نے میرے جسم میں انگلی چھوئی تھی تب میرے بدن پر کپڑا نہیں تھا۔ یہ سن کر آپ نے جسم سے کپڑا اٹھا دیا اور حضرت اسید یہ کہتے ہوئے جسم مبارک سے چمٹ گئے اور آپ کی بغل اور کمر کے درمیانی حصہ جسم کو چومنے لگے۔

”اے اللہ کے رسول! میرے والدین آپ پر قربان ہوں۔ یہ میری ایک آرزو تھی جسے میں اپنے دل میں اس وقت سے پال رہا تھا جب سے آپ سے متعارف ہوا تھا۔ آج میری وہ دیرینہ تمنا پوری ہو گئی۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت اسید کی محبت کا جواب محبت سے دیتے تھے اور ان کی سبقت اسلام کا بہت زیادہ لحاظ کرتے تھے۔ نیز اس بات کا بھی آپ بہت خیال کرتے تھے کہ انھوں نے غزوہ احد میں اپنی جان پر کھیل کر آپ کا دفاع کیا یہاں تک کہ اس روز ان کو نیزے کے سات جان لیوا زخم آئے تھے۔ حضرت اسید کو اپنے قبیلہ میں جو قدر و منزلت حاصل تھی اس کا بھی آپ کو پورا پورا احساس تھا اسی لیے جب وہ کسی کی سفارش کرتے تو آپ ان کی سفارش ضرور قبول فرماتے تھے۔ حضرت اسید کہتے ہیں کہ ایک بار میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انصار کے ایک گھر کا ذکر کیا جو نہایت محتاج اور ضرورت مند تھا اور اس میں اکثریت نواتین کی تھی، تو رسول اللہ ص نے ارشاد فرمایا:

”اسید! تم میرے پاس اس وقت آئے ہو جب میں وہ سارا مال تقسیم کر چکا ہوں جو میرے ہاتھ میں تھا۔ اب جب تم سننا کہ میرے پاس مال آیا ہے تو ان لوگوں کا مجھ سے ذکر کرنا۔“

اس کے کچھ دنوں کے بعد جب آپ کے پاس خیبر سے مال آیا تو آپ نے اسے مسلمانوں میں تقسیم فرمایا اور خاص طور سے انصار کو اور اس گھر والوں کو کاغی مقدار میں مال دیا تو میں نے کہا:

”اے اللہ کے نبی! اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی طرف سے بہترین جزا دے!“
تو آپ نے جواب میں فرمایا:

”انصار کے لوگو! اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو بہترین جزا دے جہاں تک میں جانتا ہوں تم لوگ صبر و تقاضی اختیار کرنے والے لوگ ہو۔ میرے بعد تم لوگوں کے حقوق نظر انداز کیے جائیں گے اور دوسروں کو تمہارے باپ پر ترجیح دی جائے گی۔ جب ایسا ہو تو تم صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے ملاقات ہو۔ ہماری ملاقات حوض پر ہوگی۔“

حضرت اسید کہتے ہیں کہ جب خلافت کی ذمہ داری حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حوالے ہوئی تو انھوں نے ایک دن مسلمانوں میں مال اور سامان تقسیم کیا اور میرے پاس ایک معمولی سا جوڑا بھیجا اور اس اثنائے میں کہ میں مسجد میں تھا۔ میری طرف سے ایک قریشی جوان کا گزر ہوا جس کے جسم پر انہی جوڑوں میں سے ایک لمبا چوڑا جوڑا تھا جسے وہ زمین پر گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے ایک ساتھی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا ذکر کیا اور اس آدمی نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر میری بات ان کو بتادی۔ وہ دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔ میں اس وقت نماز میں مشغول تھا۔ انھوں نے کہا کہ اسید! نماز پڑھ لو۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ تم نے کیا کہا تھا۔ میں نے جو کچھ کہا اور دیکھا تھا ان کے گوش گزار کر دیا تو انھوں نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائے۔ وہ جوڑا میں نے فلاں کے پاس بھینچا تھا، وہ ایک انصاری ہیں جن کو بیعت عقبہ، غزوہ بدر اور جنگ اُحد میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ ان سے وہ جوڑا اس قریشی نوجوان نے خرید کر پہنا تھا کیا تم سمجھتے ہو کہ جس بات کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو دی تھی وہ میرے زمانے میں پیش آئے گی۔“ تو حضرت اسید نے کہا:

”امیر المؤمنین! خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ وہ بات آپ کے زمانے میں نہیں پیش آئے گی۔“

حضرت اسید بن حضیرؓ اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت ہی میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے جوار رحمت میں بلا لیا۔ انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے ذمے چار ہزار درہم قرض ہے۔ ان کے ورثانے چاہا کہ قرض کی ادائیگی کے لیے ان کی زمین کو فروخت کر دیں لیکن جب حضرت عمرؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا میں اپنے بھائی اسید کے اہل و عیال کو تہی دست اور لوگوں کے لیے بار نہیں بننے دوں گا۔

پھر انھوں نے قرض خواہوں سے گفتگو کر کے ان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ان کی زمین کی پیداوار چار سال تک ایک ہزار درہم سالانہ کے حساب سے خرید لیا کریں اور اس طرح اپنا قرض وصول کریں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

اس جلیل القدر صحابی رسول نے مجد و شرف کو ہر جہت سے سمیٹ رکھا تھا۔ صحبت و قرابت اور علم و تقویٰ کے فضائل ان کے وجود میں یکجا ہو گئے تھے۔ اگر ان کی ولادت میں کھوڑی سی بھی تاخیر ہوتی ہوتی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے شرف سے محروم رہ گئے ہوتے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برادر عم زاد، امت محمدیہ کے زبردست عالم اور اس کے علم کے بحرِ آخر تھے۔ وہ دن کو روزہ رکھتے، رات بارگاہِ خداوندی میں قیام و قعود اور رکوع و سجود میں گزارتے۔ سحر تک توبہ و استغفار میں مشغول رہتے اور خشیتِ الہی سے بکثرت گریہ و زاری کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ کثرتِ گریہ سے ان کے رخساروں پر اشکوں کے نشانات نمایاں تھے۔

یہ صحابی ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ امت کے ربانی، کتاب اللہ کے عالم، اس کے معانی سے آگاہ، اس کی تہ میں اترنے والے اور اس کے رموز و اسرار اور حقائق و غوامض کو اچھی طرح سمجھنے والے۔ اس کے علاوہ انہوں نے عام مسلمانوں کے استفادہ کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہزار چھ سو ساٹھ حدیثیں بھی روایت کی ہیں، جن کو امام بخاری

۱۔ یہ حضرت ابن عباس کی کل مرویات کی تعداد ہے۔

اور امام مسلم نے صحیحین میں ثبت کیا ہے۔

ولادت کے بعد ان کی والدہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئیں اور آپ نے اپنا لعاب مبارک ان کے ہاتھ میں ڈالا۔ اس طرح سب سے پہلی چیز جو ان کے منہ میں رہ گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب مبارک تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی حکمت و پرہیزگاری بھی ان کے اندر داخل ہوئی۔

وَمِنْ يَمُوتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ
شَيْراً كَثِيراً۔
اور جس کو حکمت عطا کی گئی، اس کو
بہت زیادہ خیر مرحمت کیا گیا۔

خانوادہ بنی ہاشم کے اس نونہال نے جب سن ششور کی سرحد میں قدم رکھا اور ہوش و خرد کی آنکھیں کھولیں تو خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں پایا اور اس نے اسے اس طرح لازم پکڑ لیا جیسے آسمان کی دونوں آنکھیں ہمیشہ ایک دوسری کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کا ارادہ کرتے تو یہ ان کے لیے وضو کا پانی لاتا، جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو یہ آپ کے پیچھے نماز پڑھتا اور جب آپ سفر پر روانہ ہوتے تو یہ سواری پر آپ کے پیچھے بیٹھتا۔ غرض سانس کی طرح ہر وقت آپ کے ساتھ لگا رہتا۔ اور اس کے ساتھ ہوتا اس کا قلب بیدار، اس کا ذہن صافی اور اس کا غیر ذہولی حافظہ، جس کے سامنے ہر چیز حاضر کے تمام آلات منبسط و اندارج بیچ ہیں۔

حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کا ارادہ فرمایا۔ میں نے جھٹ پٹ پانی کا انتظام کر دیا۔ آپ بہت خوش ہوئے۔ پھر جب آپ نے نماز کا قصد فرمایا تو مجھے اپنی بغل میں کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ لیکن میں آپ کی بغل میں کھڑا ہونے کے بجائے پیچھے کھڑا ہوا۔ نماز

ختم کر کے آپ نے میری طرف رخ کرتے ہوئے فرمایا۔

”عبداللہ! تم میرے برابر میں کیوں نہیں کھڑے ہوئے؟“

”اے اللہ کے رسول!“ میں نے بڑے ادب سے جواب دیا۔ ”آپ کی شخصیت میری نظر میں اس سے بہت بلند و برتر ہے کہ میں آپ کے برابر میں کھڑا ہوتا۔“

میرا یہ جواب سن کر آپ نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے دعا فرمائی۔

”اللَّهُمَّ آتِهِ الْبِحِكْمَةِ“ ”خدا یا! اے حکمت و بصیرت عطا فرما۔“

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی اس دعا کو شرف قبولیت سے نوازا۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ایسی حکمت و بصیرت عطا فرمائی جس کے ذریعہ وہ بڑے بڑے حکماء اور ارباب فہم و بصیرت کے فائق و ممتاز ہو گئے۔ یقیناً آپ ان کی حکمت و دانائی کی ایک جھلک دیکھنا پسند کریں گے۔ اس کے لیے آپ میرے ساتھ اس جگہ کھڑے ہو جائیں۔ یہاں سے آپ اپنی پسندیدہ چیز دیکھ سکیں گے۔

جب حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے اختلاف کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کچھ حامیوں نے ان سے غلیحہ کی اختیاء کر لی اور ان کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو گئے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا۔

”امیر المؤمنین! اگر آپ اجازت دیں تو میں ان لوگوں کے پاس جا کر اس معاملے میں ان سے گفتگو کروں۔“

”مجھے اندیشہ ہے کہ میں وہ تم کو کوئی نقصان نہ پہنچا دوں۔“ حضرت علیؓ

نے جواب دیا۔

”خدا نے چاہا تو اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوگی۔“ انھوں نے

اطمینان سے کہا۔

پھر وہ اُن کے پاس پہنچے۔ وہ لوگ بڑے عابد و زاہد اور نہایت عبادت گزار تھے۔ انھوں نے اس سے پہلے اُن سے زیادہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہنے والے لوگ نہیں دیکھے تھے۔ خوارج نے اُن کا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور تشریف آوری کا سبب دریافت کیا۔ اور جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں آپ لوگوں سے گفتگو کرنے آیا ہوں تو ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ ان سے گفتگو نہ کرو لیکن باقی لوگوں نے کہا کہ فرمائیے ہم آپ کی باتیں سُننے کے لیے تیار ہیں۔ تب حضرت ابن عباس نے فرمایا۔

”یہ بتائیے کہ آپ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم، اُن کے داماد اور سب سے پہلے ایمان لانے والے شخص (حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے کس بات پر ناراض ہیں؟“

”ہم کو ان کی تین باتیں ناپسند ہیں۔“ انھوں نے جواب دیا۔
 ”وہ کون سی تین باتیں ہیں؟“ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا۔
 ”پہلی بات تو یہ ہے،“ انھوں نے گناتے ہوئے کہا۔ ”کہ انھوں نے اللہ کے دین کے معاملے میں انسانوں کو حکم تسلیم کر لیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا اور معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ کی لیکن نہ تو انھوں نے مالِ غنیمت پر قبضہ کیا نہ جنگی قیدیوں کو گرفتار کیا اور تیسری بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نام سے امیر المومنین کا لقب ہٹا دیا، حالانکہ مسلمانوں نے

ان سے بیعت کی تھی اور انھیں امیر منتخب کیا تھا۔
 یہ سن کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان سے دریافت کیا کہ ”اگر
 میں آپ لوگوں کی ان باتوں کا جواب کتاب اللہ اور حدیث رسولؐ سے
 دے دوں تو کیا آپ لوگ اپنے موجودہ موقف کو ترک کر کے امیر المؤمنینؓ کی
 مخالفت سے باز آجائیں گے؟“

انھوں نے کہا کہ ”اگر ہم آپ کی باتوں سے مطمئن ہو گئے تو ان کی مخالفت
 ترک کر کے ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔“

”آپ لوگوں کا پہلا اعتراض یہ ہے“ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ”کہ
 حضرت علیؓ نے اللہ کے دین کے معاملے میں انسانوں کو حکم مان لیا، تو صنیعے
 اس سلسلہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا
 الصَّيْدَ وَ أَنْتُمْ حُرْمٌ. وَمَنْ
 قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُ
 مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعْمِ يَحْكُمُ
 بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ.
 (مائدہ - ۹۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، احرام کی
 حالت میں شکار نہ مارو، اور اگر تم میں سے
 کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور
 اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور کے
 مویشیوں میں سے نذر کرنا ہوگا جس کا فیصلہ
 تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے۔

میں آپ لوگوں سے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ انسانوں کے خون اور
 ان کی جانوں کی حفاظت اور ان کے درمیان صلح صفائی کرنے کے لیے انسانوں
 کو حکم مان لینا زیادہ بہتر ہے یا ایک خرگوش کے معاملے میں، جس کی قیمت بہ شکل
 چوتھائی درہم ہوتی ہے۔“ انھوں نے کہا کہ ”مسلمانوں کو خون ریزی سے
 بچانے اور ان کے مابین صلح صفائی کرانے کے لیے حکم مان لینا زیادہ بہتر ہے۔“

”تو گویا یہ مسئلہ صاف ہو گیا؟“ حضرت ابن عباسؓ نے ان سے دریافت کیا۔

”ہاں یہ مسئلہ صاف ہو گیا۔“ انھوں نے جواب دیا۔

”اب رہا آپ لوگوں کا یہ اعتراض،“ انھوں نے سلسلہ کلام آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ ”کہ حضرت علیؓ نے جنگ کی مگر انھوں نے جنگی قیدی نہیں پکڑے جیسے کہ رسول اللہؐ نے پکڑے تھے۔ تو کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ اپنی ماں عائشہؓ کو گرفتار کر کے جنگ میں گرفتار ہونے والی دوسری عورتوں کی طرح انھیں اپنے لیے حلال کر لو؟ اگر تمہارا جواب اثبات میں ہے تو تم کافر ہو گئے۔ اور اگر تم کہتے ہو کہ وہ ہماری ماں نہیں ہیں، تو اس صورت میں بھی تم کفر کے مرتکب ہوئے۔ کیوں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ۔
بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے، اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔ (الاحزاب - ۶)

تو اپنے لیے ان دو صورتوں میں سے جو چاہو پسند کر لو۔

پھر انھوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ مسئلہ بھی صاف ہو گیا؟

انھوں نے آپ کے جواب سے مطمئن ہوتے ہوئے کہا: ”ہاں، یہ مسئلہ بھی صاف ہو گیا۔“

آخری اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔

”رہا تمہارا یہ اعتراض کہ حضرت علیؓ نے اپنے نام سے ”امیر المؤمنین“ کا

لقب حذف کر دیا تو ایسا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وقت

کیا تھا، جب آپ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر صلحنامہ مرتب کراتے ہوئے

فرمایا تھا کہ لکھو۔

هَذَا مَا قاضى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ يه وه صلحنامہ ہے جسے محمد رسول اللہ نے طے کیا، تو قریش کے نمائندے نے اعتراض اٹھاتے ہوئے کہا کہ ”اگر ہم کو یہ تسلیم ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو نہ ہم آپ کو بیت اللہ سے روکتے نہ کبھی آپ سے قتال کرتے۔ آپ محمد رسول اللہ کی جگہ محمد بن عبد اللہ لکھوائیے!“ تو آپ نے یہ کہتے ہوئے ان کا یہ ناجائز مطالبہ تسلیم کر لیا کہ

”وَاللّٰهُ اِنِّى لَرَسُوْلُ اللّٰهِ دَانَ
كذَّبْتُمُوْنِىْ“
ہا تم میری تکذیب کرو۔“

اپنی بات مکمل کرتے ہوئے جب حضرت عبد اللہ بن عباس نے ان سے پوچھا کہ کیا تمہارے اس اعتراض کا بھی تشفی بخش جواب مل گیا ہے تو انہوں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا کہ ہاں، ہم کو پورے طور پر اطمینان حاصل ہو گیا۔ اس ملاقات اور حضرت ابن عباس کی پرزور، مدلل اور حکمت و بصیرت سے بھرپور اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے بیس ہزار افراد حضرت علیؓ کی طرف واپس آگئے۔ البتہ چار ہزار آدمیوں نے حضرت علیؓ سے عناد و دشمنی اور حق و انصاف سے اعتراض کی بنا پر اپنے پچھلے موقف پر اڑے رہنا پسند کیا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی کم سن اور نو عمری کے باوجود حصول علم کے ہر طریقے کو اختیار کیا اور اس راہ میں انتہائی جان فشانی اور ان تھک محنت سے کام لیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چشمہ صافی سے آپ کی زندگی بھر سیراب ہوتے رہے۔ آپ کے وصال کے بعد وہ باقی ماندہ علماء صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے

بھر پورا استفادہ کیا۔ وہ اپنے شوقِ علم کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
 ”جب کسی صحابی کے متعلق مجھے معلوم ہوتا کہ ان کے پاس رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہے تو میں قیلو لہ کے وقت دوپہر میں ان
 کے دروازے پر پہنچ جاتا۔ اور اپنی چادر کو سرہانے رکھ کر ان کے گھر کی
 چوکھٹ کے پاس لیٹ جاتا۔“

اس وقت دوپہر کی تیز اور گرم ہوائیں بہت سا گرد و غبار اڑا کر میرے
 اوپر ڈال دیتیں۔ حالانکہ اگر میں ان کے گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت
 مانگتا تو مجھے اس کی اجازت مل جاتی۔ لیکن میں ایسا اس لیے کرتا تھا کہ ان
 طبیعت مجھ سے خوش ہو جائے۔ جب وہ صحابی گھر سے نکلے اور مجھے اس
 حال میں دیکھتے تو کہتے۔

”ابنِ عم رسول! آپ نے کیوں یہ زحمت گوارا کی۔ آپ نے میرے
 یہاں اطلاع بھجوا دی ہوتی۔ میں خود حاضر ہو جاتا۔“
 لیکن میں ان کو جواب دیتا۔

”میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا زیادہ حقدار ہوں۔ کیونکہ
 حصولِ علم کے لیے صاحبِ علم کے پاس جایا جاتا ہے۔ صاحبِ علم خود
 طالبِ علم کے پاس نہیں جایا کرتے۔“
 پھر میں ان سے حدیث پوچھتا۔

وہ طلبِ علم میں جس طرح خاکساری و تواضع سے پیش آتے اسی طرح
 اہل علم و فضل کی قدر و عزت بھی کرتے تھے۔

یہ ہیں کاتبِ وحی اور قضا، فقہ، قرأت اور فرائض میں اہل مدینہ کے
 سب سے بڑے عالم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ وہ اپنے گھوڑے پر

سوار ہونے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہی ہاشمی نوجوان عبداللہ بن عباسؓ ان کے سامنے ان کی رکاب تھام کر اور ان کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر یوں کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ ان سے کہتے ہیں۔

”اے رسول اللہؐ کے ابن عم! رکاب اور لگام چھوڑ دیجئے۔“

مگر وہ جواب دیتے ہیں کہ اسی طرح ہم کو اپنے علماء کا ادب و احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔“

حضرت زیدؓ ان سے کہتے ہیں کہ ذرا آپ مجھے اپنا ہاتھ دکھائیے۔ اور جب حضرت ابن عباسؓ اپنا ہاتھ ان کے سامنے کرتے ہیں تو وہ جھک کر اسے چومتے ہوئے کہتے ہیں۔

”اور ہمیں اپنے نبیؐ کے اہل بیت کے ساتھ اسی طرح تکریم و تعظیم کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔“

وہ طلب علم کی راہ میں اپنی سعی پیہم کے نتیجے میں مسلسل آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ وہ علم کے بہت اونچے مقام پر پہنچ گئے جس نے بڑے بڑے اہل علم کو حیرت زدہ کر دیا۔ حضرت مسروق بن اجدع جن کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے۔ ابن عباسؓ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ”جب میں ابن عباسؓ کو دیکھتا تو کہتا یہ سب سے خوبصورت شخص ہیں۔ جب وہ بولتے تو کہتا یہ سب سے فصیح ہیں اور جب حدیث بیان کرتے تو کہتا یہ سب سے زبردست عالم ہیں۔“

حضرت ابن عباسؓ جب ان تمام مطلوبہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے جنہیں وہ حاصل کرنا چاہتے تھے تو وہ ایک معلم بن گئے اور ان کا مکان مسلمانوں

کے لیے ایک یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ جی ہاں! ان کا مکان ہراس
 معنی میں یونیورسٹی بن گیا جس معنی میں آج یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ البتہ جامعہ
 ابن عباس اور ہماری ان جامعات میں یہ فرق ہے کہ آج کی یونیورسٹیوں
 میں دسیوں نہیں سیکڑوں اساتذہ ہوتے ہیں، جبکہ جامعہ ابن عباس کی ساری
 ذمہ داریاں تنہا ایک استاد کے کندھوں پر تھیں اور وہ خود ابن عباس تھے۔
 ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ میں نے ابن عباسؓ کی ایک ایسی
 علمی مجلس دیکھی ہے کہ اگر اس پر قریش کے تمام لوگ فخر کریں تو ان کا فخر
 کرنا بجا ہوگا۔ میں نے دیکھا کہ ابن عباسؓ کے گھر کی طرف جانے والے
 سارے راستوں میں لوگوں کا اس قدر ازدحام ہے کہ وہ راستے دوسرے آنے
 جانے والوں کے لیے مسدود ہو گئے ہیں۔ میں نے اندر جا کر ان سے لوگوں
 کے ان کے دروازے پر جمع ہونے کا حال بتایا تو انھوں نے فرمایا کہ وضو کے
 لیے پانی رکھو۔ میں نے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ انھوں نے وضو کیا اور اپنی نشست
 گاہ پر بیٹھتے ہوئے فرمایا کہ جاؤ اور جا کر لوگوں سے کہو کہ جو شخص قرآن اور اس
 کے الفاظ کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہے وہ اندر آجائے۔ میں نے باہر نکل کر
 یہ اعلان کر دیا۔ اور لوگ بڑی تعداد میں اندر آ گئے یہاں تک کہ پورا مکان اور
 کمرہ ان سے بھر گیا۔ ان میں سے جس نے جو بھی سوال کیا، انھوں نے اس
 کے سوال کا اطمینان بخش جواب دیا۔ بلکہ اس کے سوال کے علاوہ انھوں
 نے مزید بہت سی باتیں بھی بتائیں۔ پھر ان سے کہا کہ اب اپنے دوسرے
 بھائیوں کے لیے راستہ صاف کر دو۔ یہ سن کر وہ لوگ باہر نکل گئے۔
 پھر انھوں نے مجھے حکم دیا کہ باہر جا کر لوگوں سے کہو کہ جو شخص قرآن
 کی تفسیر اور اس کی تاویل سے متعلق کوئی سوال کرنا چاہتا ہے، وہ اندر

آجائے۔ میں نے باہر نکل کر یہ اعلان کیا اور لوگ بڑی تعداد میں اندر آگئے اور پورا مکان اور کمرہ بھر گیا۔ پھر ان میں سے جس نے جو بھی سوال کیا، انہوں نے اس کا تسلی بخش جواب عنایت فرمایا بلکہ ان کے سوالات کے علاوہ مزید بہت سی باتیں اپنی طرف سے بھی بتائیں اور پھر فرمایا کہ اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے جگہ خالی کر دو۔ چنانچہ وہ لوگ باہر چلے گئے۔

انہوں نے پھر مجھ سے کہا کہ باہر جا کر لوگوں سے کہہ دو کہ جو شخص فریضہ وغیرہ کے متعلق کچھ استفسار کرنا چاہے، وہ اندر آجائے۔ اعلان سن کر پھر لوگ بڑی تعداد میں اندر آگئے۔ اور انہوں نے جو سوالات کیے، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کے تشفی بخش جوابات دیے بلکہ ان کے سوالات کے علاوہ مزید بہت سی باتیں بھی بتائیں۔ پھر انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا اور وہ سب چلے گئے۔

پھر انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ جا کر اعلان کر دو کہ جسے عربی زبان، شعر و ادب اور کلام عرب کے غریب اور نامانوس حصوں کے متعلق کچھ دریافت کرنا ہو، وہ اندر آجائے، چنانچہ بہت سے لوگ اندر داخل ہوئے اور اندر مزید گنجائش نہ رہی۔ ان لوگوں نے جو کچھ بھی پوچھا، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کا اطمینان بخش جواب دیا۔ اور ان سوالات کے علاوہ مزید بہت سی باتیں اپنی طرف سے بھی بتائیں۔

راوی کہتا ہے کہ اگر اس پر تمام اہل قریش فخر کریں تو ان کا فخر کرنا برحق ہوگا۔

بعد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے مختلف علوم کے لیے الگ الگ دن مقرر کر دیے تاکہ ان کے دروازے پر اتنا ہجوم نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے

ہفتے میں ایک دن تفسیر، ایک دن فقہ، ایک دن منافی و سیر، ایک دن شعر و ادب اور ایک دن عرب کے گذشتہ حالات اور اس کی پھیلی جنگوں کے متعلق گفتگو اور سوال و جواب کے لیے مخصوص کر دیا۔ جو بھی اہل علم ان کی مجلس میں شریک ہوتا، ان کے علم کا معترف ہوتا اور ہر سوال کرنے والا اپنے سوال کا جواب ان کے پاس موجود پاتا تھا۔

علم و فقہ میں کامل ہونے کی وجہ سے خلفاء راشدین کم عمری کے باوجود ابن عباسؓ سے مشکل معاملات اور پیچیدہ مسائل میں مشورہ کرتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ جب بھی ان کے سامنے کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا یا کوئی پیچیدہ معاملہ سر اٹھاتا تو وہ مشورہ کے لیے اکابر صحابہؓ کو بلائے اور ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بھی طلب فرماتے۔ جب وہ دربار خلافت میں حاضر ہوتے تو انھیں اونچی جگہ پر اپنے قریب بٹھاتے اور ان سے کہتے۔ میں اس وقت ایک پیچیدہ مسئلہ سے دوچار ہوں۔ اس کو اور اس جیسے دوسرے مسائل کو تم ہی حل کر سکتے ہو۔ ایک بار تو نوعمری کے باوجود ابن عباسؓ کو آگے بڑھانے اور ان کو اکابر صحابہ کے برابر کرنے کے معاملے میں ان کے اوپر اعتراض بھی کیا گیا۔ مگر انھوں نے یہ جواب دے کر معترض کا منہ بند کر دیا۔

”إِنَّهُ، فَتَى الْكُهُولِ، لَهُ لِسَانٌ
سُئِلَ وَقَلْبٌ عَقُولٌ“

ہے، اس کے پاس سوال کرنے والی

زبان اور سمجھ دار دل ہے۔“

حضرت ابن عباسؓ خواص کی تعلیم میں مصروف ہونے کے باوجود عام مسلمانوں کے حق سے غافل نہیں تھے۔ وہ عوام الناس کے لیے وعظ و تذکیر

کی مجلسیں برابر منعقد کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنی ایک مجلس و عظ میں گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”اے گناہوں کا ارتکاب کرنے والے! اپنے گناہوں کے انجام سے

غافل نہ رہ۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ گناہ کا نتیجہ خود گناہ سے بھی زیادہ

خطرناک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ارتکاب گناہ کے وقت اپنے دائیں بائیں موجود

فرشتوں سے تیرا حیا نہ کرنا گناہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور گناہ کرتے

وقت تیرا ہنسا، گناہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ حالانکہ تجھ کو معلوم نہیں

ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ بے شک ارتکاب

گناہ میں کامیابی پر تیرا خوش ہونا، گناہ سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اور

ارتکاب گناہ میں ناکام ہو جانے پر تیرا افسوس کرنا، گناہ سے زیادہ ہلک ہے۔

اور ارتکاب گناہ کے وقت تیرا ہوا سے ڈر جانا، جب وہ تیرے پردے کو

ہلا دیتی ہے۔ اور اس تصور سے کہ خدائے تعالیٰ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔ تیرے

دل میں خوف و اضطراب کی ہلکی سی لہر کا پیدا نہ ہونا۔ گناہ سے بڑھ کر ہے۔

اسے گناہ گار! کیا تجھے معلوم ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی کون

سی لغزش تھی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو جسم اور مال کے سخت ترین

امتحان میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان سے صرف اتنی سی کوتاہی ہوئی تھی ایک مسکین

مظلوم شخص نے دفع ظلم کے لیے ان سے مدد کی درخواست کی تھی اور انھوں

نے اس کی مدد نہیں کی۔“

حضرت ابن عباسؓ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جن کے یہاں قول

عمل میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ان کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ لوگوں کو معروفت کا

حکم دیں اور خود اس پر عمل نہ کریں۔ دوسروں کو منکرات طے باز رہنے کی

تلقین کریں اور خود ان کا ارتکاب کریں۔ وہ دن کو بکثرت روزے رکھتے اور راتوں کو قیام کرتے تھے۔

مشہور تابعی عبداللہ بن ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ

”ایک دفعہ میں نے ابن عباس کے ساتھ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کا سفر کیا۔ دوران سفر جب ہم کسی منزل پر قیام کرتے تو اور لوگ تو مکان کی وجہ سے سو جاتے مگر ابن عباس رات کا بڑا حصہ عبادت میں گزارتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک رات کو وہ آیہ کریمہ **وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَمَيُّدٌ** کی تلاوت کر رہے ہیں۔ وہ مسلسل اسی آیت کو پڑھتے اور روتے رہے یہاں تک کہ اسی حالت میں صبح ہو گئی۔“

اس سب کے بعد ہمارے لیے اتنا جان لینا کافی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نہایت خوب صورت اور خوش رو شخص تھے۔ وہ راتوں کو ہمیشہ خدا کے خوف سے روتے رہتے تھے، یہاں تک کہ اشکوں کی مسلسل روانی سے ان کے نرم و نازک رخساروں پر دو پتلی پتلی نالیاں سی بن گئی تھیں جن کو بعض لوگ جوتے کے تسموں سے تشبیہ دیتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ علم و فضل کے انتہائی بلند مقام پر فائز تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک سال خلیفۃ المسالین حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہما حج کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ اسی سال حضرت ابن عباسؓ بھی حج کے لیے عازم سفر تھے۔ اس زمانے میں ان کے پاس کوئی حکومتی عہدہ نہیں تھا۔ اس وقت حضرت معاویہؓ کے

لہ موت کی جان کنی حق لے کر آپہنچی، یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔ (ق - ۱۹)

جلوس میں اربابِ حکومت پر مشتمل ایک ہجوم چل رہا تھا اور ایک مجمع حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ چل رہا تھا جو طالبانِ علم پر مشتمل تھا اور حضرت ابن عباسؓ کا جلوس حضرت معاویہؓ کے جلوس سے بڑا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اہتر سال کی عمر عطا فرمائی۔ اس مدت میں انہوں نے دنیا کو علم و فہم اور حکمت و تقویٰ سے بھر دیا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی نماز جنازہ حضرت محمد بن حنفیہ نے پڑھائی اور اس میں اس وقت موجود صحابہ کرام اور اکابر تابعین نے شرکت کی۔ جس وقت لوگ ان کی قبر پر مٹی ڈال رہے تھے، انہوں نے کسی پڑھنے والے کو یہ آیت پڑھتے سنا۔

اے نفس مطمئن، چل اپنے رب کی طرف
اس حال میں کہ تو اپنے انجام نیک سے
خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ
ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں
میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمِئِنَّةُ اِرْجِعِي
إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً
فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي
جَنَّتِي۔

(الفجر، ۲۷-۳۰)

حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ

قبیلہ بنو مزینہ کی بستیاں یثرب کے قریب اس راتے پر واقع تھیں جو مدینہ اور مکہ کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے۔ اور آنے جانے والوں کے ذریعے آپ کے حالات برابر مزینہ والوں تک پہنچتے رہتے تھے۔

ایک دفعہ رات کے وقت رئیس مزینہ نعمان بن مقرن اپنی مجلس میں اپنے بھائیوں اور قبیلہ کے دوسرے سربراہوں اور لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”خدا کی قسم اب تک محمدؐ کی شخصیت کے بارے میں صرف خیر اور بھلائی کی باتیں ہی ہمارے علم میں آئی ہیں اور ان کی دعوت کے متعلق ہم نے اب تک صرف رحمت و مہممت اور احسان و عدل کی باتیں ہی سنی ہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم لوگ ان کی دعوت کو قبول کرنے میں دیر کر رہے ہیں جب کہ دوسرے لوگ تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپک رہے ہیں۔“ انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”میں خود صبح تڑپ کے ان کے پاس جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ تم میں سے جو لوگ میرے ساتھ چلنا چاہیں وہ تیار ہو جائیں۔“

نعمان کی یہ باتیں حاضرین مجلس کے دلوں میں گھر گھریں۔ انہوں نے صبح

کو دیکھا کہ ان کے دسوں بھائی اور بنو مزینہ کے چار سو سوار ان کے ساتھ مدینہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے اور اللہ کے دین میں داخل ہونے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ مگر نعمان کو اتنے بڑے وفد کے ساتھ نبی کریم اور مسلمانوں کے لیے کوئی ہدیہ ساتھ لیے بغیر خالی ہاتھ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے میں شرم محسوس ہو رہی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ عالیہ خشک سالی نے جو ابھی جلد ہی بنو مزینہ پر گزری تھی ان کی تمام نسلوں اور مویشیوں کو تباہ کر ڈالا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنے اور اپنے بھائیوں کے گھروں کے چکر لگائے اور ان تمام بکریوں کو اکٹھا کیا جو قحط سے بچ گئی تھیں۔

وہ انہیں اپنے آگے ہانکتے ہوئے نبی کریم کی خدمت میں لائے اور انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے رسول اللہ کے سامنے اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ نعمان بن مقرن اور ان کے ساتھ والوں کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر مدینے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اس لیے کہ اب تک عرب کے کسی ایک گھر کے گیارہ سگے بھائی اور ان کے ساتھ چار سو سوار بیک وقت دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت نعمان بن مقرن کے مسلمان ہونے کی وجہ سے بے حد خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی بکریوں کو قبول فرمایا اور ان کے متعلق قرآن کی یہ آیت نازل فرمائی۔

وَمِنَ الْأَعْدَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ
اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں
جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہیں اور

قُرْبَتِ عِنْدَ اللَّهِ وَسَلَوَاتِ
الرَّسُولِ إِلَّا تَهَابَرْتُمْ لَعْنَةُ اللَّهِ
عَلَيْكُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَحِيمٌ ۝

جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں
تقرب کا اور رسول کی طرف سے رحمت
کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں!
وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے۔

(توبہ - ۹۹) اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل

کرنے گا۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔
حضرت نعمان ابن مقرنؓ پرچم رسول کے زیر سایہ آگے اور وہ کسی تازی اور
کوٹاہی کے بغیر رسول اللہ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوتے رہے۔
اور جب خلافت کی ذمہ داریاں حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اوپر آن پڑیں تو
انہوں نے اور ان کے قبیلہ مزینہ نے خلوص و ایمان کے ساتھ ان کا ساتھ دیا
اور فتنہ ارتداد کے استیصال میں اہم اور مؤثر رول ادا کیا اور پھر جب حضرت
عمر ابن خطابؓ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو ان کے دور میں بھی
انہوں نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جن کے ذکر میں تاریخ ہمیشہ
رطب اللسان رہے گی۔

قادسیہ میں ایرانیوں کے ساتھ معرکہ آرائی سے چند روز قبل لشکر مجاہدین
کے قائد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے
حضرت نعمان ابن مقرنؓ کی قیادت میں ایک وفد کسریٰ یزدگرد کے پاس بھیجا
جب یہ وفد ایران کے دارالسلطنت مدائن پہنچا تو اس نے دربار شاہی میں
داخلے کی اجازت چاہی۔ کسریٰ نے انہیں اجازت دی پھر اپنے ترجمان کو
بلا کر اس سے کہا۔

”ان سے دریافت کر دو کہ تم ہمارے ملک میں کس غرض سے آئے ہو“

اور کس چیز نے تمہیں ہمارے ساتھ جنگ کرنے پر اکسایا ہے۔ شاید تم لوگوں کے اندر ہمارے ملک پر حملہ کرنے کی جرأت اور اس پر قبضہ کرنے کی خواہش اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ہم اپنی مصروفیات کے باعث تمہاری طرف سے غافل ہو گئے۔“

حضرت نعمان ابن مقرنؓ نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
 ”اگر تم لوگ چاہو تو میں تمہاری طرف سے جواب دوں، اور اگر تم میں سے کوئی بولنا چاہتا ہو تو میں اسے اپنے آپ پر ترجیح دوں گا۔“
 ”نہیں آپ ہی جواب دیں!“ سب نے ایک زبان ہو کر کہا اور پھر ان لوگوں نے کسریٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
 ”یہ ہم سب لوگوں کی طرف سے جواب دیں گے۔ تم ان کی باتیں بغور سنو۔“

حضرت نعمانؓ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور اس کے رسولؐ پر درود و سلام بھیجا پھر کہا۔

”اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر رحم فرمایا۔ ہمارے پاس ایک رسولؐ بھیجا جس نے خیر کی طرف ہماری رہنمائی کی اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ ہمیں شر سے آگاہ کیا اور اس کے ارتکاب سے روکا۔ اور ہم نے اس بات کا وعدہ فرمایا کہ اگر ہم اس کی دعوت کو قبول کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ ہم کو دنیا اور آخرت کی بھلائی عطا فرمائے گا۔ ہم نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور زیادہ مدت نہیں گزری کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری تنگی کو کشادگی سے، ہماری ذلت کو عزت سے اور ہماری باہمی دشمنی کو بھائی چارگی اور مرحمت میں تبدیل کر دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس بات کا بھی حکم دیا کہ ہم دوسرے لوگوں کو بھی اس دین کی دعوت دیں جس میں ان کی بھلائی کا راز پوشیدہ ہے

انہوں نے ہم کو اس بات کا بھی حکم دیا کہ ہم اس کام کا آغاز اپنے پڑوس کے لوگوں سے کریں۔ اس لیے ہم تم لوگوں کو اس دین میں داخل ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ ایسا دین ہے جس نے ساری بھلائی کی باتوں کی تحسین کی ہے اور ان کی قبولیت پر ابھارا ہے اور تمام برائیوں کو برائی قرار دیا ہے اور ان سے اجتناب کرنے کی تاکید کی ہے۔ وہ اپنے قبول کرنے والوں کو کفر اور ظلم و جور کی تاریکی سے نکال کر نور ایمان اور عدل و انصاف کی روشنی میں داخل کرتا ہے۔ اگر تم ہماری دعوت کو قبول کر لو گے تو ہم تمہارے سامنے اللہ کی کتاب کو پیش کریں گے اور تم کو اس پر قائم کریں گے تاکہ تم اس کے مطابق حکومت کرو اور پھر ہم تم کو تمہارے حال پر چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے۔ لیکن اگر تم نے خدا کے دین میں داخل ہونے سے انکار کیا تو ہم تم سے جزیہ وصول کریں گے اور اس کے بدلے میں تمہاری حفاظت اور حمایت کریں گے اور اگر تم نے جزیہ دینے سے انکار کیا تو پھر تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔“

یزدگرد حضرت نمان ابن مقرن کی یہ تقریر سن کر غیباً غضب سے مشتعل ہو گیا اور بولا۔

”میں رُوئے زمین پر کسی ایسی قوم کو نہیں جانتا جو تم سے زیادہ بد بخت، تم سے زیادہ قلیل التعداد اور تم سے زیادہ غیر منظم و بد حال ہو۔ ہم تمہارے معاملے کو اپنے سرحدی حاکموں کے حوالے کر دیتے تھے جو ہمارے لیے تم سے طاعت کا عہد لیتے تھے۔“ پھر اس نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم اپنی تنگدستی اور مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ادھر آتے ہو تو ہم تمہارے علاقے میں خوشحالی کے واپس آنے تک تمہاری فروریاست کا

بندوبست کر دیں گے، تمہاری قوم کے سرداروں کو خلعت سے نوازیں گے اور تمہارے اوپر اپنی طرف سے کسی ایسے شخص کو حاکم مقرر کر دیں گے جو تمہارے ساتھ نرمی کرے گا۔“

ارکان وفد میں سے ایک شخص نے اس کی اس بات کا ایسا سخت اور دندان شکن جواب دیا کہ جس کو سن کر اس کے غیظ و غضب کی آگ از سر نو بھڑک اٹھی اس نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا۔

”اگر قاصدوں کا قتل غلط نہ ہوتا تو میں تم لوگوں کو قتل کرا دیتا۔ اٹھو اور چلے جاؤ یہاں سے۔ اب میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور جا کر اپنے قائد سے بتا دینا کہ میں اس کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے رستم کو بھیج رہا ہوں جو اسے اور تم سب کو ایک ساتھ قادیسیہ کے خندق میں دفن کر دے گا۔ پھر اس نے مٹی سے بھری ہوئی ایک ٹوکری لانے کا حکم دیا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ ”یہ ٹوکری اس شخص کے سر پر رکھ دی جلتے جوان ہیں سب سے زیادہ معزز ہے۔ اور انھیں لوگوں کی نگاہوں کے سامنے شہر کے دروازوں کے باہر نکال دیا جائے۔“

انھوں نے وفد سے پوچھا کہ ”تم میں سب سے زیادہ معزز کون شخص ہے؟“

حضرت عاصم ابن عمر نے جلدی سے کہا۔ ”میں“

یزدگرد کے آدمیوں نے مٹی سے بھری ہوئی وہ ٹوکری ان کے سر پر رکھ دی اور وہ اسے لے کر مذاق سے نکل گئے پھر اسے اپنی اذیت پر رکھ کر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی خدمت میں لائے اور ان کو اس بات کی خوشخبری دی کہ اللہ تعالیٰ عنقریب مسلمانوں کو فتح عطا فرمائے گا اور ایران کی

زمین پر ان کو قبضہ دے گا۔

اس کے بعد قادسیہ کا وہ زبردست محرکہ پیش آیا جس نے اس کی خندق کو مقتولین کی لاشوں سے پاٹ دیا۔ لیکن وہ لاشیں مسلمان فوجیوں کی نہیں، کسریٰ کے لشکریوں کی تھیں۔

قادسیہ کی اس شرمناک ہزیمت اور عبرتناک شکست کے بعد بھی ایرانیوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ انھوں نے از سر نو اپنی منگشتر جمعیت کو یکجا کیا اور نئے سرے سے ان کو ترتیب دیا یہاں تک کہ منتخب اور آزمودہ کار سپاہیوں پر مشتمل ایک بہترین فوج تیار ہو گئی جس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔ جب حضرت عمر فاروقؓ کو ایرانیوں کی ان فوجی تیاریوں کا علم ہوا تو انھوں نے بہ نفس نفیس اس عظیم خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے محاذ جنگ پر جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن ذی رائے اور سربراہ اورده صحابہ نے انھیں اس ارادے سے باز رکھا اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ اس زبردست مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری کسی قابل اعتماد شخص کے سپرد کر دیں۔

”تو پھر تجھے کسی ایسے آدمی کے متعلق مشورہ دو جس کو پورے اعتماد کے ساتھ یہ زبردست ذمہ داری سونپی جاسکے“ خلیفہ نے فرمایا۔

”امیر المؤمنین! آپ اپنی سپاہ کو ہم سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں“ صحابہ نے جواب دیا۔

”خدا کی قسم میں شکر مجاہدین کی قیادت ایک ایسے شخص کے سپرد کروں گا جو دو فوجوں میں بڑے ہیٹر کے وقت۔ نیزے کی انی سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ پکینے والا ہے۔ وہ نعمان ابن مقرن مزنی ہیں“ حضرت عمر نے فرمایا۔

”یقیناً وہ اس مہم کے لیے آپ کا مناسب ترین انتخاب ہیں!“ صحابہؓ نے جواب دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت نعمان بن مقرنؓ کو لکھا۔

”اللہ کے بندے عمر بن خطابؓ کی طرف سے نعمان بن مقرنؓ کے نام۔“

اما بعد! مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایرانیوں کی ایک زبردست جمعیت تمہارے مقابلے کے لیے ہنہاوند میں مجتمع ہوئی ہے۔ جب میرا یہ خط تم کو ملے تو لشکر مجاہدین کو اپنے ساتھ لے کر اللہ کے حکم سے، اس کی نصرت و تائید پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے مقابلے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ اور دیکھو! مسلمانوں کو

لے کر کسی دشوار گزار اور تکلیف دہ راستے سے ہرگز سفر نہ کرنا جس سے وہ تکلیف و اذیت میں مبتلا ہو جائیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کا ایک ایک

فرد میرے نزدیک ہزاروں دینار سے بہتر ہے۔ والسلام علیک۔“

حضرت نعمان بن مقرنؓ کو امیر المومنینؓ کا یہ خط ملا تو وہ اپنے لشکر کو لے کر دشمن کے مقابلے کے لیے نکل پڑے۔ انھوں نے سواروں کا ایک دستہ ہراول کے طور پر آگے روانہ کر دیا تاکہ وہ راستے میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرتا جائے۔ جب سواروں کا یہ دستہ ہنہاوند کے قریب پہنچا تو ایک جگہ پہنچ کر ان کے گھوڑے رک گئے۔ سواروں نے انھیں آگے بڑھانے کی بہتری کو شمش کی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ معاملے کی تحقیق کے لیے نیچے اترے۔ دیکھا تو گھوڑوں کے ٹسموں میں لوہے کے گوکھرو چھبے ہوئے ہیں۔ جو کیلوں کے سروں سے مشابہ ہیں۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایرانیوں نے زمین پر ہنہاوند کی طرف جانے والے تمام راستوں میں لوہے کے یہ گوکھرو بکھیر رکھے ہیں۔ تاکہ سواروں اور پیدل چلنے والوں کو ہنہاوند تک پہنچنے سے باز رکھیں۔

سواروں نے اس صورت حال سے حضرت نعمان بن مقرنؓ کو آگاہ کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس سلسلے میں انھیں اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔ حضرت نعمانؓ نے انھیں حکم بھیجا کہ وہ اپنی جگہ ٹھہرے رہیں۔ اور رات کے وقت آگ روشن کریں تاکہ دشمن انھیں دیکھ لیں اس کے بعد بظاہر دشمن سے خوف زدگی کا اظہار کرتے ہوئے پسپائی اختیار کریں تاکہ دشمن ان پر حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھیں اور لوہے کے جو گوگرد انھوں نے بکھیر رکھے ہیں ان سے راستوں کو صاف کرادیں۔

حضرت نعمانؓ کی یہ تدبیر کامیاب ثابت ہوئی۔ ایرانیوں نے جیسے ہی یہ دیکھا کہ مسلمانوں کا یہ ہراول دستہ ان کے سامنے سے شکست کھا کر پسپا ہو رہا ہے تو انھوں نے اپنے آدمیوں کو ان راستوں کی صفائی کرنے کے لیے بھیج دیا۔ اور انھوں نے جھاڑو دے کر تمام راستوں کو ان گوگردوں سے صاف کر دیا۔ اس کے بعد مسلمان سوار تیزی سے مرطے اور تمام راستوں پر قابض ہو گئے۔

حضرت نعمانؓ بن مقرنؓ اپنی فوج کے ساتھ نہادند کے بالائی حصے کی طرف خیمہ زن ہو گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دشمن پر اس کی بے خبری کے عالم میں اچانک حملہ کیا جائے۔ اس لیے انھوں نے اپنے فوجیوں سے فرمایا کہ ”میں تین تکبیریں کہوں گا۔ جب میں پہلی تکبیر کہوں تو جو شخص تیار نہ ہو وہ تیار ہو جائے۔ جب دوسری تکبیر کہوں تو تم میں سے ہر شخص اپنی اپنی تلوار بے نیام کرے۔ اور تیسری تکبیر کہتے ہی میں ان دشمنانِ خدا پر حملہ کر دوں گا۔ اسی وقت تم لوگ بھی میرے ساتھ حملہ کر دینا۔“

حضرت نعمان بن مقرنؓ نے پے درپے تین تکبیریں کہیں۔ اور

آخری تکبیر کے ساتھ ہی وہ ایک بھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن کی صفوں پر جھپٹ پڑے۔ ان کے پیچھے ہی مسلمانوں کا لشکر بھی سیلاب کی تیزی کے ساتھ بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ اور پھر دونوں فوجیں باہم ٹکرائیں، ان کے درمیان جنگ کی چکی تیزی کے ساتھ چلنے لگی اور فریقین کے مابین ایسائوں ریز اور ہلاکت آفریں معرکہ چھڑ گیا جس کی مثال جنگوں کی تاریخ میں بہت کم گزری ہوگی۔ آخر کار ایرانیوں کا لشکر بڑی طرح سے منتشر اور پراگندہ ہو گیا۔ میدان نہادند کے تمام نشیب و فراز ان کے مقتولین کی لاشوں سے پٹ گئے اور ان کا خون تمام گزرگا ہوں اور راستوں میں بہنے لگا۔ حضرت نعمان بن مقرن کا گھوڑا اس میں پھسل کر گر پڑا۔ حضرت نعمان بھی گھوڑے سے گرنے اور شدید طور پر زخمی ہو گئے۔ اور آخر کار زخموں کی تاب نہ لا کر اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے بھائی نے علم اپنے ہاتھ میں سنبھالا اور ان کی لاش کو ایک چادر سے چھپا دیا۔ اور ان کی شہادت کو مسلمانوں سے پوشیدہ رکھا۔ جب یہ فتح عظیم اپنے پایہ تکمیل کو پہنچ گئی جس کو مسلمانوں نے فتح الفتوح کا نام دیا تھا۔ تو منظر و منصور سپاہ نے اپنے بہادر سپہ سالار حضرت نعمان بن مقرن کے متعلق دریافت کیا۔ تو ان کے بھائی نے ان کی لاش پر سے چادر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”یہ ہیں تمہارے امیر۔ اللہ تعالیٰ نے فتح و کامرانی سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی ہے اور آخر کار انھیں دولت شہادت سے نوازا ہے۔“

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ

ہم میں سے ہر مسلمان حضرت صہیب رومیؓ کے نام سے واقف اور ان کی زندگی کے حالات سے کسی نہ کسی حد تک آگاہ ہے۔ البتہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو شاید اس بات کا علم نہ ہو کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ رومی نہیں، نہ اثنائاً عربی النسل تھے۔ ان کے والد کا تعلق قبیلہ بنو نمیر اور ان کی والدہ کا تعلق قبیلہ بنو تمیم سے تھا۔ حضرت صہیبؓ روم کی طرف کیسے منسوب ہوئے، اس کے پس منظر میں ایک ناقابل فراموش کہانی ہے، جو تاریخ کے حافظے میں ہمیشہ محفوظ رہے گی اور اس کے صفحات برابر اس کو بیان کرتے رہیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً دو دہائی پہلے کی بات ہے، کسریٰ شاہ ایران کی طرف سے سنان بن مالک "ابو" کا گورنر تھا۔ وہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت اپنے بچے صہیب سے کرتا تھا جس کی عمر اس وقت پانچ سال سے متجاوز نہ تھی۔

صہیب کا چہرہ روشن و تابناک اور اس کے بالوں کا رنگ سُرخ مائل تھا۔ چہرے بشرے سے تازگی و شادمانی ٹپکتی تھی اور اس کی روشن آنکھیں ذہانت و نجابت کی آئینہ دار تھیں۔ اس کے علاوہ وہ نہایت چست و چالاک اور پاک نفس و نیک سرشت بچہ تھا۔ اس کو دیکھتے ہی باپ کا دل پارغ

باغ ہو جاتا اور دل سے حکمرانی کی ساری پریشانیاں دور ہو جاتی تھیں۔ ایک دفعہ صہیب کی ماں اپنے خوردسال بچے اور تھدام و ملازمین کی ایک جماعت کے ساتھ آرام اور سیر و تفریح کے ارادے سے عراق کی ایک بستی "تینجی" کے لیے روانہ ہوئی۔ اس بستی پر رومی فوج کے ایک دستے نے اچانک حملہ کر دیا۔ اس کے محافظوں کو قتل کر کے مال و اسباب لوٹ لیا اور بال بچوں کو گرفتار کرے گئے۔ ان گرفتار شدگان میں صہیب بھی تھا۔ صہیب کو بلا دروم میں غلاموں کی ایک منڈی میں لے جا کر فروخت کر دیا گیا۔ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ اور ایک آقا کی خدمت سے دوسرے آقا کی خدمت میں منتقل ہوتا رہا۔ اس معاملہ میں اس کی حالت اُن ہزاروں لونڈی غلاموں سے مختلف نہ تھی جن سے سرزمینِ روم کے حکمرانوں اور اس کے رئیسوں کے محلات بھرے ہوئے تھے۔ اس سے صہیب کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ رومی معاشرہ کے اندر گھس کر اور اس کی تہ میں اتر کر اس کے اندرونی حالات سے واقف ہو سکے اور اس کے اندر پائے جانے والے گھناؤنے عیوب سے براہِ راست آگاہی حاصل کر سکے۔ چنانچہ اس نے ان تمام فواحش منکرات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا جنہوں نے ان محلات میں اشیائے بنا رکھے تھے۔ اور اس نے اپنے کانوں سے ظلم و ستم کی وہ ساری داستانیں سنیں جو وہاں دہرائی جاتی تھیں۔ چنانچہ یہ سب کچھ دیکھنے اور سُننے کے بعد صہیب کو اس معاشرہ سے سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے دل میں سوچتا تھا کہ اس قسم کا گندہ معاشرہ کسی زبردست طوفان کے بغیر پاک نہیں ہو سکتا۔

اس کے باوجود کہ صہیب نے روم کے علاقے میں نشوونما پائی

اور اس کے باشندوں کے درمیان پل بڑھ کر جوان ہوا۔ اور اس کے باوجود کہ وہ عربی زبان کو بھول گیا تھا یا تقریباً بھول چکا تھا، یہ بات اس کے دل سے ایک لمحہ کے لیے فراموش نہیں ہوئی تھی کہ وہ عربی النسل اور ابنہ صحرا میں سے ہے۔ وہ ہر آن اُس مبارک دن کے شوق و انتظار میں رہتا تھا جس روز وہ غلامی کی ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دے گا اور اپنے قبیلے سے جا ملے گا۔ اُس نے ایک نصرانی کاہن کو اپنے ایک آقا سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ”وہ وقت اب قریب آگیا ہے جب جزیرہ عرب کے شہر مکہ سے ”وہ نبی“ ظاہر ہوگا جو عیسیٰ ابن مریم کی رسالت کی تصدیق کرے گا اور لوگوں کو گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کے اُجالوں سے روشناس کرے گا!“ اس بات نے اس کے سمند شوق کے لیے تازیانے کا کام کیا اور اس کے آتش انتظار کو مزید تیز کر دیا۔

پھر خوش قسمتی سے صہیب کو ایک سنہری موقع ہاتھ آگیا۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے آقاؤں کی غلامی کے بندھن توڑ کر بھاگ نکلا اور اس نے سیدھے نبی مُنتظر کی جائے بعثت، مرکز عرب، ام القریٰ مکہ مکرمہ کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گیا۔ اُس کی زبان میں پائی جانے والی لکنت اور اس کے سُرخ بالوں کی وجہ سے لوگ اسے صہیب رومی کہنے لگے۔ اس نے مکے کے ایک رئیس عبداللہ بن جَدعان کے ساتھ حلیفانہ روابط قائم کر لیے اور تجارتِ کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ اور اس میں اُس نے کافی دولت کمائی۔ صہیب اپنی کاروباری مصروفیات اور تجارتی سرگرمیوں کے باوجود اس نصرانی کاہن کی بات بھولا نہیں تھا۔ جب بھی اسے اس کی بات کا خیال

آنا، وہ بڑی حسرت کے ساتھ اپنے دل سے یہ سوال کرتا۔
 ”وہ واقعہ کب پیش آئے گا؟“

اور پھر تھوڑی ہی مدت کے بعد اس سوال کا مجسمہ جواب اس کے سامنے تھا۔

ایک روز صہیب اپنے ایک تجارتی سفر سے واپس مکہ پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا ہے اور وہ لوگوں کو خدائے واحد پر ایمان لانے کی دعوت اور عدل و احسان کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اور فواحش و منکرات سے منع کر رہے ہیں۔
 ”یہ وہی تو نہیں ہیں جنہیں لوگ ”امین“ کے لقب سے پکارتے ہیں؟“ صہیب نے دریافت کیا۔

”ہاں، وہی ہیں۔“ جواب دینے والے نے کہا۔

”اس وقت وہ کہاں ملیں گے؟“ صہیب نے پرشوق لہجے میں سوال کیا۔

ان کو بتایا گیا کہ ”وہ اس وقت ارقم بن ابی ارقم کے مکان میں ہوں گے جو کوہ صفا کے قریب ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن اگر تم کو ان سے ملنا ہے تو ذرا احتیاط سے کام لینا، کہیں قریش کے کسی آدمی کی نظر تمہارے اوپر نہ پڑ جائے۔ اگر انہوں نے تم کو ان سے ملتے ہوئے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئیں گے اور تم کو سخت اذیت پہنچائیں گے۔ یہاں مکے میں تم ایک غریب الوطن ہو۔ یہاں نہ تو تمہارا کوئی حامی و ناصر ہے جو تمہاری حمایت کرے گا، نہ تمہارا قبیلہ و خاندان ہے جو تمہاری نصرت کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا۔“

صہیب ادھر ادھر دیکھتے ہوئے احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے دارالرقم کی سمت چل پڑے۔ وہاں پہنچے تو دروازے پر عمار بن یاسر کو پایا۔ وہ انہیں پہلے سے جانتے تھے۔ پہلے تو تھوڑی دیر تک تردد و تذبذب میں مبتلا رہے لیکن پھر ان کے قریب ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

”عمار! آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

”اور آپ کس مقصد سے آئے ہیں؟“ عمار نے کوئی جواب دینے کے بجائے اٹھان سے سوال کر دیا۔

”میں اس شخص (نبیؐ) کے پاس جانا چاہتا ہوں تاکہ اُس کی باتیں سُنوں؛“ صہیب نے جواب دیا۔

”میں بھی تو اسی خیال سے آیا ہوں؛“ عمار نے کہا۔

”تب ٹھیک ہے؛“ صہیب نے کہا۔ ”اَو اللہ کا نام لے کر ایک سبت چلیں؛“

صہیب بن سنان رومی اور عمار بن یاسر دونوں ایک ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو بڑے غور اور توجہ سے سنا۔ پیارے رسول کی وہ پیاری باتیں کانوں کے راستے سیدھے ان کے دلوں میں اتر گئیں اور دونوں کے دل نورِ ایمان سے جگمگا اٹھے۔ انھوں نے نوراً اپنے ہاتھ رسول اللہ کی طرف بڑھا دیئے اور کلمہ شہادت پڑھ کر دائرۃ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اور دن بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہ کر آپ کے چشمہ رحمت سے اچھی طرح سیراب اور آپ کے اخلاق و سیرت سے بھرپور استفادہ کرتے رہے۔ جب رات کی تاریکی ماحول پر مسلط ہو گئی اور زندگی کے ہنگامے

خاموشی میں تبدیل ہو گئے تو دونوں تاریکی کے پردے میں آپ کے پاس سے نکلے۔ اور اس وقت وہ دونوں اپنے سینوں میں وہ روشنی لیے ہوئے تھے جو ساری دنیا کو منور کرنے کے لیے کافی تھی۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت سمیہ اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم وغیرہم دسیوں مسلمانوں کے ساتھ قریش کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کیں۔ انھوں نے اہل مکہ کی طرف سے ایسی ایسی مصیبتیں جھیلیں کہ اگر وہ پہاڑ پر نازل ہو جاتیں تو اسے بھی پاش پاش کر دیتیں۔ لیکن انھوں نے راہِ خدا میں پیش آنے والے ان تمام آلام و مصائب کو نہایت خندہ پیشانی اور صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔ کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ جنت کی راہیں مکارہ اور تکلیف دہ باتوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تو حضرت صہیب نے اسی وقت اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ ہجرت کا یہ سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کی معیت میں کریں گے۔ لیکن قریش کو کسی طرح ان کے اس ارادے کی بھنک مل گئی اور انھوں نے ان کو اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے زبردستی روک دیا۔ اور ان کی نگرانی کا سخت انتظام کر دیا تاکہ وہ تجارت میں کمائی ہوئی دولت اپنے ساتھ لے کر ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کی ہجرت کے بعد حضرت صہیب کسی مناسب موقع کی تاک میں تھے جس سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں کا ساتھ پکڑ لیں مگر انھیں

اس میں کامیابی نہیں حاصل ہو سکی۔ کیونکہ ان کی نگرانی کرنے والے ہر وقت ان کی طرف سے ہوشیار اور چوکے رہتے تھے۔ اس لیے اب ان کے پاس سوائے اس کے دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے کسی حیلے کا سہارا لیں۔ چنانچہ ایک سردرات میں انھوں نے پاخانے کے بہانہ بکثرت باہر آنا جانا شروع کر دیا۔ وہ پاخانے سے آکر فوراً ہی اس کے لیے واپس لوٹ جاتے تھے۔ وہ نگرانی کرنے والوں کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ انھیں بار بار رفع حاجت کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ یہ حال دیکھ کر ان کی نگرانی کرنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

”خوش ہو جاؤ۔ لات و عزیٰ نے اس کو دست میں بتلا کر دیا ہے“
پھر وہ مطمئن ہو کر اپنی خواب گاہوں میں چلے گئے اور اپنے آپ کو میٹھی نیند کی آغوش میں ڈال دیا۔

اس موقع کو غنیمت سمجھ کر حضرت صہیبؓ ان کے درمیان سے دھیرے سے نکلے اور مدینہ کی طرف چل پڑے۔ لیکن ان کو روانہ ہوتے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ان کی نگرانی کرنے والوں کو ان کے نکل جانے کا پتہ چل گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے، اچھل کر اپنے تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ان کے پیچھے انھیں سرپٹ چھوڑ دیا تاکہ جلد از جلد ان کو پکڑ لیں۔ جب حضرت صہیبؓ کو محسوس ہوا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے تو وہ ایک ٹیلے پر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اپنے ترکش سے تیز نکال کر زمین پر پھیلا دیے اور کمان کی تانت چڑھاتے ہوئے بولے۔

”قریش کے لوگو! خدا کی قسم تم لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایک بہترین تیرانداز اور بے مثل نشانہ باز ہوں اور میرا نشانہ کبھی

خطا نہیں ہوتا۔ واللہ تم لوگ اس وقت تک میرے قریب بھی نہیں
پھٹکت سکتے جب تک میں ہر تیر سے تم میں سے ایک آدمی کو قتل نہ کر لوں۔
پھر میں اس وقت تک تلوار سے تمہارا مقابلہ کرتا رہوں گا جب تک اس
کا قبضہ میرے ہاتھ میں ہوگا۔“

یہ سن کر ان میں سے ایک نے کہا۔

”خدا کی قسم ہم تم کو اپنی جان اور مال دونوں چیزیں بچا کر نہیں
لے جانے دیں گے۔ تم مکہ میں ایک مجلس کی حیثیت سے داخل ہوئے
تھے اور یہاں رہ کر تم نے کافی دولت جمع کر لی ہے۔“
”اگر میں اپنا مال تمہارے لیے چھوڑ دوں تو کیا تم میرا راستہ چھوڑ دو گے؟“
حضرت صہیبؓ نے پوچھا۔

”ہاں!“ انھوں نے کہا۔

تب حضرت صہیبؓ نے ان کو اپنے گھر میں اس جگہ کی نشان دہی
فرمادی جہاں انھوں نے مال رکھا تھا۔ اور انھوں نے ان کا راستہ چھوڑ
دیا اور جا کر بتائی ہوئی جگہ سے مال لے لیا۔

اس کے بعد حضرت صہیبؓ تیز رفتاری کے ساتھ مدینہ کی سمت
چل پڑے۔ وہ اپنے دین کو کافروں سے بچا کر اللہ کی طرف بھاگے چلے
جا رہے تھے۔ انھیں اپنے اس مال کے جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا
جن کے کمانے میں انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی تھیں۔ دورانِ
سفر جب بھی ان کو تنکان محسوس ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
ملاقات کا شوق ان کے لیے ہمیشہ کا کام دیتا اور ان کی چستی و توانائی عود
کراتی اور وہ لگاتار چلتے رہتے۔ چلتے چلتے جب وہ قیام پھینچے تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آتے ہوئے دیکھ لیا۔ آپ نے ان کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

”رَبِّمَّحِ الْبَيْعِ يَا أَبَا يَحْيَى، رَبِّمَّحِ الْبَيْعِ“
 ابو یحییٰ! بیع تمہارے لیے بہت نفع بخش رہی۔“

آپ نے اس فقرے کو تین بار دہرایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ملنے والی اس خوش خبری کو سن کر ان کا چہرہ فرط مسرت سے جگمگا اٹھا اور انہوں نے عرض کیا۔

”اللہ کے رسول! مجھے پہلے آپ کی خدمت میں کسی کی رسائی نہیں ہوئی ہے جو آپ کو اس بات کی خبر دیتا۔ خدا کی قسم آپ کو یہ بات جبریلؑ کے سوا کسی نے نہیں بتائی ہے۔“

یقیناً حضرت صہیبؓ کی بیع کامیاب رہی اور حوٹی آسمانی نے اس کی تصدیق کر دی۔ اور حضرت جبریلؑ نے اس کی شہادت دی۔ جیسا کہ حضرت صہیبؓ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي
 نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ
 وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ۔
 انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے
 جو رضائے الہی کی طلب میں اپنی جان
 کھپا دیتا ہے۔ اور ایسے بندوں پر
 اللہ بہت مہربان ہے۔

(البقرہ - ۲۰۷)



حضرت ابو درداء انصاری رضی اللہ عنہ

عویم بن مالک خزرجی جو عموماً اپنی کنیت ابو درداء سے جانے جاتے تھے، صبح بہت ترط کے نیند سے بیدار ہوئے اور اپنے بت کے پاس پہنچے جس کو انھوں نے اپنے گھر کے اندر سب سے بلند جگہ پر نصب کر رکھا تھا۔ انھوں نے پہلے اس کے سامنے اپنا نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ اور اسے اپنی دکان میں موجود سب سے اعلیٰ درجے کی خوشبو سے محطر کیا پھر ایک نہایت بیش قیمت اور نئے ریشمی کپڑے سے اس کو آراستہ کیا جو مین کے ایک تاجر نے اُن کو ہدیہ دیا تھا۔

سُورج آسمان میں بلند ہو گیا اور دن کی گہما گہمی شروع ہو گئی تو ابو درداء گھر سے دکان کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ میزب کی سڑکیں اور گلیاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کے لیے تنگ ہو رہی ہیں۔ اس وقت وہ لوگ بدر سے واپس لوٹ رہے تھے اور ان کے آگے آگے قریش کے قیدیوں کی وہ جماعت تھی جو جنگ میں شکست کھانے کے بعد مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی تھی۔ ابو درداء راستے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے ایک خزرجی نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس سے عبداللہ بن رواحہ کی خیریت دریافت کی۔ نوجوان نے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے میدان کارزار میں خوب

خوب داد شجاعت دی ہے اور جرأت و مردانگی کے جوہر دکھا کر صحیح سالم واپس آگئے ہیں۔

ابو درداریہ کے عبداللہ بن رواحہؓ کی خیریت دریافت کرنے پر اس نوجوان کو کوئی تعجب نہیں ہوا کیوں کہ اخوت و رفاقت کے جو تعلقات ان دونوں کے درمیان تھے، ان سے سب لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ ابو درداریہ اور عبداللہ بن رواحہؓ کے مابین زمانہ جاہلیت میں رشتہ موافقہ قائم ہوا تھا۔ اسلام آیا تو ابن رواحہؓ نے بڑھ کر اسے قبول کر لیا جبکہ ابو درداریہ نے اس سے اعراض کیا۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے مضبوط رشتہ اخوت میں کسی قسم کی کمزوری نہیں واقع ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ برابر ان سے ربط رکھتے، ان سے ملاقات کرتے، ان کو اسلام کی دعوت دیتے اور برابر انھیں اس کا شوق دلاتے رہتے۔ اور شرک کی حالت میں گزرنے والے ان کی زندگی کے ایک ایک دن پر افسوس کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

ابو درداریہ دکان پر پہنچے اور اپنی اونچی نشست گاہ پر بیٹھ کر خرید و فروخت میں مشغول ہو گئے۔ وہ ان حالات سے بالکل بے خبر تھے جو اس وقت ان کی غیر موجودگی میں ان کے گھر میں پیش آرہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اپنے دوست ابو درداریہ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ اپنے دل میں ایک بات مٹانے ہوئے تھے۔ جب ان کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ انھوں نے ام درداریہ کو صحن میں دیکھ کر کہا۔

”اللہ کی بندی! تیرے اوپر رحمت و سلامتی ہو“

”اور تم پر بھی، اسے ابودرداء کے بھائی!“ ام درداء نے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”ابودرداء کہاں ہیں؟“ ابن رواحہ نے پوچھا۔
 ”دکان پر گئے ہیں۔ اور اب لوٹنے والے ہیں!“ ام درداء نے جواب

دیا۔

”اندر آ جاؤں؟“ ابن رواحہ نے اجازت مانگی۔

”بسرو چشم!“ ام دردائے خوش ہوتے ہوئے کہا اور ان کے لیے راستہ چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں اور گھر کے کاموں اور بچوں کی دیکھ بھال میں مشغول ہو گئیں۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سیدھے اس کمرے میں پہنچ گئے جس میں ابودرداء نے اینٹا بت نصب کر رکھا تھا۔ انہوں نے ایک بنسولا مکالا (جس کو وہ اپنے ساتھ لائے تھے) اور بت پر پل پڑے اور یہ کہتے ہوئے اس کے ٹکڑے کرنے لگے۔

”الَا كُلُّ مَا يَدْعَى مَعَ اللَّهِ بَاطِلٌ... أَلَا كُلُّ مَا يَدْعَى مَعَ اللَّهِ بَاطِلٌ“

”سنو! وہ سارے معبود جو عبادت میں خدا کے ساتھ شریک کیے جا رہے، جھوٹے ہیں۔“ اور بت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکل گئے۔

ادھر جب ام درداء بت والے کمرے میں گئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ وہ ٹوٹا پڑا ہے اور اس کے ٹکڑے زمین پر ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ بت کی یہ درگت دیکھ کر ان کے حواس باختہ ہو گئے اور یہ کہتے ہوئے

اپنا منہ پیٹنے لگیں۔

”اَهْلِكْتَنِي يَا بِنَّ دَوَاحَةَ... اَهْلِكْتَنِي يَا بِنَّ دَوَاحَةَ۔“

”ابن رواحہ! تم نے تو مجھے تباہ کر دیا..... آہ! تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“

اس حادثے کو وقوع پذیر ہوئے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ابو دردار واپس آگئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی بت دل لے کرے کے دروازے پر بیٹھی تار و قطار رو رہی ہے اور اس کے چہرے پر خوف ہراس کے آثار نمایاں ہیں۔ بیوی کو اس حال میں دیکھ کر ابو دردار نے اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

”آپ کے بھائی عبداللہ بن رواحہ آپ کی غیر موجودگی میں یہاں آئے اور انہوں نے ہی آپ کے بت کی وہ گت بنائی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔“ بیوی نے بدستور روتے ہوئے کہا۔

جب انہوں نے بت کی طرف نظر اٹھائی اور دیکھا کہ اس کے ٹکڑے چاروں طرف زمین پر بکھرے ہوئے ہیں تو پہلے تو مارے غصے کے بھڑک اٹھے اور اس کا انتقام لینے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن کچھ دیر بعد جب ان کے غصے کی آگ ٹھنڈی ہو گئی تو انہوں نے اس پر غور کرتا شروع کیا! انہوں نے اپنے دل میں کہا کہ ”اگر اس بخت میں ذرا بھی قوت و طاقت ہوتی تو یہ ضرور اپنا دفاع کرتا۔“ اور اسی وقت وہ عبداللہ بن رواحہ کی طرف روانہ ہو گئے اور ان کو ساتھ لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور اپنے دخول اسلام کا اعلان کر دیا۔ وہ دائرۃ اسلام میں داخل ہونے

والے اپنے قبیلے کے آخری فرد تھے۔

حضرت ابو درود رضی اللہ عنہ اس طرح ایمان لائے کہ ایمان لاتے ہی وہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ وہ اس خیر سے محرومی پر سخت پشیمان تھے جو ان سے فوت ہو گیا تھا۔ ان کو اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ ان کے دوست احباب ہم دین اور حفظ کتاب الہی میں ان سے سبقت لے گئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے لیے عبادت و تقویٰ کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان تھک جہد و جہد اور مسلسل کوشش کے ذریعے تلمانی مافات کا عزم مصمم کر لیا۔ انہوں نے دل میں اس بات کا اٹل فیصلہ کر لیا کہ رات دن ایک کر کے وہ اپنے پیش روں کو جا لیں گے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ وہ عبادت کی طرف مائل ہوئے تو اس طرح کہ دنیا سے قطع تعلق کر کے پورے طور پر خدا کے ہوئے۔ وہ حصول علم دین کی جانب متوجہ ہوئے تو یوں جیسے کوئی پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے۔ وہ کتاب اللہ کو یاد کرنے اور اس کی آیات پر غور و تدبر کرنے میں مہنمک ہو گئے۔ اور جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ کاروبار مصروفیتیں ان کی لذت عبادت کو مگر کیے دے رہی ہیں اور ان کی وجہ سے وہ علمی مجلسوں میں شرکت سے محروم رہ جاتے ہیں تو انہوں نے بلا تذبذب ان مصروفیات سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس فیصلے پر نہ تو انہیں کوئی صدمہ ہوا نہ انہوں نے اس پر کسی افسوس کا اظہار کیا۔ ایک بار کسی نے اس کے متعلق ان سے دریافت کیا تو انہوں نے سائل کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے پہلے سے میں تجارت کر رہا تھا۔ اسلام لانے کے بعد میں نے چاہا کہ عبادت کے ساتھ ساتھ تجارت کا سلسلہ بھی جاری رکھوں، لیکن میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور آخر کار میں نے تجارت ترک کر دی اور پوری یک سوئی کے ساتھ عبادت میں لگ گیا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں ابودرداء کی جان ہے، مجھے تو یہ بات بھی پسند نہیں ہے کہ آج میری کوئی دکان مسجد نبوی کے دروازے کے سامنے ہو اور میری نماز باجماعت فوت نہ ہو اور پھر خرید و فروخت کر کے میں روزانہ تین سو دینار نفع کماؤں۔“

پھر انھوں نے سائل کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔
 ”میں یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ نے کاروبار اور خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے۔ البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ میں ان لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاؤں جن کو تجارت اور کاروباری مصروفیتیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتیں۔“

بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے تجارت چھوڑ دی بلکہ انھوں نے دنیا کو ترک کر دیا، وہ اس کی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں سے کنارہ کش ہو کر روکھی شوکھی غذا اور موٹے جھوٹے لباس پر قانع ہو گئے، جس سے وہ اپنی کمرسیدھی رکھ سکیں اور ستر پوشی کر سکیں۔ ایک دفعہ ان کے یہاں کچھ بہان آئے۔ وہ موسم سرما کی ایک نہایت سرد رات تھی۔ انھوں نے بہانوں کے لیے گرم گرم کھانا تو بھیج دیا لیکن اورٹھنے کے لیے لحاف نہیں بھیجا۔ جب

انہوں نے سونے کا ارادہ کیا تو لحافوں کے متعلق باہم مشورہ کرنے لگے۔
 آخر ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ان سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں،
 دوسرے نے اسے منع کیا مگر وہ نہ مانا اور جا کر ان کے کمرے کے دروازے
 پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت ابو دردار رضی اللہ عنہما نے ہمیں اور ان کی
 اہلیہ ان کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ان دونوں میاں بیوی
 کے بدن پر ایک ہلکا سا کپڑا ہے جو نہ تو دھوپ سے بچا سکتا ہے نہ
 ٹھنڈک سے حفاظت کر سکتا۔ یہاں نے ان سے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں
 کہ آپ بھی ہماری ہی طرح رات گزار رہے ہیں۔ آخر آپ کا سارا سامان
 کہاں ہے؟“

”وہاں (آخرت میں) ہمارا ایک گھر ہے۔ جب بھی کوئی سامان ہمارے
 ہاتھ آتا ہے، ہم اسے لگاتار وہیں بھیجتے رہتے ہیں۔ اگر ہم نے اس گھر
 میں کچھ بچا کے رکھا ہوتا تو آپ لوگوں کے پاس ضرور بھیجا ہوتا۔ پھر جس
 راستے سے ہم کو وہاں گھر کی طرف جانا ہے، اس میں نہایت دشوار گزار
 گھاٹیاں ہیں جن کو سامان سے بوجھل شخص کے مقابلے میں ہلکا پھلکا آدمی
 زیادہ آسانی سے عبور کر سکے گا۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے بوجھوں
 سے سبکدوش ہو جائیں تاکہ باآسانی اس گھاٹی سے گزر سکیں۔
 پھر اس سے کہا۔

”غالباً آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے“

”ہاں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے“ اس نے کہا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو
 شام کی گورنری کا منصب عطا کرنا چاہا، مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہیں

ہوئے۔ جب حضرت عمرؓ کا اصرار بہت زیادہ بڑھ گیا تو انھوں نے کہا کہ اگر آپ اس بات پر راضی ہوں کہ میں وہاں جا کر لوگوں کو ان کے رب کی کتاب اور ان کے رسولؐ کی سنت کی تعلیم دوں اور انھیں نمازیں پڑھایا کروں تو میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ حضرت عمرؓ اس پر راضی ہو گئے اور حضرت ابو درداء دمشقی روانہ ہو گئے۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ لوگ دنیا کی دولت و ثروت پر فریفتہ اور عیش و عشرت میں غرق ہیں۔ لوگوں کو اس حال میں دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔ ان کو مسجد میں اکٹھا ہونے کے لیے کہا۔ جب سب لوگ وہاں جمع ہو گئے تو حضرت ابو درداء نے ان سے خطاب فرمایا۔

”دمشق کے لوگو! تم آپس میں دینی بھائی، ہمسائے اور دشمنوں کے خلاف ایک دوسرے کے انصار و معاون ہو۔ لوگو! آخر وہ کون سی چیز ہے جو میرے ساتھ مودت و محبت کا تعلق قائم کرنے اور میری نصیحتوں کو قبول کرنے سے تم کو روک رہی ہے حالانکہ میں اس کے بدلے میں تم سے کسی معاوضے کا طالب نہیں ہوں۔ میری نصیحت و خیر خواہی تمہارے لیے ہے اور میرا خرچ دوسرے پر ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اہل علم ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں مگر بے علم لوگ علم حاصل کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنی ساری توجہ ان چیزوں کے حصول میں صرف کر رہے ہو جن کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے، اور جن باتوں کا تم کو حکم دیا گیا ہے ان کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ کیا بات ہے کہ تم وہ مال و دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہو جسے تم کو کھانا نہیں، وہ عمارتیں تعمیر کرنے میں مصروف ہو، جن میں تم کو رہنا نہیں ہے اور ان چیزوں کی خواہش کرتے ہو جو تمہیں حاصل

نہیں ہو سکتیں۔ تم سے پہلے کے لوگوں نے دولت کے اتبار جمع کیے اور آرزوں کے محل تعمیر کیے لیکن تھوڑی ہی دیر میں ان کا اٹھا کیا ہوا سرمایہ تباہ و برباد ہو گیا، ان کی آرزوں کے عالی شان محل زمین بوس ہو گئے اور ان کے تعمیر کردہ مکانات قبروں میں تبدیل ہو گئے۔

اہل دمشق! یہ ہے قوم عاد، جس نے زمین کو مال اور اولاد سے بھر دیا تھا۔ میں قوم عاد کا ترکہ آج دو درہم میں بیچ رہا ہوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس کو لینا چاہتا ہے؟“

حضرت ابو درداء کی یہ تقریر سن کر لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ اور ان کی آوازیں مسجد کے باہر سے سنائی دے رہی تھیں۔

اور اس روز سے ان کا روزمرہ کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ دمشق کی عوامی مجالس میں شریک ہوتے اور بازاروں میں گشت لگاتے۔ ان مواقع پر وہ پوچھنے والوں کو مسائل بتاتے، ان پڑھ لوگوں کو تعلیم دیتے اور غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو غفلت سے ہوشیار کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ فرصت کے ہر لمحے کو غنیمت جانتے اور ہر مناسب موقع سے بھرپور استفادہ کی کوشش کرتے تھے۔

ایک دفعہ ان کا گزر ایک مجمع کی طرف سے ہوا جو ایک آدمی کے گرد اکٹھا تھا۔ لوگ اسے زد و کوب کر رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔

انہوں نے حقیقت حال دریافت کی تو لوگوں نے بتایا کہ۔

”ایک آدمی ہے جس نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے۔“

”یہ بتاؤ اگر یہ شخص کسی کنویں میں گر جاتا تو کیا تم اسے وہاں سے نکالتے؟“

حضرت ابو درداء نے ان سے پوچھا۔

”کیوں نہیں؟“ سب نے کہا۔

”تو پھر تم اس کو نہ گالی دو، نہ مارو بیٹو بلکہ صرف سمجھانے بچھانے اور وعظ و نصیحت پر اکتفا کرو اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو اس گناہ سے محفوظ رکھا“ حضرت ابو درداءؓ نے ان لوگوں کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔

”تو کیا آپ اسے ناپسند نہیں کرتے؟“ مجمع نے پوچھا۔

”میں صرف اس کے اس گناہ نے کام کو ناپسند کرتا ہوں۔ اگر اس سے باز آجائے تو پھر یہ میرا بھائی ہے۔“ انھوں نے جواب دیا۔
حضرت ابو درداءؓ کی یہ بات سنی تو وہ شخص پھوٹ پھوٹ کر رونے اور اپنے گناہ سے توبہ کرنے لگا۔

ایک نوجوان ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور ان سے درخواست کرتا ہے۔

”رسول اللہ کے محترم ساتھی! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔“

”بیٹے! خوش حالی کے زمانے میں خدا کو یاد کرتے رہا کرو، وہ تم کو تنگدستی کے دنوں میں یاد رکھے گا۔“

”بیٹے! تم یا تو عالم بنو یا متعلم بنو یا علم کے سننے والے بنو۔ چوتھے (جاہل) نہ بنو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔“

”بیٹے! مسجد کو تمہارا گھر ہونا چاہیے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔“

”الْمَسَاجِدُ بَيْتٌ كُلٌّ تَقِيٌّ — مسجدیں ہر متقی آدمی کا گھر ہیں۔“

”اور خدائے عزوجل نے ان لوگوں کے لیے جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ

مسجدوں میں گزارتے ہیں۔ راحت و رحمت اور پل صراط سے باسانی گزر کر اللہ کی خوشنودی تک پہنچنے کی ضمانت لے رکھی ہے، حضرت ابودردار رضی اللہ عنہ نے نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اور یہ چند نوجوان ہیں جو راستے پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور آتے جاتے لوگوں کو گھور رہے ہیں۔ حضرت ابودردار رضی اللہ عنہ ان کے پاس جا کر نصیحت کرتے ہیں۔

پہلو! مسلمان کی نشستی گاہ اس کا گھر ہے۔ اسی میں رہ کر وہ اپنے نفس اور اپنی نگاہ کی حفاظت کرتا ہے۔ بازاروں اور عام گزرگاہوں پر بیٹھنے سے پرہیز کر دو، کیونکہ یہ حرکت آدمی کو غافل کر کے فضول اور بے مقصد مشاغل میں مبتلا کر دیتی ہے۔“

حضرت ابودردار رضی اللہ عنہ کے قیام دمشق کے زمانے میں، وہاں کے گورنر حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے ان کی بیٹی دردار سے اپنے لڑکے یزید کی شادی کا پیغام بھیجا۔ لیکن انھوں نے یہ پیغام نامنظور کر دیا اور اس کا نکاح ایک عام مسلمان کے ساتھ کر دیا۔ جس کی دینی و اخلاقی حالت سے وہ مطمئن اور راضی تھے۔ اور جب یہ بات عوام میں پہنچی تو ایک شخص نے اس کے متعلق ان سے سوال کیا۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

”میں نے یہ قدم اپنی بیٹی دردار کے فائدے کے پیش نظر اٹھایا ہے۔“

”وہ کیسے“ اس نے وضاحت چاہی۔

”تمہارا کیا خیال ہے دردار کے متعلق؟ جب ہر وقت اس کی خدمت میں لوتڑیوں اور غلاموں کی جماعت اس کا ہر حکم بجالانے کے

لیے موجود ہوتی اور وہ خود کو ایسے شاندار محلوں میں پاتی جن کی جگہ گاہٹ لگا ہوں کو خیرہ کیے دے رہی ہو، تو اس روز اس کا دین کہاں ہوتا؟ حضرت ابودرداءؓ نے کہا۔

ان کے قیامِ شام کے زمانے میں ملکی حالات معلوم کرنے کے خیال سے خلیفہ وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وہاں کا دورہ فرمایا۔ اور ایک روز اپنے دوست حضرت ابودرداءؓ سے ملنے کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ رات کا وقت تھا۔ انھوں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کیوں کہ وہ اندر سے بند نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ گھر میں داخل ہو گئے۔ اندر گہری تاریکی مسلط تھی۔ حضرت ابودرداءؓ نے آہٹ محسوس کی تو اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور ان کو بٹھایا۔ پھر دونوں آدمی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت دونوں میں سے کوئی بھی اندھیرے کی وجہ سے دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کے تکیے کو ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ زین کے نیچے رکھا جانے والا کبل ہے، بستر کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ وہاں کنکریاں بھی ہوتی ہیں اور ان کے اوڑھنے کو ہاتھ لگایا تو محسوس ہوا کہ وہ ایک پتلا سا کبل ہے جو دمشق کی شدید سردی سے بچانے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

”اللہ آپ پر رحم فرمائے، کیا میں نے آپ کے لیے کشادگی و فراخی کا انتظام نہیں کیا تھا؟ کیا میں نے آپ کی ضروریات کے لیے رقم نہیں بھیجی تھی؟“

حضرت ابودرداءؓ نے جواب دیا۔

”عمرؓ! آپ کو یاد ہے وہ حدیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ہم لوگوں سے ارشاد فرمائی تھی؟“

”کون سی حدیث؟“ انھوں نے دریافت کیا۔

”کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا تھا کہ تمہارے پاس دنیا کا ساز و سامان مسافر کے زادِ راہ کی طرح مختصر اور حسبِ ضرورت ہونا چاہیے۔“ حضرت ابو درداءؓ نے یاد دلایا۔

”ہاں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کہی تھی۔“ حضرت عمرؓ نے کہا۔

”تو اے عمرؓ! پھر ہم لوگوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟“ انھوں نے کہا اور پھر دونوں رونے لگے اور صبح تک برابر روتے رہے۔

حضرت ابو درداءؓ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اہل دمشق کو وعظ و نصیحت فرماتے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے رہے۔ اور جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو ان کے دوست احباب ان کی عیادت کے لیے آئے اور ان سے پوچھا کہ

”آپ کو کس بات کی شکایت ہے؟“

”اپنے گناہوں کی“ انھوں نے جواب دیا۔

”کوئی خواہش ہے؟“ دوستوں نے دریافت کیا۔

”اپنے رب سے عفو و درگزر کا طالب ہوں۔“ انھوں نے جواباً ارشاد

فرمایا پھر اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا کہ مجھے لا اِلهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ وَرَسُولُ اللهِ کی تلقین کرو۔ اس کے بعد وہ برابر کلمہ طیبہ کو دہرا رہے اور اسی حالت میں اپنے رب سے جا ملے۔

انتقال کے بعد حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ نے خواب دیکھا کہ

”ایک نہایت ہی ہری بھری اور لمبی چوڑی چراگاہ ہے۔ اس میں چمڑے کا ایک بہت بڑا خیمہ لگا ہوا ہے۔ اس خیمے کے ارد گرد بکریاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ وہ ایسا خوش نما اور دل کش منظر تھا کہ ویسا منظر کبھی کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ سب کس کا ہے؟ تو ان کو بتایا گیا کہ یہ سب کچھ عبدالرحمان ابن عوف کا ہے۔ پھر عبدالرحمان بن عوف خیمے سے نکلے اور ان سے کہا کہ مالک کے بیٹے! یہ وہ کچھ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو قرآن کی بدولت عطا فرمایا ہے۔ اگر تم اس گھائی پر چڑھ کر نظر دوڑاؤ گے تو تم وہ کچھ دیکھو گے جو تمہاری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا اور تم وہ کچھ سُنو گے جو تمہارے کانوں نے کبھی نہیں سنا ہوگا۔ اور ایسی ایسی چیزیں وہاں پاؤ گے جن کا تمہارے دل میں کبھی خیال تک نہیں آیا ہوگا“ حضرت عوف بن مالک نے پوچھا کہ

”اے ابو محمد! وہ سب کچھ کس کا ہے؟“

انھوں نے فرمایا کہ

”وہ سب اللہ عزوجل نے ابو دردار کے لیے تیار کیا ہے۔ اس

لیے کہ وہ دنیا کو اپنے ہاتھوں اور سینے سے پیچھے دھکیلتے تھے“

— پ —

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

سعدی بنت ثعلبہ اپنے بچے زید بن حارثہ کعبی کو ساتھ لیے ہوئے اپنے قبیلے بنو معن سے ملاقات کے ارادے سے روانہ ہوئی۔ لیکن ابھی وہ اپنے قبیلے کے دیار میں پہنچی نہیں تھی کہ بنو قین کے سواروں نے اچانک حملہ کر کے ان کے مال و اسباب پڑ جتھ کر لیا، ان کے اونٹ ہانک لے گئے اور بال بچوں کو گرفتار کر لیا۔ جن بچوں کو وہ پکڑ کر لے گئے تھے ان میں اس کا بچہ زید ابن حارثہ بھی تھا۔

زید ایک کسن بچہ تھا۔ اس وقت وہ اپنی عمر کی آٹھویں منزل میں تھا۔ ڈاکو اسے فروخت کرنے کی غرض سے ”عکاظ“ کے بازار میں لے گئے، جہاں سے قریش کے ایک دولت مند سردار حکیم ابن خزیم بن خویلد نے چار سو درہم میں خرید لیا۔ حکیم بن خزیم نے اس کے علاوہ بھی بہت سے غلام خریدے اور ان کو لے کر مکہ واپس آ گیا۔ جب اس کی پھوپھی خدیجہ بنت خویلد کو اس کی واپسی کی اطلاع ملی اور وہ اس سے ملنے اور اس کو خوش آمدید کہنے گئیں تو اس نے کہا۔

”یہ چند غلام میں سوق ”عکاظ“ سے خرید کر لایا ہوں۔ آپ ان میں سے جس کو چاہیں پسند کر لیں، میں اسے آپ کی خدمت میں ہدیہ کرتا ہوں۔“

سیدہ خدیجہ نے ایک ایک کر کے سب غلاموں کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ ان کی نگاہیں زید کے چہرے پر جا کر ٹک گئیں۔ وہ اُسے دیر تک دیکھتی رہیں اور اس پر ظاہر ہونے والی ذہانت و فطانت کی علامات کی وجہ سے اس کو پسند کر لیا اور لے کر گھر واپس آگئیں۔

کچھ دنوں بعد سیدہ خدیجہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئیں۔ اس موقع پر وہ ان کی خدمت میں کوئی بیش قیمت تحفہ پیش کرنا چاہتی تھیں۔ اور اس کے لیے انھیں اپنے عزیز غلام زید بن حارثہ سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں ملی، چنانچہ اس کو ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ادھر یہ خوش نصیب بچہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سرپرستی میں رہ کر ان کی زریں صحبت اور بہترین سیرت و کردار سے بہرہ ور ہوتے ہوئے خوشی اور آزادی کے دن گزار رہا تھا اور ادھر اس کی ستم رسیدہ اور ماتا کی ماری ہوئی ماں اس کی گمشدگی کے صدمے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ نہ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو تھم رہے تھے نہ اس کی سوزشِ غم میں کوئی کمی واقع ہو رہی تھی اور نہ ہی اسے کسی پہلو سکون و قرار نصیب ہو رہا تھا۔ اُسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ آیا اس کا نختِ جگر زندہ ہے کہ اس کی بازیابی کی امید رکھے یا وہ مرجھا ہے کہ اس سے مایوس ہو کر صبر کی سِل اپنے سینے پر رکھ لے۔ اور یہ بات اس کے غم کی شدت میں مزید اضافے کا سبب تھی۔ اس کا باپ ملک کے گوشے گوشے میں اسے ڈھونڈتا اور ہر قافلے سے اس کا پتہ پوچھتا پھر رہا تھا۔ اور اس کے اضطراب و بے قراری کی کیفیت ان دردناک اشعار کے قالب میں ڈھل گئی تھی جو سننے والوں کے دلوں کے ٹکڑے کیے دے رہے تھے۔

بَكَيْتُ عَلَى نَزِيلٍ وَلَمَّا أَذْمِرَ مَا فَعَلْتُ أَحْيَيْتُ فَيَرْجِي أُمَّ أَيْ دُونَهُ الْآجِلُ

”میں زید کے غم میں گریہ و زاری کر رہا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس حال میں ہے۔ آیا وہ زندہ ہے کہ اس سے ملنے کی امید ہو یا اس کی موت اس کی راہ میں حائل ہو گئی؟“

فَوَاللَّهِ مَا أَذْمِرُ وَإِنِّي لَسَأَلُكَ أَخَاكَ بَعْدِي السَّمْلُ أُمَّ غَالِكَ الْجَبَلُ

”خدا کی قسم مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم، اور میں حیران و سرگرداں پوچھتا پھر رہا ہوں کہ میرے پیچھے تجھے میدان نے چرا لیا یا پہاڑ نے اچک لیا؟“

تَذَكَّرُ فِيهِ الشَّمْسُ عِنْدَ طُلُوعِهَا وَتَعْوِضُ ذِكْرَاهُ إِذَا غَرَبَتْ بِهَا أَفَلُ

”سورج اپنے طلوع ہونے کے ساتھ مجھے اس کی یاد دلاتا ہے۔ اور ڈوبتے ہوئے بھی اس کی یاد تازہ کر جاتا ہے؟“

سَاعَمَلُ نَصْنُ الْعَيْصِ فِي الْأَرْضِ جَاهِلًا وَلَا أَسْمُ التَّطَوَّافِ أَوْ تَسَامُ الْإِبِلُ

”میں اپنے اونٹ کو تیزی سے دوڑا کر زمین میں اس کی جستجو سے باز نہیں آؤں گا۔ انا یہ کہ میرا اونٹ تھک کر نڈھال ہو جائے؟“

حَيَاتِي أَوْ تَأْتِي عَلَيَّ مَنِيَّتِي ! ! ! فَكُلُّ أَمْرِي فَإِنْ وَإِنْ غَرَا الْآمَلُ

”یا مجھے موت آجائے کیوں کہ ہر شخص فانی ہے چاہے امید اسے بتلائے فریب رکھے؟“

ایک بار حج کے موسم میں زید کے قبیلے کے کچھ لوگ زیارت بیت اللہ کے ارادے سے مکہ آئے ہوئے تھے، طواف کے دوران اچانک زید سے ان کا سامنا ہو گیا۔ انہوں نے زید کو اور زید نے ان کو پہچان لیا۔ اور آپس میں بات چیت بھی ہوئی۔ جب وہ لوگ مناسک حج سے فارغ ہو کر اپنے قبیلے میں واپس پہنچے تو انہوں نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اس کی مفصل روداد حارثہ کے سامنے رکھ دی۔

زید کا سراغ ملتے ہی اس نے جھٹ پٹ اپنی سواری کو تیار کیا، اپنے تختِ جگر کا فدیہ ادا کرنے کے لیے وافر مقدار میں مال اونٹ پر لادا اور اپنے ہمراہ اپنے بھائی کعب کو بھی لے لیا۔ پھر تیز رفتاری کے ساتھ راستہ طے کرتے ہوئے دونوں مکہ کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر سیدھے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر پہنچے اور ان سے کہا،

اے ابن عبدالمطلب! آپ لوگ اللہ کے ہمسائے ہیں، قیدیوں کو رہائی بخشنے، بھوکوں کو کھانا کھلاتے اور مظلوموں کی فریادرسی کرتے ہیں۔ ہم آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے کے سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم آپ کے پاس اتنا مال لاتے ہیں جو اس کے فدیہ کے لیے کافی ہوگا۔ آپ ہمارے اوپر احسان فرمائیں اور فدیہ لے کر اُسے چھوڑ دیں۔

”کون ہے تمہارا وہ بیٹا؟“ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا۔

”آپ کا غلام، زید بن حارثہ“ دونوں ایک ساتھ بولے۔

”کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہارے سامنے ایک تجویز رکھوں جو فدیہ سے

بہتر ہے؟“ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے دریافت کیا۔

”وہ کون سی تجویز ہے؟“ انھوں نے جاننا چاہا۔

”میں اُسے تمہارے سامنے بلائے دیتا ہوں۔ تم اُس کو یہ اختیار دے دو

کہ وہ میرے اور تمہارے درمیان سے جس کو چاہے منتخب کرے۔ اگر وہ تمہارے

ساتھ جانے کو ترجیح دیتا ہے تو تم اُسے کسی مال اور فدیہ کے بغیر اپنے ساتھ

لے جا سکتے ہو، لیکن اگر وہ میرے پاس رہنے کو پسند کرتا ہے تو خدا کی قسم

میں اس کی پسند کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔“ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تجویز

کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”یقیناً اپنے یہ بڑے انصاف کی بات کہی ہے“ دونوں نے متفق ہوتے ہوئے کہا۔
اس کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زید کو بلا کر پوچھا۔
”ان دونوں کو پہچانتے ہو؟“

”ہاں، یہ میرے والد حارثہ ابن شراحیل اور یہ میرے چچا کعب ہیں۔“
زید نے دونوں کی طرف باری باری اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”زید! میں تم کو اس بات کا اختیار دیتا ہوں کہ اگر چاہو تو اپنے والد اور
چچا کے ساتھ چلے جاؤ اور اگر چاہو تو میرے پاس رہ جاؤ۔“ محمد (صلی اللہ علیہ
وسلم) نے اس کو مخاطب کر کے کہا۔
”میں آپ کے پاس رہوں گا۔“ زید نے کسی تاخیر و تذبذب کے بغیر کہا۔
یہ سن کر اس کے باپ نے کہا۔

”ارے تیرا بیڑا غرق ہو، کیا تو غلامی کو اپنے والدین پر ترجیح دے رہا ہے؟“
”میں ان کی طرف سے ایک چیز دیکھ سچکا ہوں۔ میں وہ نہیں ہوں
جو کبھی بھی ان سے جدا ہونا گوارا کرنے لے۔“ زید نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب اپنے ساتھ زید کے اس غیر معمولی تعلق
خاطر کو دیکھا تو اسی وقت اس کا ہاتھ پکڑا، اسے لیے ہوئے بیت الحرام میں
پہنچے اور حجر کے مقام پر قریش کے مجمع میں کھڑے ہو کر اعلان کیا۔
”قریش کے لوگو! گواہ رہنا آج سے یہ میرا بیٹا ہے، یہ میرا وارث
ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا۔“

یہ دیکھ کر زید کے باپ اور چچا کا جی خوش ہو گیا اور وہ اسے محمد بن عبد اللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چھوڑ کر اپنے قبیلے کی طرف واپس لوٹ گئے۔
ہوئے وہ دونوں اس کی طرف سے پورے طور پر مطمئن تھے۔

اور پھر اس روز سے زید بن حارثہ، زید بن محمد کے نام سے پکارے جانے لگے اور وہ برابر اسی نام سے پکارے جاتے رہے، یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم منصب رسالت پر فائز کر دیے گئے اور اسلام نے اللہ کے فرمان **ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ** کے نزول کے ساتھ منہ بولا بیٹا بنانے کی رسم کا عدم قرار دے دیا۔ اور وہ زید بن محمد سے پھر زید بن حارثہ ہو گئے۔

زید کو کیا معلوم تھا کہ جس وقت انھوں نے اپنے ماں باپ کے مقابلے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنایا تھا۔ کیسی غنیمت ان کے حصے میں آئی تھی، وہ یہ بھی کہاں جانتے تھے کہ جس آقا کی غلامی کو انھوں نے اپنے خاندان اور قبیلے پر ترجیح دی ہے، وہ اولین و آخرین کے سردار اور ساری مخلوق کی طرف اللہ کے رسول ہیں۔ ان کے دل میں تو یہ خیال بھی نہیں گزرا تھا کہ عنقریب روئے زمین پر آسمانی بادشاہت کے قیام کا اعلان ہونے والا ہے جو مشرق سے لے کر مغرب تک ساری زمین کو نیکی اور عدل و انصاف سے بھر دے گی اور خود ان کی حیثیت اس عظیم الشان بادشاہت کی تعمیر میں "نخست اول" کی ہوگی۔ ان میں سے کوئی بات زید کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ وہ تو سر اسر اللہ تعالیٰ کا فضل تھا اور وہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نواز دیتا ہے۔ وہ تو فضل عظیم کا مالک ہے۔

اور وہ فضل عظیم یہ تھا کہ تخییر کے اس واقعہ کے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دین حق دے کر مبعوث فرمایا اور زید مردوں میں سب سے پہلے ان کے اوپر ایمان لائے۔ تو کیا

لہ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ احزاب۔ ۵

اس سے بڑھ کر بھی اولیت اور فضیلت کا کوئی مقام ہو سکتا ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے مسابقت کی جائے۔

حضرت زید بن عارثہ رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رازوں کے امین و محافظ تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو آپ سفارتی و فوجی دستوں کی قیادت پر متعین فرماتے اور اپنی عدم موجودگی میں مدینہ پر اپنا قائم مقام مقرر کرتے تھے۔

جس طرح زید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی غیب معمولی محبت اور تعلق خاطر کا اظہار کیا اور اپنے ماں باپ پر ان کو ترجیح دی اسی طرح آپ نے بھی ان سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا اور ان کو اپنے اہل و عیال کے ساتھ شامل کر لیا۔ آپ کی محبت کا یہ حال تھا کہ جب وہ کسی ہم پر گئے ہوئے ہوتے تو آپ ہر وقت ان کے لیے مشتاق و بے قرار رہتے اور جب واپس آتے تو بہت خوش ہوتے اور ان سے ملتے وقت جس بے پناہ مسرت و شادمانی کا اظہار فرماتے وہ صرف انھیں کا حصہ تھا۔

یہ ہیں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ وہ حضرت زید کے ساتھ ملاقات کے موقع پر رسول اللہ کی فرحت و مسرت کے ایک منظر کی تصویر کشی کرتی ہوئی فرماتی ہیں۔

”ایک دفعہ زید تم کسی ہم سے واپس لوٹے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے کمرے میں تھے۔ زید نے جب دروازے پر دستک دی تو آپ جلدی سے اٹھ کر ننگے بدن ان کی طرف لپکے۔ اس وقت آپ کے جسم اطہر پر صرف اتنا ہی کپڑا تھا جس نے آپ کے گھٹنے اور ناف کے درمیانی حصہ پر جسم کو چھپا رکھا تھا۔ آپ اپنے کپڑے کو گھسیٹتے ہوئے

دروازے کی جانب بڑھے، ان کو گلے لگایا اور بوسہ دیا۔ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کپڑے کے بغیر کبھی نہیں دیکھا، نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔“

یہ بات تمام مسلمانوں میں شہرت کی حد تک عام تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ کے ساتھ غیر معمولی محبت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو ”زید حبیب“ (چہیتے زید) کہہ کر بلاتے اور ”حبیب رسول اللہ“ (رسول اللہ کے محبوب) کے لقب سے نوازتے تھے۔ اور بعد میں لوگوں نے ان کے پیٹے حضرت اسامہؓ کا لقب ”حبیب رسول اللہ“ اور ”ابن حبیب رسول اللہ“ رکھ دیا تھا۔

شہ ۳ھ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی مشیت نے حبیب (رسول اللہ) کو ان کے محبوب (حضرت زیدؓ) کی جدائی کے ذریعے آزمایا۔ ہوا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث بن عمیر ازدی کو ایک خط — جس میں اسے اسلام کی دعوت دی گئی تھی — دے کر بصری کے حکمران کے پاس بھیجا۔ جب حضرت حارثؓ مشرقی اردن میں واقع ”موتہ“ کے مقام پر پہنچے تو ایک غسانی حاکم شریس بن عمرو نے ان کا راستہ روک لیا اور ان کو گرفتار کر کے پابہ زنجیر کر لیا اور بعد میں ان کی گردن ماردی۔ رسول اللہ کو ان کے قتل کا بے حد صدمہ ہوا کیوں کہ اس سے پہلے آپ کے کسی ایلچی کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔ آپ نے جنگ موتہ کے لیے تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ایک فوج تیار کی جس کی قیادت اپنے محبوب حضرت زید بن حارثہؓ کے سپرد کی۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو فوج کی قیادت جعفر بن ابی طالب کریں گے۔ اور اگر وہ بھی جام شہادت نوش کریں، لشکر کی کمان عبداللہ بن رواحہؓ کے ہاتھ میں ہوگی۔ لیکن اگر وہ بھی

جنگ میں کام آجائیں تو پھر مسلمان اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کریں گے۔
 مجاہدین اسلام کا یہ لشکر مدینہ سے چل کر مشرقی اردن کے ایک مقام
 ”معان“ پر خیمہ زن ہو گیا۔ ادھر ہر قتل شاہِ روم ایک لاکھ فوجیوں کے ساتھ
 غسانیوں کی مدد کے لیے چل پڑا۔ بعد میں عرب کے مشرک قبائل میں سے
 ایک لاکھ مزید سپاہی اس کے لشکر میں شامل ہو گئے اور یہ لشکر جزار لگے بڑھ
 کر مسلمانوں کے پڑاؤ کے قریب فروکش ہو گیا۔
 مسلمان معان میں رک کر دو دن تک جنگی لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے غور
 مشورہ کرتے رہے۔ ان میں سے کسی نے رائے دی کہ

”ہمیں موجودہ صورتِ حال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع اور
 دشمن کی بھاری تعداد سے آگاہ کر کے آپ کے حکم کا انتظار کرنا چاہئے۔“
 لیکن دوسرے نے کہا کہ

”لوگو! خدا کی قسم، ہم کثرتِ تعداد اور قوتِ داسلمہ کے بھروسے نہیں، دینِ
 اسلام کی صداقت و حقیقت کے بل پر لڑتے ہیں۔ چلو اس مقصد کو حاصل
 کرنے کے لیے آگے بڑھو جس کے لیے نکلے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دو میں سے
 ایک کامیابی کی ضمانت دے رکھی ہے۔ یا تو وہ تمہیں فتح و کامرانی سے سرفراز
 فرمائے گا یا دولتِ شہادت سے مالا مال کرے گا۔“

آخر کار موت کے میدان میں دونوں فوجوں کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی۔
 اور مسلمان اس بے جگری سے لڑے کہ رومی ان کی ہمت و شجاعت کو دیکھ کر
 دنگ رہ گئے۔ ان کے دلوں میں ان تین ہزار جاں بازوں کی ہیبت طاری ہو گئی
 جو دو لاکھ کا سامنا کرتے ہوئے چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ ڈٹ
 گئے تھے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ پر چم ریموں کی مدافعت میں ایسی پامردی اور ثنابت قدمی کے ساتھ لڑتے جس کی نظیر بہادری کی داستانوں میں تلاش کرنے سے نہیں ملتی۔ وہ لڑتے رہے اور اس وقت تک لڑتے رہے جب تک سیکڑوں نیزوں نے ان کے جسم کو چھلنی نہیں کر دیا اور وہ خون میں لت پت ہو کر زمین پر نہیں گر گئے۔ ان کے گرتے ہی حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے لپک کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگادی اور غیر معمولی شجاعت و جواں مردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پیش رو سے جا ملے۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر جھنڈے کو اپنے قبضے میں کر لیا اور اس کی مدافعت میں دشمنوں سے لڑتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے بعد مسلمانوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امیر بنا لیا۔ ان کو دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہ فوج کو لے کر پیچھے ہٹ آئے اور اسے مکمل تباہی سے بچا لیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جنگ کے حالات اور اپنے تینوں سپہ سالاروں کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپ کو بے حد صدمہ ہوا اور ان کے اہل و عیال کی تعزیت کے لیے تشریف لے گئے۔ جب حضرت زید بن حارثہ کے یہاں پہنچے تو ان کی چھوٹی بچی روتی ہوئی آپ کی گود میں آگئی۔ اسے روتے دیکھ کر آپ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بولے۔ ”یہ کیا ہے؟“ اسے اللہ کے رسول! ”یہ حبیب کا اپنے حبیب پر رونا ہے“ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ

ہم اس وقت مکہ مکرمہ کی سرزمین میں ہیں۔ اور یہ سترہ سال کا زمانہ ہے۔ اس وقت رسول اللہ ان غیر معمولی آلام و مصائب کا سامنا کر رہے ہیں جو قریش کے ہاتھوں آپ اور آپ کے اصحاب پر نازل ہو رہی ہیں اور اپنے کندھوں پر دعوتِ اسلامی کے افکار و ہجوم کے اس بوجھ کو اٹھائے ہوئے ہیں جس نے آپ کی زندگی کو رنج و بلا کے لانتنا ہی سلسلے سے منسلک کر دیا، انھیں صبر آزما اور زہرہ گداز لمحات میں سرور و انبساط کی ایک روشنی اس مژدہ جاں فرما کے ساتھ آپ کی زندگی میں نمودار ہوئی کہ اُم ایمن نے ایک لڑکے کو جنم دیا ہے۔ یہ خبر سن کر آپ کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک اٹھا اور پیشانی کی لکیں روشن ہو گئیں۔

کون تھا وہ نیک بخت بچہ، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی خوشی سے ہم کنار کیا تھا؟
وہ اسامہ بن زید بن زید تھے۔

اس نومولود کی پیدائش پر رسول اللہ کا خوش ہونا آپ کے اصحاب میں سے کسی کے لیے باعث حیرت نہ تھا، کیوں کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ اس کے والدین کا آپ کے نزدیک کیا مقام و مرتبہ ہے۔ بچے کی ماں ”برکہ حبشیہ“ تھیں جو اپنی کنیت اُم ایمن کے ساتھ مشہور تھیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی والدہ آمنہ بنت وہب کی لونڈی تھیں۔ انھوں نے آپ کی والدہ کی زندگی میں آپ کی پرورش کی اور ان کے انتقال کے بعد آپ نے انھیں کی آغوشِ تربیت میں نشوونما پائی۔ چنانچہ آپ نے دنیا میں ہوش کی آنکھیں اس حال میں کھولیں کہ ان کے سوا کسی کو "ماں" نہیں جانتے تھے۔ اس وجہ سے آپ ان کے ساتھ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ آپ ان کے متعلق اکثر فرمایا کرتے تھے۔

”هِيَ اُمِّي بَعْدَ اُمِّي وَ بَقِيَّةُ
اَهْلِ بَيْتِي“
”یہ میری ماں ہیں، میری ماں کے بعد
اور میرے گھر والوں میں سے باقی ماندہ ہیں۔“

تو یہ ہیں اس سعادت مند بچے کی ماں۔ رہے اُس کے والد، تو وہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب، اسلام سے پہلے آپ کے منہ بولے بیٹے، آپ کے صحابی و راز دار، آپ کے خاندان کے ایک فرد اور اسلام کے بعد لوگوں میں آپ کے نزدیک محبوب ترین شخص، حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ۔

حضرت اسامہ ابن زیدؓ کی پیدائش کے موقع پر جیسی خوشی مسلمانوں کو حاصل ہوئی ویسی ان کے علاوہ کسی دوسرے بچے کی پیدائش پر نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ ہر وہ چیز جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعثِ رحمت و سرور ہوئی وہ مسلمانوں کے لیے بھی وجہِ مسرت و شادمانی ہوتی تھی! اس لیے مسلمانوں نے اس خوش بخت بچے کا لقب ”حب“ اور ”ابن الحب“ رکھ دیا تھا۔ اور انھوں نے اس کا یہ لقب رکھتے وقت دراصل کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا تھا۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اُس سے ایسی محبت رکھتے تھے کہ ساری دنیا اس پر رشک کرتی تھی۔

حضرت اسامہ ابن زیدؓ آپ کے نواسے حضرت حسن بن فاطمہؓ زہرا رضی اللہ عنہما کے تقریباً ہم سن تھے۔ حضرت حسنؓ گورے، تابندہ رو، نہایت خوب صورت اور اپنے نانا جان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ مشابہ تھے۔ اور حضرت اسامہؓ کارنگ سانولا اور ان کی ناک چھٹی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبت میں ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھتے تھے۔ آپ حضرت اسامہؓ کو اپنے ایک زانو پر اور حضرت حسنؓ کو دوسرے زانو پر بٹھاتے، پھر ان دونوں کو ایک ساتھ اپنے سینے سے چمٹاتے ہوئے فرماتے تھے۔

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَحِبُّهُمَا
فَأَحِبَّهُمَا.»

”خدا یا! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان سے محبت کر۔“

حضرت اسامہؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار جب وہ دروازے کی دہلیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑے، ان کی پیشانی زخمی ہو گئی اور زخم سے خون جاری ہو گیا تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اشارہ فرمایا کہ اٹھ کر ان کا خون بند کریں۔ لیکن جب وہ نہیں اٹھیں تو آپ خود ہی اٹھے اور خون کو بند کرنے کے لیے ان کے زخم کو چومنے لگے۔ آپ خون چوستے جاتے اور تھوکتے جاتے اور ایسے الفاظ میں ان کی دل داری فرماتے جارہے تھے جن سے شفقت و رحم دلی کے جذبات اُٹھے پڑ رہے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بچپن میں ان سے محبت کرتے تھے، جوانی میں بھی اس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ قریش کے ایک رئیس حکیم بن حزام نے آپ کی خدمت میں ایک نہایت بیش قیمت جوڑا ہدیہ کیا جو

انہوں نے یمن سے پچاس دینار میں خریدا تھا۔ وہ جوڑا یمن کے مشہور بادشاہ "ذی یزن" کا تھا۔ چونکہ اُس وقت حکیم بن حزام مشرک تھے اس لیے آپ نے اُن کا ہدیہ قبول نہیں کیا بلکہ اُن کو اس کی قیمت ادا کر دی۔ آپ نے اس کو صرف ایک دفعہ جمعہ کے دن پہنا اور پھر اتار کر حضرت اُسامہؓ کو دیدیا، جسے پہن کر وہ صبح و شام اپنے ہم جوہی ہاجر اور انصاری نوجوانوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے نکلتے تھے۔

حضرت اُسامہؓ جب سن بلوغ کو پہنچے تو ان کی شخصیت سے ان کریمانہ عادات و اطوار اور اُن شریفانہ خصائل و اخلاق کا نمایاں طور پر اظہار ہونے لگا جو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے شایانِ شان ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔

وہ نہایت ذہین اور غیر معمولی طور پر بہادر تھے۔ وہ دانش مند ایسے تھے کہ ہر معاملے کے موقع و محل کو سمجھتے اور اسی کے مطابق اسے نمٹاتے تھے۔ وہ نہایت پاکباز تھے، سطحی قسم کے اعمال و حرکات سے کوسوں دُور رہتے، بے تکلف اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے، لوگ ان سے محبت کرتے، نہایت متقی اور پرہیزگار تھے، اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا تھا۔

غزوہ اُحد کے موقع پر حضرت اُسامہؓ چند نوجوان صحابہ کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کے ارادے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان میں سے جن کو لینا تھا، لے لیا۔ باقی لوگوں کو ان کی کم سبزی کی وجہ سے واپس فرما دیا۔ واپس کیے جانے والوں میں خود حضرت اُسامہؓ بھی تھے۔ جب ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے جہاد کرنے کا موقع نہیں ملا تو وہ اس سعادت سے محرومی پر بہت غمگین

ہوتے۔ واپس لوٹے ہوئے ان کی ننھی ننھی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔

غزوہ خندق کے موقع پر بھی وہ اور متعدد نوجوان صحابہؓ بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے، حضرت اسامہؓ کے شوقِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ پنچوں کے بل کھڑے ہو کر وہ اپنے قد کو اونچا کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت دے دیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترس کھا کر ان کو اجازت مرحمت فرمادی۔ چنانچہ جس وقت انھوں نے پہلے پہل جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تلوار اٹھائی اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی۔

جنگِ حنین میں، جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے حضرت اسامہ ابن زیدؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ، آپ کے ابن عم حضرت ابوسفیان ابن حارثؓ اور چھ دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ بات ممکن ہوئی کہ مسلمانوں کے اسی مختصر اور جانبا زگروہ کے ذریعے اپنے اوصیاء کی شکست کو فتح و کامرانی سے تبدیل کر سکیں اور بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو مشرکین کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا سکیں۔

غزوہ موتہ میں وہ اپنے والد حضرت زید بن حارثہ کے زیر قیادت اٹھارہ سال کی عمر میں شریک ہوئے۔ انھوں نے اپنے والد کو اپنی آنکھوں کے سامنے میدانِ جنگ میں شہید ہو کر گرتے دیکھا، لیکن نہ تو اس سے ان کے حوصلے پست ہوئے نہ ان کے پائے استقلال میں کسی قسم کی کوئی لغزش پیدا ہوئی۔ بلکہ وہ لڑتے رہے ان کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب کی

قیادت میں حتیٰ کہ وہ شہید ہو گئے اور پھر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی ماتحتی میں یہاں تک کہ وہ بھی اپنے دونوں ساتھیوں سے جا ملے اور پھر حضرت خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں یہاں تک کہ انہوں نے اس مختصر لشکر کو رومیوں کے پنجے سے نکال لیا۔ پھر وہ اپنے والد کی شہادت پر اللہ تعالیٰ سے بہترین اجر و ثواب کی امید لیے ہوئے اور ان کے جسد مقدس کو شام کی سرحد پر چھوڑ کر مدینے واپس لوٹے۔ لوٹتے وقت وہ اسی گھوڑے پر سوار تھے جس پر ان کے والد نے شہادت پائی تھی۔

اللہ بجز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے جنگ کے لیے ایک فوج کی تیاری کا حکم دیا اور اس میں حضرت ابوبکر، عمر، سعد بن ابی وقاص اور ابو عبیدہ ابن جراح رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہ کرام کو شامل کیا اور اس پوری فوج کی قیادت حضرت اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہما کے سپرد کی۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال سے متجاوز نہ تھی۔ آپ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے سواروں کو لے کر حدود "بلقاء" اور قلعہ "داروم" تک ان سارے علاقوں کو روند ڈالیں جو روم کے شہر "غزہ" سے متصل واقع ہیں۔

یہ لشکر ابھی کوچ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت تاساڑ ہو گئی۔ اور جب آپ کا مرض شدت اختیار کر گیا تو فوج نے اس وقت تک اپنی روانگی موقوف کر دی جب تک آپ کے مرض کی کوئی واضح صورت حال سامنے نہیں آ جاتی۔ حضرت اسامہؓ کا بیان ہے کہ

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری نے تشویش ناک صورت

اختیار کر لی تو میں اور میرے ساتھ دوسرے لوگ واپس آ گئے۔ میں سرکار
رفدہ ابی داعی، کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے آپ کو اس حال میں پایا
کہ آپ مرض کی شدت کے سبب بول نہیں پارہے ہیں۔ آپ اپنے دست
مبارک کو آسمان کی طرف اٹھاتے اور میرے اوپر رکھتے رہے۔ اس سے میں
نے یہ سمجھا کہ آپ میرے لیے دعا فرما رہے ہیں۔“

پھر آپ کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد جب حضرت ابو بکر رضی اللہ
عنه کے لیے خلافت کی بیعت مکمل ہو گئی تو انھوں نے جیش اسامہ کی روانگی
کا حکم صادر فرمایا، لیکن انصار میں سے کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ سر دست اس
ہم کو موخر کر دیا جائے۔ انھوں نے حضرت عمر فاروق رضی سے اس بات کی خواہش
کی کہ وہ اس معاملے میں حضرت ابو بکر رضی سے بات کریں۔ ان لوگوں نے یہ
بھی کہا کہ اگر وہ نہ مانیں اور فوج کی روانگی پر اصرار کریں تو ان کی خدمت میں
ہماری طرف سے یہ درخواست پہنچا دیجئے کہ وہ فوج کی قیادت کسی ایسے
شخص کے حوالے کر دیں جو اسامہ سے سن رسیدہ ہو۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی حضرت عمر رضی کی زبان سے انصار کا یہ پیغام سنتے
ہی اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ان
کی داڑھی پکڑ کر نہایت غضبناک لہجے میں بولے۔

”ثَكَلْتُكَ اُمَّتِي يَا بَنِي الْخَطَّابِ
اَسْتَعْلَمَهُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَأْمُرُنِي اَنْ اَنْزِعَهُ
وَاللهِ لَا يَكُوْنُ ذَالِكُ“

”خطاب کے بیٹے! تمہاری ماں تمہیں گم
کرے، رسول اللہ نے اس کو مقرر کیا
اور تم مجھے کہتے ہو کہ میں اسے معزول
کردوں۔ خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا۔“

جب حضرت عمر رضی لوٹ کر ان کے پاس پہنچے اور انھوں نے دریافت

کیا کہ حضرت ابو بکر رضی نے کیا جواب دیا تو وہ خفا ہوتے ہوئے بولے۔
 ”اَمْضُو نِيْكَتِكُمْ اُمَّهَاتِكُمْ - لَقَدْ لَقِيْتُ فِي سَبِيْلِكُمْ مِنْ خَلِيْفَةٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ مَا لَقِيْتُ -“
 ہٹو، تمہاری مائیں تمہیں گم کریں۔ تم لوگوں کی وجہ سے مجھے خلیفہ رسول سے سخت ڈانٹ سننی پڑی ہے۔“

مجاہدین کا یہ لشکر جب اپنے نوجوان قائد کی قیادت میں روانہ ہوا تو خلیفہ رسول اس کو رخصت کرنے کے لیے پا پیادہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ حضرت اسامہؓ نے جو اپنے گھوڑے پر سوار تھے ان سے کہا۔
 ”خلیفہ رسول! خدا کی قسم، یا تو آپ سوار ہو جائیں ورنہ میں بھی نیچے اترتا ہوں۔“

لیکن حضرت ابو بکر رضی نے سوار ہونے کے بجائے ان سے کہا

”خدا کی قسم، نہ تم نیچے اترو گے، نہ میں سوار ہوں گا۔۔۔۔۔ کیا حرج ہے اگر میرے پاؤں بھی تھوڑی دیر خدا کی راہ میں گرد آلود ہو لیں؟“
 پھر ان کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں تمہارے دین و ایمان اور خاتمہ اعمال کو خدا کے حوالے کرتا ہوں اور تم کو رسول اللہ صلعم کے حکم کی تعمیل کی نصیحت کرتا ہوں جو انھوں نے تم کو دیا تھا۔“
 پھر ان کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

اگر مناسب سمجھو تو عمر کے ذریعہ میری مدد کرو اور انھیں میرے پاس مرکب جانے کی اجازت دے دو۔“ اور انہوں نے حضرت عمرؓ کو اجازت دے دی۔ حضرت اسامہ ابن زیدؓ فوج لے کر روانہ ہوئے اور انھوں نے ہر اس حکم کی تعمیل کی جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیا تھا۔ انھوں نے مسلمان شہسواروں کو لے کر بلقار کے سرحدی حدود اور سرزمین اسیطین کے قریب قلعہ داروم تک تمام رومی علاقوں کو روند ڈالا۔ انھوں نے

رومیوں کی ہیبت مسلمانوں کے دلوں سے نکال پھینکی اور ان کے سامنے شام
مصر اور شمالی افریقہ میں بحرِ ظلمات تک فتح کی راہیں ہموار کر دیں۔ اور پھر وہ اسی
گھوڑے پر سوار مدینہ واپس لوٹے جس پر ان کے والد شہید ہوئے تھے۔
وہ اپنے ساتھ اس قدر مالِ غنیمت لے کر لوٹے تھے جس کا اندازہ لگانا مشکل
تھا۔ یہاں تک کہ کہا گیا،

”مَارِئِيْ جَيْشِ اسْلَمٍ وَاغْنَمَ“ آج تک ایسا کوئی لشکر دیکھنے میں نہیں آیا
جو جیشِ اُسامہ مِنْ جَيْشِ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ سے زیادہ محفوظ ہو اور اس سے
زیادہ مالِ غنیمت لے کر لوٹا ہو۔“

حضرت اُسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ۔ جب تک ان کی زندگی نے وفا کی
۔ رسول اللہ کے پاس وفا اور آپ کی تعظیم کی علامت کے طور پر مسلمانوں کی
محبت و تکریم کا مرکز بنے رہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے جو وظیفہ اُن کے لیے
مقرر کیا وہ اُن کے فرزند حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ تھا۔ اس پر انھوں
نے اپنے والد سے کہا،

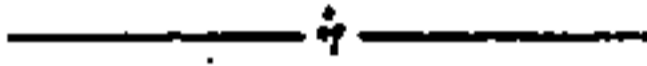
”ابا جان! آپ نے اُسامہ کے لیے چار ہزار اور میرے لیے صرف تین
ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا ہے، حالانکہ نہ اُن کے والد آپ سے افضل تھے، نہ
انھیں کو مجھ پر کوئی فضیلت حاصل ہے۔“
حضرت عمر نے ان کو جواب دیا کہ

”تمہاری یہ بات حقیقت سے بہت دُور ہے۔۔۔۔۔ یقیناً اُسامہ کے
باپ تمہارے باپ سے اور خود وہ تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ
محبوب تھے۔“ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سن کر مطمئن ہو گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے ملتے تو کہتے۔
 ”مَوْحِبًا بَا مِثْرِي“ میرے امیر! خوش آمدید“ اور جب کسی کو اس پر
 تعجب ہوتا تو فرماتے۔

”لَقَدْ آمَرَهُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“
 ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو
 میرا امیر مقرر فرمایا تھا۔“

اللہ تعالیٰ ان عظیم ہستیوں پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرماتے۔ یہ
 ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پوری تاریخ افراد انسانی کے کسی ایسے گروہ
 سے نا آشنا ہے جو اصحاب رسول رضوان اللہ علیہم سے زیادہ عظیم، کامل
 اور شریف ہو۔



حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ

زید بن عمرو بن نفیل لوگوں کے ہجوم سے دور کھڑے ہو کر قریش کو دیکھ رہے تھے جو ایک تہوار کے موقع پر جشن منانے اور تہہ سہی رسوم ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے مردوں کو دیکھا جو ہمیشہ قیمت ریشی عمامے اپنے سروں پر باندھے، قیمتی مہنی چادروں میں لپٹے بڑے فخر و غرور کے ساتھ اترتے پھر رہے تھے۔ ان کی نظریں ان عورتوں اور بچوں پر پڑیں جو زرق برق لباس زیب تن کیے اور نادر قسم کے زیورات سے آراستہ میلے کی رونق میں اضافہ کر رہے تھے۔ ان کی نگاہیں ان جانوروں کی طرف بھی گئیں جنہیں مکے کے خوشحال لوگ قسم قسم کی زینتوں سے آراستہ کر کے بتوں کے سامنے ذبح کرنے کے لیے کھینچے لیے جا رہے تھے۔ وہ خانہ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور قریش کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

”قریش کے لوگو! بکری کو اللہ نے پیدا کیا، اسی نے آسمان سے پانی برسایا جس کو پی کر وہ سیراب ہوئی۔ اسی نے زمین سے گھاس اگائی، جس کو کھا کر وہ آسودہ ہوئی، اور تم ہو کہ اُسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کے لیے کھینچے لیے جا رہے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم بڑے نادان اور جاہل لوگ ہو۔“

یہ سن کر ان کے چچا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے والد خطاب

غصے میں بھرے ہوئے ان کے پاس پہنچے اور انھیں تھپڑ مارتے ہوئے بولے۔

”تیرا ناس ہو، تیری یہ بکواس ہم مسلسل سنتے اور اسے برداشت کرتے چلے آ رہے ہیں مگر اب ہمارے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔“ اور پھر انھوں نے اپنے قبیلے کے اوباشوں اور لٹوں، لفتنگوں کو ان کے خلاف ابھار دیا جو ان کے پیچھے پڑ گئے اور ان کو اتنا ستایا کہ انھیں مجبوراً مکہ چھوڑ کر کوہِ حرا کی طرف نکل جانا پڑا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ صرف کبھی کبھی وہ بھی چھپ کر مکے میں داخل ہو پاتے تھے۔

ایک مرتبہ وہ قریش کی لاعلمی میں ورقہ ابن نوفل، عبداللہ بن محس، عثمان بن حارث اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب سے جا ملے۔ ان کی اس مجلس میں وہ گمراہی زیر بحث تھی جس میں قریش کے لوگ سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے تھے۔ آخر زید نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”خدا کی قسم، تم لوگوں کو یہ بات خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہاری قوم کے لوگ ہدایت پر نہیں ہیں۔ انھوں نے دینِ ابراہیمی کو فراموش کر دیا۔ اور اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے ہیں۔ لہذا اگر نجات چاہتے ہو تو اپنے لیے کوئی دین تلاش کرو اور اسی کے مطابق زندگی گزارو۔“

چنانچہ ان میں سے چاروں مرد، حنیفیت (دینِ ابراہیمی) کی تلاش میں یہودی اور نصرانی عالموں اور دیگر مذاہب کے اصحاب علم کے پاس پہنچے۔ ان میں سے ورقہ ابن نوفل نے تو نصرا نیت اختیار کر لی لیکن عبداللہ بن محس اور عثمان بن حارث کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے۔ رہے زید بن عمرو ابن

نفیل تو ان کی تلاشِ حق کی ان سرگرمیوں کی روداد انھیں کی زبانی سنیے وہ کہتے ہیں۔

”میں نے یہودیت اور نصرانیت پر غور کیا مگر مجھے ان دونوں مذاہب میں ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے مجھے ان کے دینِ حق ہونے پر اطمینان حاصل ہوتا، چنانچہ میں نے ان دونوں سے صرفِ نظر کر لیا اور دینِ ابراہیمی کی تلاش میں مختلف علاقوں کی خاک چھانتا پھرا۔ اسی سلسلے میں جب میں شام پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ قلاں راہب کے پاس کتاب اللہ کا علم ہے۔ میں اس کے پاس پہنچا اور اپنے مقصد سے اس کو باخبر کیا۔ میری باتیں سن کر اس نے کہا۔

”مکی بھائی! میرا خیال ہے کہ تم دینِ ابراہیمی کی تلاش میں ہو۔“

”ہاں“ میں نے کہا۔ ”مجھے اُسی کی جستجو ہے۔“

تب اس نے مجھ کو بتایا کہ

”تم وہ دین ڈھونڈ رہے ہو جس کا آج کہیں وجود نہیں ہے۔ تم اپنے شہر واپس جاؤ اللہ تعالیٰ عنقریب وہاں سے ایک شخص کو منصبِ رسالت پر مامور کرنے والا ہے، جو دینِ ابراہیم کی تجدید کرے گا۔ اگر تم اس کو پا جانا تو اسے لازم پکڑ لینا۔“

زید نبی موعود کی طلب میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے مکہ کی طرف واپس لوٹے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق دے کر مبعوث فرمایا۔ لیکن زید آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے کیونکہ دورانِ سفر بدوں کی ایک ٹولی نے حملہ کر کے مکہ پہنچنے سے پہلے ہی ان کو قتل کر ڈالا اور ان کی تشنہ کام آنکھیں رسول اللہ کے دیدار سے سیراب نہ ہو سکیں۔ جس وقت وہ اپنی زندگی کی آخری

سانسیں لے رہے تھے، انھوں نے اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانے ہوئے کہا۔

”اللَّهُمَّ اِنْ حَرَمْتَنِي مِنْ هَذَا الْخَيْرِ فَلَا تَحْرِمِ مِنِّي ابْنِي سَعِيداً“
 ”خدا یا! اگرچہ تو نے مجھے اس خیر سے محروم کر دیا ہے مگر میرے بیٹے سعید کو اس سے محروم نہ کرنا۔“

اور اللہ تعالیٰ کی مشیت نے زید کی اس دعا کو شرف قبولیت سے نواز دیا۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو زید کے بیٹے سعید ان لوگوں میں تھے جو سب سے پہلے اللہ پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس کے نبی کی تصدیق کی۔ اور اس میں کسی حیرت و استعجاب کی بات اس لیے نہیں ہے کہ ان کی نشوونما ایک ایسے گھر میں ہوئی تھی جو ان گراہیوں سے سخت متنفر تھا جس میں قریش کے لوگ بتلا تھے اور ان کی پرورش ایک ایسے باپ کی آغوش تربیت میں ہوئی تھی جو زندگی بھر حق کی تلاش میں سرگرداں رہا اور اسے موت آئی تو اس حال میں کہ وہ حق کو پالنے کی آرزو دل میں لیے تیزی سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

سعید بن زید رضی اللہ عنہ تنہا مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے بلکہ ان کے ساتھ ان کی زوجہ محترمہ، حضرت عمر کی بہن حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا بھی دولت ایمان سے بہرہ ور ہوئیں۔ اس قریشی نوجوان نے اپنی قوم کے ہاتھوں اپنے دین کی آزمائش کی راہ میں ایسی ایسی زہرہ گرازا اور صبر آزما اذیتوں کا سامنا کیا جن کا وہ اپنے مقام بلند کی وجہ سے مستحق تھا۔ لیکن قریش اس کو دین اسلام کے پھیر لینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بلکہ اس کے

برعکس وہ اور اس کی بیوی دونوں مل کر ایک نہایت وزنی اور کفر کی نہایت اہم شخصیت کو اسلام کی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ یعنی وہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا سبب بنے۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جس وقت دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، اس وقت ان کی عمر بیس سال سے متجاوز نہ تھی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی پوری جوانی اور اس کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں خدا کے راستہ میں کھپا دیں۔ وہ بدر کے سوا تمام غزوات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے۔ غزوہ بدر کی عدم شرکت بھی ان کی کسی غفلت یا بے اعتنائی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ایک دوسری اہم ذمہ داری ان کے سپرد کی تھی۔

انھوں نے کسریٰ، شاہ ایران کو تخت و تاج سے محروم کرنے اور قیصر، شہنشاہ روم کو اس کے ملک سے بے دخل کرنے میں مسلمانوں کے ساتھ بھرپور حصہ لیا اور مسلمانوں کو جب بھی کسی خطرناک معرکہ کا سامنا کرنا پڑا، حضرت سعید بن زید نے اس میں بے مثال جرات و شجاعت کا مظاہرہ کیا اور نہایت تابناک اور قابل تعریف کارنامے انجام دیے۔ ان کی دلیری و جاں بازی کا حیرت ناک کارنامہ وہ ہے جو جنگ یرموک میں انھوں نے انجام دیا تھا اور جو اس کی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔ اس کی ایک ہلکی سی جھلک ان کے اس بیان سے ہمارے سامنے آتی ہے جسے تاریخ نے ان کے ان الفاظ میں ہمیشہ کے لیے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا ہے۔

”غزوہ یرموک کے موقع پر ہماری تعداد تقریباً چوبیس ہزار تھی اس کے مقابلے میں رومی فوج ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ وہ اس طرح بھاری قدموں کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہے تھے جیسے پہاڑ ہوں جنہیں خفیہ ہاتھ حرکت دے رہے ہوں۔ ان کے راہب اور بزرگ مذہبی پیشوا اپنے ہاتھوں میں صلیبیں اٹھائے ان کے آگے آگے چل رہے تھے۔ وہ بلند آواز سے اپنی فوج کی فتح و کامرانی کی دعائیں مانگ رہے تھے اور ان کے پیچھے ان کی پوری فوج ان کے الفاظ کو اس طرح بلند آہنگی کے ساتھ دہرا رہی تھی جیسے بجلی گرج رہی ہو۔ جب مسلمانوں نے ان کو اس حال میں دیکھا تو ان کی کثرت تعداد کی وجہ سے ان کے اوپر گھبراہٹ طاری ہو گئی اور ان کے دلوں میں اُن کا خوف سرایت کر گیا۔ اس وقت ابو عبیدہ ابن جراح جو فوج کے سپہ سالار تھے۔ کھڑے ہوئے اور انہوں نے مسلمانوں کو جہاد و قتال اور جاں بازی و جاں سپاری پر ابھارتے ہوئے کہا۔

”اللہ کے بندو! اللہ کی مدد کرو، وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔ اللہ کے بندو! اللہ کی راہ میں ڈٹ جاؤ اور صبر سے کام لو۔ صبر، یقیناً کفر سے نجات کا، رضائے الہی کے حصول کا اور ذلت و عار کو دفع کرنے کا ذریعہ ہے۔ اپنے نیزے کو تان لو، اپنی ڈھالوں کو اڑ بنا لو اور جب تک میں تمہیں حملہ کرنے کا اشارہ نہ کروں، خاموشی اختیار کیے رہو اور دلوں میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہو“

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے لگے فرماتے ہیں۔

”اسی وقت مسلمانوں کی صف میں سے ایک شخص باہر نکلا اور آگے بڑھ کر اُس نے ابو عبیدہؓ سے کہا۔

”میں اسی وقت خدا کی راہ میں اپنی جان نثار کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ تو کیا آپ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں؟“

”ہاں!“ انھوں نے کہا۔ ”تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں میری اور تمام مسلمانوں کی طرف سے سلام پہنچانے کے بعد عرض کر دینا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے رب نے ہم سے جو وعدے کیے تھے وہ سب ایک ایک کر پورے ہو گئے۔“

حضرت سعید بن زید فرماتے ہیں،

”میں نے جیسے ہی اس کی باتیں سنیں اور اسے میان سے تلوار کھینچ کر دشمن کے مقابلے میں جاتے دیکھا، زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنا نیزہ سیدھا کر لیا اور لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اور دشمن کی طرف سے سب سے پہلا سوار جو ہماری طرف بڑھا اُسے اپنے نیزے میں پرو لیا پھر دشمن پر جھپٹ پڑا۔ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ میرے دل سے ہر قسم کے خوف و ہراس کو دور کر چکا تھا۔ اور پھر سارے مسلمان رومیوں پر یکبارگی ٹوٹ پڑے اور جب تک اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی نصرت اور کامیابی سے نواز نہیں دیا، برابر ان سے مصروفِ جدال رہے۔“

اس کے بعد حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ دمشق کی فتح میں شریک ہوئے۔ جب اہل دمشق نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تو حضرت ابو عبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ نے ان کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس

طرح حضرت سعید بن زید دمشقی کے سب سے پہلے مسلمان گورنر تھے۔

حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس کو مدینے کے لوگ بہت دنوں تک بیان کرتے رہے۔ ہوا یہ کہ اُروی بنت اوس نامی ایک عورت نے دعویٰ کیا کہ سعید بن زید نے اس کی زمین کا ایک حصہ غصب کر کے اپنی زمین میں شامل کر لیا ہے۔ پہلے تو وہ اس بات کو مسلمانوں میں ادھر ادھر بیان کر کے سعید بن زید کو بدنام کرتی رہی پھر اسے ایک مقدمے کی شکل میں مروان کی عدالت میں پیش کر دیا جو اس وقت مدینے کا گورنر تھا۔ جب مروان نے اس معاملے میں گفتگو کرنے کے لیے چند آدمیوں کو ان کے پاس بھیجا تو یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معزز صحابی کو بہت شاق گزری اور انھوں نے فرمایا۔

”لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے اس کی زمین دہالی ہے!! میں یہ ظالمانہ حرکت کیسے کر سکتا ہوں؟ جب کہ میں نے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔

”جو شخص کسی کی ایک بالشت زمین غصب کرے گا، قیامت کے روز ساتوں زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔“

”مَنْ ظَلَمَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ طَوَّقَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ“

پھر انھوں نے اس کے حق میں بددعا کرتے ہوئے فرمایا۔

”خدا یا! وہ کہتی ہے کہ میں نے اس کے اوپر ظلم کیا ہے۔ اگر وہ جھوٹی ہے تو اسے نابینا کر کے اسی کنویں میں گرا دے جس کے بارے میں وہ مجھ سے جھگڑ رہی ہے۔“

اس کے چند ہی دنوں کے بعد وادی عقیق میں ایسا زبردست سیلاب

آیا جس نے پھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ اس سیلاب نے دونوں زمینوں کے درمیان واقع حد فاصل کو ظاہر کر دیا جس کے متعلق دونوں کے درمیان اختلاف واقع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کھل کر سب کے سامنے آگئی کہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اس معاملے میں حق پر تھے۔ اور ایک ہینہ گزرتے گزرتے وہ عورت اندھی ہو گئی، اور ایک دن جب وہ اپنی اسی زمین میں گھوم رہی تھی۔ کنویں میں گر پڑی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں۔ ہم لوگ اس وقت، اپنے لڑکپن میں ایک شخص کو دوسرے شخص سے یہ کہتے ہوئے سنتے تھے۔

”اَعْمَاكَ اللهُ كَمَا اَعْبَى
الَادْوَى“
”اللہ تعالیٰ تجھے اندھا کر دے جیسا کہ
ارویٰ کو کیا ہے“

اور اس میں کسی تعجب کا مقام نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

”الْفُؤَادُ دَعْوَةٌ الْمَظْلُومِ فَإِنَّهُ
لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللهِ
حِجَابٌ“
”مظلوم کی بددعا سے بچو، کیونکہ اس کے
اور خدا کے درمیان کوئی
حجاب نہیں ہے“

خصوصاً اس وقت خدا اور بندہ مظلوم کے درمیان کیسے کوئی حجاب
حائل ہوتا جب مظلوم حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ تھے جو ان دس
نفوس قدسیہ میں سے تھے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا
ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی۔

حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ

نہتھے عمیر نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ اس کے باپ سعد کا انتقال ہو گیا اور اس کی پیشانی پر تھپی کا داغ لگ گیا۔ باپ نے مرتے وقت نہ مال دولت چھوڑی تھی نہ کوئی سرپرست، جس کی وجہ سے عمیر بے یار و مددگار اور بے سہارا رہ گیا۔ لیکن بیوہ ہونے کے کچھ دنوں بعد ہی اس کی ماں نے قبیلہ بنی اوس کے ایک مالدار شخص جلاس ابن سوید سے نکاح کر لیا جس نے عمیر کو اپنی سرپرستی میں لے کر اس کی کفالت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ جلاس نے عمیر کو اتنا پیار دیا، اس سے ایسی شفقت و محبت کا برتاؤ کیا اور اس کے ساتھ اس طرح حسن سلوک سے پیش آیا کہ اسے کبھی اپنی تھپی کا احساس تک نہ ہوا۔

عمیر کو نشوونما پاتے اور پروان چڑھتے دیکھ کر جلاس پھولے نہ سماتا کیونکہ عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس کے تمام اعمال و افعال اور اس کی ساری حرکات و سکنات میں ذہانت و فطانت اور صداقت و دیانت کے آثار واضح طور پر محسوس ہو رہے تھے۔

عمیر ابن سعد کی عمر ابھی دس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی کہ وہ اسلام کے

ٹھنڈے اور نرم سائے میں آگیا ایمان اس کے سادہ، پاک اور معصوم
 دل میں اچھی طرح جاگزیں ہو گیا اور اسلام کا بیج اس کے زرخیز وجود کو موافق
 اور سازگار پاکر خوب برگ و بار لایا۔ عمیر بن سعد اپنی کم عمری کے باوجود ہر نماز
 رسول کریم کے پیچھے باجماعت ادا کرتا اور جب اس کی ماں کبھی اسے اکیلے
 اور کبھی اپنے شوہر کے ساتھ مسجد جلتے یا مسجد سے واپس آتے دیکھتی تو اس کا
 دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے عمیر بن سعد کی زندگی کے شب و روز
 اسی طرح عیش و آرام اور مسرت و شادمانی کے ساتھ گزر رہے تھے کہ خدائے
 تعالیٰ نے اسے ایک سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا، مشیت ایزدی نے
 اس کو ایک ایسے بڑے امتحان میں ڈال دیا کہ شاید ہی اس عمر کا کوئی بچہ
 اس سے دوچار ہوا ہو۔

۹؎ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے جنگ کے
 لیے تموک جانے کا اعلان فرمایا اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے لیے تیار یا
 مکمل کر لیں۔ حضور کا معمول تھا کہ جب آپ کسی غزوہ کا ارادہ کرتے تو اسے
 صاف صاف بیان نہیں فرماتے تھے۔ اور صحابہ کرام متعین طور پر یہ نہیں
 سمجھ پاتے کہ کدھر اور کس سے جنگ ہوگی۔ مگر خلافت معمول غزوہ تموک
 کے موقع پر آپ نے صراحت کے ساتھ یہ بات بتادی تھی کہ رومیوں
 سے جنگ کے لیے تموک چلنا ہے کیوں کہ تموک کی یہ ہم بعد مسافت صعوبت
 سفر اور دشمن کی طاقت و قوت کے اعتبار سے بہت اہم تھی تاکہ مسلمان اس
 کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسب حال مناسب اور اطمینان بخش
 تیاری کر لیں۔ اس وقت موسم گرما شروع ہو چکا تھا، دھوپ میں کافی شدت
 آگئی تھی۔ باغوں میں پھل پک کر تیار تھے، سائے گھنے اور خوشگوار ہو گئے۔

تھے۔ اور اس وقت کسی جنگی ہم پر جانا اور ایسا طویل اور دشوار سفر کرنا آسان نہ تھا۔ مگر ان سب کے باوجود اسلام کے شہدائیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کا بہت خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ اور جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ البتہ منافقین کی ایک ٹولی اس ہم کو ناکام بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ ایسی باتیں کرتے جن سے مخلص مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جائیں۔ جوصلے ٹوٹ جائیں اور ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں۔ وہ حضور پر آوازے کتے اور اپنی نجی مجلسوں میں بے محابا ایسی باتیں اپنی زبانوں پر لاتے جو ان کے کفر کی واضح اور روشن دلیل ہوتیں۔

شکر کی روانگی سے چند روز قبل کی بات ہے۔ ایک دن عمیر بن سعد نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آیا۔ وہاں اس نے مسلمانوں کے ایشارہ و قربانی اور جذبہ انفاق فی سبیل اللہ کے جو حسین و دلکش مناظر دیکھے اور ایمان یقین اور عزم و حوصلہ سے بھرپور جو باتیں سُنیں، ان سے اس کا پیمانہ دل جوش و مسرت سے لبریز ہو رہا تھا۔ اس نے ہاجرین و انصار کی عورتوں کو دیکھا کہ وہ حضور کے سامنے آئیں اور اپنے زیورات اُتار کر خدمتِ اقدس میں پیش کر دیتیں تاکہ آپ مجاہدین کے لیے سامانِ جہاد فراہم کر سکیں۔ اُس نے اپنے سر کی آنکھوں سے حضرت عثمان بن عفان کو دیکھا وہ چمڑے کی ایک تھیلی جس میں ایک ہزار دینار تھے، لاتے اور اسے بارگاہِ نبوت میں پیش کر دیا۔ اس کی آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ حضرت عبدالرحمان بن عوف اپنے کندھے پر دو سو اوقیہ سونا لادے چلے آ رہے ہیں اور نبی کریم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، یہی نہیں، اس نے تو

یہ بھی دیکھا کہ ایک شخص اپنا بستر فروخت کے لیے پیش کر رہا ہے تاکہ اس کی قیمت سے وہ اپنے لیے ایک تلوار خرید کر جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو سکے۔

ایک طرف یہ دلکش اور حیرت انگیز مناظر کیے بعد دیکھو گے اس کے پردہ ذہن پر مرتسم ہو رہے تھے اور دوسری طرف وہ اس افسوس ناک اور حیرت انگیز صورت حال کا سامنا کر رہا تھا کہ جلاس اپنی خوش حالی اور فراخی کے باوجود جنگ کی تیاریوں سے یکسر غافل ہے اور اس کے یہاں اس سلسلے میں کوئی حرکت نہیں پائی جاتی۔ اس نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ وہ جلاس کو اس کی طرف توجہ دلائے گا اور اس کی ہمت اور حمیت مروت کو ابھارے گا۔ اس نے جلاس کے سامنے وہ ساری حوصلہ افزا اور ایمان افروز باتیں بیان کرنی شروع کیں جنہیں وہ سن کر آیا تھا اور ان تمام مناظر کی تصویر کشی کرنے لگا جنہیں اس کی آنکھیں دیکھ کر آئی تھیں۔ خاص کر اس نے ان مفلس مسلمانوں کے شوقِ جہاد کی روداد اسے سنائی جو حضور کے پاس آئے اور بڑی لجاجت کے ساتھ یہ درخواست بارگاہ رسالت میں پیش کی کہ انہیں بھی مجاہدین کی صف میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن نبی کریم نے ان کی درخواست اس وجہ سے رد کر دی کہ آپ کے پاس ان کے لیے سواریوں کا انتظام نہ تھا اور وہ اپنی اس محرومی پر آنسو بہاتے ہوئے واپس چلے گئے کہ ان کو وہ ساز و سامان میسر نہیں جن کو لے کر وہ جہاد میں شریک ہوں۔ اور اپنی آرزو پوری کریں۔ لیکن عمیر سے یہ باتیں سننے ہی جلاس کے منہ سے ایک ایسی بات نکلی جس نے اس کم سن مومن کے ہوش اڑا دیے۔ اس نے کہا۔

”اگر واقعی وہ سب کچھ برحق ہے جو یہ شخص (نبی کریمؐ) پیش کر رہا ہے تو ہم لوگ گدھوں سے بھی بدتر ہیں“ جلاس کے منہ سے نکلے ہوئے یہ لفاظ سن کر عمیر حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ جلاس جیسے تجربہ کار جہاندیدہ اور صاحبِ فہم شعور شخص کے منہ سے ایسی بات نکلے گی جو اسے یکایک دائرہ ایمان کے نکال کر حلقہ کفر میں داخل کر دے گی۔

نوعمر اور کم سن عمیر اس صورتِ حال سے سخت سراسیمہ و پریشان تھا۔ وہ اس فکر میں سرگشتہ و حیران تھا کہ اس وقت وہ اپنی ذمہ داری کس طرح ادا کرے۔ اس نے سوچا کہ جلاس کی طرف سے خاموشی اختیار کر کے اس کی پردہ پوشی کرنا خدا اور رسول سے خیانت کے مترادف اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے ہم معنی ہے۔ اور جو کچھ سنا ہے اُسے ظاہر کر دینے میں ایک ایسے شخص کی احسان فراموشی ہے جس نے اُسے باپ کا پیار دیا اور یتیمی و تنگ دستی کی حالت میں پناہ دی۔ نوجوان عمیر اس دوراہے پر تھوڑی دیر کے لیے حیران و ششدر کھڑا رہا۔ مگر جلد ہی وہ ایک قطعی اور آخری فیصلے پر پہنچ گیا۔ وہ جلاس کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے بولا۔

”خدا کی قسم اے جلاس! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد روئے زمین پر کوئی دوسرا شخص مجھے آپ سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ مگر آپ نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ اگر میں اس کا ذکر کروں تو آپ ذلیل و رسوا ہو جائیں گے۔ اور اگر خاموشی اختیار کروں تو جرم خیانت کا مجرم ٹھہروں اور اپنے دین و ایمان کو اپنے ہاتھوں تباہ و برباد کروں۔ میں اس بات کا عزم کر چکا ہوں کہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر آپ کی کہی ہوئی اس بات

سے نبی کریم کو آگاہ کر دوں گا۔ آپ اپنے لیے بچاؤ کا جو طریقہ چاہیں سوچ لیں۔“
 اس کے بعد عمیر ابن سعد نے مسجد پہنچ کر وہ سب کچھ رسول اکرم صلی اللہ
 علیہ وسلم کے گوش گزار کر دیا جو اس نے جلاس سے سنا تھا۔ نبی کریم نے اسے اپنے پاس ہی روک لیا
 اور ایک صحابی کو بھیجا کہ وہ جلاس کو بلا لائیں۔ بھڑی ہی دیر گزری تھی کہ جلاس بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا
 اور سلام کر کے آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔
 ”جلاس! یہ کیسی بات ہے جو عمیر نے تم سے سنی ہے؟“ پھر آپ
 نے وہ بات اسے بتائی۔

”اے اللہ کے رسول! اس نے سراسر کذب بیانی اور افترا پر دازی سے
 کام لیا ہے میں نے یہ بات نہیں کہی ہے۔“ جلاس نے ڈھٹائی کے ساتھ
 جواب دیا۔

یہ سن کر صحابہ کرام کی نظریں باری باری جلاس اور عمیر کے چہروں کا
 جائزہ لینے لگیں تاکہ وہ ان کے چہروں سے ان کے دلوں میں پوشیدہ
 باتوں کا اندازہ لگا سکیں۔ اور وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔
 ایک شخص جس کا دل نفاق کا مریض تھا بولا۔

”یہ لڑکا بڑا نافرمان اور احسان فراموش ہے۔ اپنے محسن کے ساتھ
 بدی کرنے پر تلا ہوا ہے۔“ دوسرے نے کہا۔ ”نہیں یہ ایک ہونہار اور
 سعادت مند بچہ ہے، اطاعتِ الہی کے زیر سایہ اس کی نشوونما ہوئی
 ہے۔ اس کے چہرے کے آثار اس کی صداقت کی گواہی دے رہے ہیں۔“
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر کی طرف رخ کیا تو دیکھا کہ اس کا
 چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور آنکھوں سے آنسو کی دھاریں بہ رہی ہیں۔ اس کے
 رخساروں اور سینے کو تر کر رہی ہیں اور وہ کہہ رہا ہے۔

”اے اللہ! اپنے نبی پر میرے بیان کی تصدیق نازل فرما دے،
اے اللہ!.....“

جلساں نے اپنے دفاع میں بولتے ہوئے کہا۔ ”اے اللہ کے رسول! میں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست اور حق ہے۔ آپ چاہیں تو ہم دونوں سے حلف لے لیں۔ اور میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں نے وہ بات نہیں کہی جو عمر نے آپ سے بیان کی ہے۔“

جیسے ہی وہ قسم سے فارغ ہوا اور لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹ کر عمر کی طرف منتقل ہوئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے آثار طاری ہو گئے۔ صحابہ کرام سمجھ گئے کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر ساکت و صامت اور پرسکون ہو کر بیٹھ گئے۔ اور ان کی نگاہیں حضور پر جم گئیں۔ اس وقت جلاس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیلتے جا رہے تھے اور عمر کے اوپر اطمینان اور انتظار کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ تھوڑی دیر میں آپ کے اوپر سے نزول وحی کے آثار زائل ہو گئے اور آپ نے فرمان الہی کی تلاوت فرمائی۔

یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کی ہے حالانکہ انہوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انہوں نے وہ کچھ کرتے کا ارادہ کیا جسے کرنے کے ان کا یہ سارا غصہ اسی بات پر ہے تاکہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے

يُخْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا، وَ
لَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ، وَكَفَرُوا
بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَتُمُوا بِمَا
كَمُ يَنَالُوا، وَمَا نَقَمُوا إِلَّا الَّذِي
اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ،
فَإِنْ يَتُوبُوا إِلَيَّ خَيْرًا لَّهُمْ
وَإِنْ يَتُوكُوا يُعَذِّبُهُمْ

اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا
الْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَكُمْ فِي الْأَرْضِ
مِنْ قَوْمٍ يَدُلُّونَ عَلَىٰ

فضل سے ان کو غنی کر دیا ہے۔ اب اگر
یہ اپنی روش سے باز آجائیں تو انہیں
کے لیے بہتر ہے، اور اگر یہ باز نہ آتے تو
اللہ ان کو دردناک عذاب دے گا دنیا
میں بھی اور آخرت میں بھی اور آخرت میں
کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو۔“

(توبہ - ۴۷)

اس کو سننے ہی جلاس خوف سے کانپنے لگا اور اس کی زبان اس کے
تالو سے چپک گئی۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا اور
بڑی مشکل سے بولا۔

بَلْ أَتُوبُ يَا رَسُولَ اللَّهِ - بَلْ أَتُوبُ ... عمیر نے سچ کہا تھا اور میں جھوٹا تھا۔
یا رسول اللہ! میری جان آپ پر فدا ہو۔ آپ اللہ سے دعا فرمائیں کہ وہ میری
توبہ قبول فرمائے۔“

آپ نے عمیر بن سعد کی طرف توجہ فرمائی تو دیکھا کہ مسرت کے آنسو اس
کے ایمان سے منور چہرے کو تر کر رہے ہیں۔ آپ نے دست مبارک بڑھا کر
نرمی سے اس کا کان پکڑا اور فرمایا۔

”بچے! تیرے کانوں نے جو کچھ سنا، صحیح سنا۔ تیرے رب نے تیری
بات کی تصدیق کر دی۔“

اس کے بعد جلاس مکمل طور پر دائرہ اسلام میں واپس آگئے اور زندگی بھر
اس پر ثابست قدم رہے۔ اور صحابہؓ نے بھی ان کے بہترین طرز عمل کو دیکھا
کیونکہ انہوں نے عمیر بن سعد کے ساتھ سابقہ برتاؤ میں کوئی کمی نہیں کی

بلکہ پہلے سے زیادہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے رہے۔ جب بھی ان کے سامنے عمیر کا ذکر چھڑتا تو کہتے کہ اللہ تعالیٰ اسے جزا بخیر عطا فرمائے، اس نے مجھے کفر سے نجات دلائی اور میری گردن کو جہنم کے عذاب سے چھڑا لیا۔ یہ نو عمر صحابی، حضرت عمیر بن سعدؓ کی بچپن کی تصویر ہے جو انتہائی حسین اور بے حد دل نواز ہے مگر ان کی جوانی کی تصویر اس سے کم خوشنما اور دل افروز نہیں ہے۔

حمص کے باشندے اپنے گورنروں کو پریشان اور ان کے خلاف شکایت کرنے میں مشہور تھے۔ جب بھی ان کے یہاں کوئی گورنر آتا، اس کے اندر ضرور کوئی نہ کوئی عیب ڈھونڈ نکالتے، اس کی شکایت دربار خلافت میں پہنچاتے۔ اور حلیفہ سے مطالبہ کرتے کہ اس کی جگہ پر اس سے بہتر حاکم مقرر کیا جائے۔ یہ دیکھ کر امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے طے کر لیا تھا کہ ان کے اوپر کسی ایسے شخص کو والی بناؤں گا جس کی سیرت و کردار پر انھیں کسی طرح سے اعتراض اور نکتہ چینی کا موقع نہ مل سکے۔ انھوں نے ایک ایک کر کے اپنے تمام قابل اعتماد افسروں پر نظر ڈالی۔ آخر کار ان کی نگاہ انتخاب حضرت عمیر بن سعدؓ پر جا کر ٹک گئی۔ ان کی نظر میں اس کے لیے ان سے زیادہ مناسب کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔

اس کے باوجود کہ انھوں نے شام کے علاقہ البحریرہ میں غازیان اسلام کے ایک لشکر کی قیادت کرتے ہوئے بہت سے شہروں اور قلعوں پر فتح کے پرچم لہرا دیے تھے۔ اور متعدد قبائل کو مطیع فرمان کر لیا تھا۔ امیر المومنین نے شام کے محاذ سے واپس بلا کر حمص کی گورنری کا عہدہ ان کے سپرد کیا

اور وہاں جانے کا حکم دیا۔ حضرت عمیر بن سعد کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ کے بالمقابل کوئی چیز قابل تزیح نہ تھی مگر انھوں نے امیر المومنین کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ جب وہ حمص پہنچے تو سب سے پہلے لوگوں کو مسجد میں نماز کے لیے جمع کیا۔ نماز ختم ہوئی تو تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا اور رسول پر درود و سلام کے بعد فرمایا۔

”لوگو! اسلام ایک محفوظ قلعہ اور مضبوط دروازہ ہے۔ اسلام کا قلعہ عدل و انصاف اور اس کا دروازہ حق و صداقت ہے۔ اگر قلعہ ٹوٹ جائے اور دروازہ اکھڑ جائے گا تو اس دین کی حرمت پامال ہو جائے گی۔ اقتدار جب تک مستحکم و مضبوط رہے گا اسلام محفوظ رہے گا۔ اور اقتدار کی مضبوطی کوڑے سے پٹینے اور تلوار سے قتل کرنے میں نہیں ہے بلکہ اس کی مضبوطی اور استحکام کا راز حق کو اختیار کرنے اور عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ کرنے میں مضمر ہے۔“

اس کے بعد وہ اس منصوبے پر عمل کرنے میں منہمک ہو گئے جس کا اعلان انھوں نے اپنی اس مختصر سی تقریر میں کیا تھا۔

حضرت عمیر بن سعد نے حمص میں مکمل ایک سال گزارا مگر اس مدت میں نہ تو انھوں نے دربار خلافت کو کوئی خط لکھا نہ مسلمانوں کے بیت المال کے لیے خراج وغیرہ کی کوئی رقم ہی بھیجی تو خلیفہ کے دل میں ان کے خلاف شکوک و شبہات نے سراٹھانا شروع کیا، کیونکہ وہ اپنے گورنروں کے متعلق امارت کے فتنے سے ہمیشہ چوکنے اور ہوشیار رہتے تھے۔ ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معصوم نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے کاتب کو بلا کر کہا کہ عمیر بن سعد کو لکھو کہ ”امیر المومنین کا خط پاتے

ہی حمص کو چھوڑ دو، دربار خلافت کے لیے روانہ ہو جاؤ اور اپنے ساتھ خراج کی وہ پوری رقم لے کر آؤ جو تم نے اب تک جمع کی ہے۔“

نخط پڑھ کر انہوں نے زادراہ کی تھیلی اٹھائی، کندھے پر پیالہ اور پانی کا برتن رکھا، ہاتھ میں نیزہ تھاما اور حمص کو اپنے پیچھے چھوڑ کر پیدل ہی مدینہ پہنچے تو بھوک اور فاقہ کی وجہ سے ان کا رنگ بدل گیا تھا، جسم نحیف و لاغر ہو گیا تھا، سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے تھے اور صوبتِ سفر کے آثار ان کے اوپر پورے طور سے نمایاں تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اس حال میں دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے اور ان سے پوچھا۔

”عمیر! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”امیر المؤمنین! مجھے کچھ نہیں ہوا ہے، خدا کا شکر ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اپنے ساتھ اپنی پوری دنیا اٹھالایا ہوں،“ عمیر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

”تمہارے ساتھ کیا؟“ انہوں نے سمجھا کہ بیت المال کے لیے خراج کی رقم لاتے ہیں۔ ”میرے ساتھ میری تھیلی ہے جس میں زادراہ رکھتا ہوں، میرا پیالہ ہے جس میں کھاتا ہوں، جس سے اپنا سیر اور اپنے کپڑے دھوتا ہوں، میرے ساتھ میرا مشکیزہ ہے جس میں وضو اور پینے کا پانی رکھتا ہوں،“ ایک سو توقف کے بعد پھر بولے۔

”امیر المؤمنین! میرے اس سامان کے علاوہ باقی دنیا میرے لیے بے ضرورت ہے مجھے اس کی کوئی احتیاج نہیں۔“

”کیا تم پیدل ہی آتے ہو؟“

”ہاں لے امیر المؤمنین۔“

”بیت المال سے سواری کے لیے تمہیں کوئی گھوڑا نہیں ملا؟“

”نہ انھوں نے دیا، نہ میں نے ان سے انہیں کا مطالبہ کیا۔“

”تم بیت المال کے لیے جو رقم لائے ہو، وہ کہاں ہے؟“

”میں بیت المال کے لیے کچھ نہیں لایا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“

”حمص پہنچا تو میں نے وہاں کے صلحاء کو جمع کر کے خراج کی وصولی

اور اس کی فراہمی کی ذمہ داری ان کو سونپ دی تھی۔ وہ جو کچھ بھی وصول

کر کے لاتے ہیں ان کے مشورے سے وہ پوری رقم مستحقین میں تقسیم کر دیا

کرتا تھا۔“ حضرت عمر رضی بن سعد نے وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر حضرت

عمر رضی نے اپنے کاتب سے فرمایا۔

”عمر رضی کے لیے حمص کی گورنری کا پروانہ تجزید تحریر کر دو۔“

”نہیں امیر المؤمنین! میں اب یہ ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا، نہ آپ

کے لیے نہ آپ کے بعد کسی دوسرے کے لیے۔“ حضرت عمر رضی نے سر کو نفی

میں ہلاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ حضرت عمر رضی سے اجازت لے کر مصافقات مدینہ کی ایک بستی

میں چلے گئے جہاں ان کے اہل و عیال مقیم تھے۔ عمر رضی بن سعد کو اپنی بستی

میں آئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حضرت عمر رضی نے ان کی آزمائش

کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے ایک قابل اعتماد شخص، حارث کو بلا کر کہا کہ ”عمر

رضی کے یہاں جاؤ اور وہاں بہ حیثیت ہمان قیام کرو۔ اگر تمہیں ان کے یہاں

خوش حالی اور کشادگی کے آثار نظر آئیں تو فوراً واپس آ کر مجھے آگاہ کرنا۔ اور

اگر افلاس و تنگدستی کے حالات دیکھو تو یہ سودیناران کے حوالے کر دینا۔ انہوں نے دیناروں کی تھیلی ان کو تھماتے ہوئے کہا۔ حارث رضی اللہ عنہ کی بستی میں آئے، اور پتہ پوچھتے ہوئے ان کے گھر پہنچے۔ ملاقات ہوئی تو ان کو سلام کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

”مدینہ سے“

”مدینہ کے مسلمان کیسے ہیں؟“

”بخیر و عافیت۔“

”امیر المؤمنین کیسے ہیں؟“

”وہ بھی بخیریت ہیں۔“

”کیا وہ حدود کا نفاذ نہیں کر رہے ہیں؟“

”کیوں نہیں۔ ابھی انہوں نے اپنے لڑکے پر حد زنا کا نفاذ کیا ہے جس

کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔“

”اے اللہ عمر رضی اللہ عنہ کی مدد فرما۔ وہ تجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔“ انھوں

نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

”حارث رضی اللہ عنہ بن سعد کے یہاں ہمان کی حیثیت سے تین رات مقیم رہے۔

وہ ہر رات ان کو جو کی ایک روٹی پیش کرتے۔ تیسرے دن ان کے قبیلے کے

ایک شخص نے حارث رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم نے عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے گھر والوں کو سخت

پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کے پاس ایک ہی روٹی ہوتی ہے۔ یہ لوگ

خود بھوک اور فاقہ کے ہاتھوں پریشان ہونے کے باوجود تم کو اپنے آپ پر

ترجیح دے دیتے ہیں۔ اگر مناسب سمجھو تو تم میرے یہاں منتقل ہو جاؤ۔“

اس کے بعد حارثؓ نے دیناروں کی تھیلی نکالی اور لے جا کر عمرؓ کے سامنے رکھ دی، عمرؓ نے تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”یہ کیا ہے؟“

”اے امیرالمومنین نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔“

”اس کو واپس لے جاؤ اور ان کی خدمت میں میرا سلام پیش کرنے کے بعد کہنا کہ عمرؓ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

یہ سن کر ان کی اہلیہ بول پڑیں۔ وہ اپنے شوہر اور ہمان کی گفتگو۔ دروازہ کی اوٹ سے سن رہی تھیں۔ ”عمرؓ! اسے لے لیجئے، آپ کو ضرورت نہ تو خرچ کیجئے ورنہ مستحقین میں تقسیم کر دیجئے۔ یہاں ضرورت مندوں اور محتاجوں کی کمی نہیں ہے۔“

حارثؓ دیناروں کی تھیلی عمرؓ کے سامنے چھوڑ کر واپسی کے لیے مڑ گئے۔ عمرؓ نے دیناروں کو لیا اور انھیں بہت سی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں رکھ کر رات رات ضرورت مندوں خصوصاً شہداء کی اولاد میں تقسیم کر دیا۔ ادھر حارثؓ مدینہ پہنچے تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا۔

”حارثؓ! تم نے کیا دیکھا؟“

”امیرالمومنین! عمرؓ اور ان کے اہل و عیال بڑے سخت حالات سے دوچار ہیں۔“

”تم نے دینار ان کو دے دیے تھے؟“

”ہاں اے امیرالمومنین!“

”انہوں نے کیا کیا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس میں سے ایک دینار

بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کریں گے۔“
 تب حضرت عمرؓ نے حضرت عمر بن سعد کو لکھا۔
 ”میرا یہ خط تم کو ملے تو اسے اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے مدینے کے
 لیے روانہ ہو جاؤ۔“

حضرت عمرؓ نے مدینہ کا رخ کیا اور دربار خلافت میں حاضر ہوئے۔
 حضرت عمرؓ نے ان کا پر تپاک خیر مقدم کیا اور اپنے قریب بٹھاتے ہوئے
 بولے۔

”عمیر! تم نے ان دیناروں کا کیا کیا؟“
 ”امیر المؤمنین! جب وہ دینار آپ مجھے ذرے چکے ہیں تو اب آپ
 کو ان سے کیا غرض ہے؟“

”میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے ان کو کہاں خرچ کیا۔“
 ”میں نے انھیں جمع کر دیا ہے تاکہ وہ اس روز میرے کام آئیں جس
 روز مال اور اولاد کوئی چیز کام نہ آئے گی۔“
 یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھیں چھلک پڑیں اور انھوں نے بھرائی
 ہوئی آواز میں کہا۔

”عمیر! میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو تنگدستی
 کے باوجود اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔“
 پھر آپ نے انھیں ایک وسق غلہ اور دو کپڑے دینے کا حکم دیا۔ حضرت
 عمرؓ نے کہا۔

”امیر المؤمنین! مجھے غلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دو صاع جو گھڑ
 پر چھوڑ آیا ہوں۔ جب تک ہم اسے کھائیں گے۔ خدائے تعالیٰ ہمارے

لیے رزق کا بندوبست کر دے گا۔ البتہ کپڑے میں بیوی کے لیے رکھ لیتا ہوں، اس کے کپڑے بالکل بوسیدہ ہو چکے ہیں۔“

اس ملاقات کو ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حضرت عمر بن سعد کے لیے اپنے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا وقت آپہنچا جن سے ملنے کا شوق انہیں شب و روز مضطرب اور بیقرار رکھتا تھا۔ وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے تو اس شان سے کہ ان کے کندھے پر دنیا کا کوئی بوجھ نہ تھا۔ ان کے اس سفر میں ان کے ساتھ اگر کوئی چیز تھی تو وہ ان کا نور ایمان و ہدایت اور ان کا زہد و تقویٰ تھا۔

حضرت عمرؓ کے پاس جب ان کے سانحہ ارتحال کی اطلاع پہنچی تو ان کا دل حزن و ملال سے بھر گیا اور چہرے پر رنج و الم کے آثار نمایاں ہو گئے جو ان کے اندرونی کرب کا پتہ دے رہے تھے۔ انہوں نے حضرت عمر بن سعد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

وَدِدْتُ أَنْ بِي رَجَالًا مِثْلَ
عُمَيْرِ بْنِ سَعْدٍ اسْتَبَعِينِي بِهِمْ
کاش میرے پاس عمر بن سعد جیسے
کچھ اور لوگ ہوتے جن سے میں
مسلمانوں کے مسائل میں مدد لیتا۔
فِي أَعْمَالِ الْمُسْلِمِينَ۔

اللہ تعالیٰ حضرت عمر بن سعدؓ سے راضی ہو۔ وہ اپنے طرز کے یگانہ و
بے مثال فرد تھے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ

وہ ان آٹھ خوش نصیب ہستیوں میں سے ایک تھے جو سب سے پہلے ایمان لائے۔ وہ ان دس نیک بخت اشخاص میں سے ایک تھے جنہیں جنت کی بشارت سے نوازا گیا۔ وہ ان چھ اصحاب شوریٰ میں سے ایک تھے جنہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ کا انتخاب کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اور وہ ان مخصوص علماء صحابہ میں سے ایک تھے جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں فتویٰ دینے کا حجاز قرار دیا گیا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں ان کا نام عبد عمر و تھا۔ مگر قبول اسلام کے بعد رسول اللہ نے بدل کر عبدالرحمن رکھ دیا۔ تو یہ ہیں عبدالرحمان بن عوف اللہ ان سے راضی ہو اور ان کو راضی کرے۔

حضرت عبدالرحمان بن عوف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرہ ارقم میں داخل ہونے سے قبل اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے صرف دو دن بعد مشرف بہ اسلام ہوئے اور خدا کی راہ میں ابتلا و آزمائش کے ان سارے مراحل سے گزرے جن سے السابقو الاولون کو گزرنا پڑا تھا۔ لیکن وہ آزمائشیں ان کے پلے ثبات کو ذرا بھی متزلزل نہ کر سکیں بلکہ وہ نہایت صدق و خلوص کے ساتھ اپنے دین پر جے رہے اور دوسرے بہت سے اہل ایمان کی طرح وہ بھی

اپنے دین کو کفار قریش سے بچانے اور آزادی کے ساتھ اس پر عمل کرنے کے لیے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور بعد میں جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کو مدینہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم ملا تو وہ مسلمانوں کے اس پہلے قافلے میں شامل تھے جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کا قصد کیا تھا۔

مدینہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماجرین و انصار کے درمیان مَوَاقِفَہ کا رشتہ قائم کیا، اور اس موقع پر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کو حضرت سعد بن زید انصاریؓ کے ساتھ رشتہ اخوت میں منسلک کیا تو حضرت سعد بن زید نے ان سے کہا۔

”میرے بھائی! میں مدینہ کا سب سے مالدار شخص ہوں، میرے پاس اس وقت دو باغ اور دو بیویاں ہیں۔ تم دیکھ لو کہ دونوں میں سے کون سا باغ تمہیں پسند ہے، تاکہ میں اس سے تمہارے حق میں دست بردار ہو جاؤں اور دونوں میں سے کس عورت کو اپنے جلالہ نکاح میں لینا چاہتے ہو، تاکہ میں تمہارے لیے طلاق دے کر اس کے الگ ہو جاؤں۔“

جواب میں حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے اپنے انصاری بھائی سے کہا۔

”اللہ تعالیٰ آپ کے مال و دولت اور اہل و عیال میں برکت دے۔۔۔۔۔ آپ صرف مدینہ کے بازار تک چیری رہ نہائی فرمادیں۔۔۔“ چنانچہ حضرت سعد بن زیدؓ نے ان کو بازار کا راستہ دکھا دیا اور انہوں نے وہیں سے اپنی تجارت کا آغاز کر دیا۔ وہ ضرورت کی چیزیں

خریدتے اور بیچتے رہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا روبرو میں انھیں نفع حاصل ہوتا رہا اور وہ اس میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتے رہے۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد ان کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی تھی جس کو بطور مہر ادا کر کے وہ کسی عورت سے نکاح کر سکیں۔

نکاح کے بعد جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے کپڑوں پر شادی کے موقع پر استعمال کی ہوئی خوشبو کے اثرات اور اس کے داغ دھبوں کو دیکھ کر آپ نے فرمایا۔

”مَهِيْمٌ يَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ؟“ عبد الرحمان! یہ کیا ہے؟

”اے اللہ کے رسول! میں نے شادی کر لی ہے۔“ انھوں نے عرض کیا۔

”مَا اَعْطَيْتَ زَوْجَكَ مِنَ الْمَهْرِ؟“ بیوی کو مہر کیا دیا ہے؟“ آپ نے دریافت کیا۔

”ایک نواۃ سونا، اے اللہ کے رسول!“ انھوں نے جواب دیا۔

”اَوْلِيْمٌ وَ كَوْشَاةٌ، بَارَكَ اللهُ فِي مَالِكَ۔“ ولیمہ کرو، چاہے ایک

بکری ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے مال میں برکت دے۔“

حضور نے فرمایا۔

حضرت عبد الرحمان بن عوف فرماتے ہیں۔

”اس کے بعد دنیا اپنی پوری برکات و فوائد کے ساتھ اس طرح

میری طرف متوجہ ہو گئی اور میری تجارتی کامیابیوں کا حال یہ ہو گیا کہ اگر میں کسی پتھر کو اٹھاتا تو مجھے اس بات کی توقع ہوتی تھی کہ اس کے نیچے

پانچ درہم کے برابر وزن۔

مجھے سونے یا چاندی کا کوئی ٹکڑا ملے گا۔“

غزوہ بدر میں حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے جہاد فی سبیل اللہ کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے دشمن خدا عمیر بن عثمان کعبی کو اس کے کیفر کردار تک پہنچایا۔ اور غزوہ اُحد کے موقع پر جب بہت سے لوگوں کے پاؤں اکٹھے گئے تھے اور انھوں نے راہ فرار اختیار کر لی تھی، حضرت عبدالرحمن بن عوف کے پائے استقلال میں جنبش تک نہیں ہوئی اور وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ میدانِ کارزار میں ڈٹے رہے۔ اور جب معرکہ جنگ سے سرخرو اور کامران واپس لوٹے تو ان کے جسم پر بیس سے زیادہ زخم تھے، جن میں سے بعض اتنے گہرے تھے کہ ان میں آدمی کا ہاتھ چلا جاتا تھا۔

لیکن دیکھا جائے تو ان کا جہاد بالنفس ان کے جہاد بالمال کے سامنے ہیج نظر آتا ہے۔ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فوجی دستہ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے آپ صحابہ کرامؓ سے مالی تعاون کی اپیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”تَصَدَّقُوا فَإِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُبْعَثَ بَعْثًا“
 میں ایک فوجی دستہ بھیجنا چاہتا ہوں، تم لوگ اس کے لیے مالی تعاون پیش کرو۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر حضرت عبدالرحمان بن عوف فی الفور اپنے گھر جاتے ہیں اور بہ سرعت واپس آ کر حضورؐ سے عرض کرتے ہیں۔

”اے اللہ کے رسول! میرے پاس چار ہزار کی رقم ہے، میں اس میں سے دو ہزار اپنے رب کو قرض دے رہا ہوں اور باقی دو ہزار میں نے

اپنے اہل و عیال کے لیے چھوڑ دیا ہے۔“

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

”بَارَكَ اللهُ لَكَ فِيمَا أُعْطِيتَ...“ جو کچھ تم نے دیا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں تم کو برکت دے اور جو کچھ تم نے بچوں کے لیے چھوڑا ہے اس میں بھی اللہ بَرَكَتٌ...“

تعالیٰ تم کو برکت سے نوازے۔“

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کا قصد فرمایا۔ جو آپ کی زندگی کا آخری غزوہ تھا۔ تو اس وقت جس طرح افرادی قوت کی ضرورت تھی، مالی وسائل کی احتیاج اس سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ کیونکہ ایک طرف رومی فوج کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور وہ ہر قسم کے جنگی ساز و سامان سے لیس تھی اور دوسری طرف مدینہ میں قحط کا زمانہ تھا، مسافر طویل اور سامان سفر قلیل تھا۔ خصوصاً سواریوں کی تو ایسی قلت تھی کہ بہت سے مسلمانوں نے جو غزوہ میں شریک ہونا چاہتے تھے مگر ان کے پاس سواریاں نہیں تھیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر نہایت پرسوز الفاظ میں بڑی حسرت کے ساتھ سواری کے لیے درخواست کی اور آپ سے عرض کیا کہ ہم کو بھی اپنے ساتھ لے لیں اور آپ نے ان کو صرف اس وجہ سے واپس کر دیا کہ آپ کے پاس زائد سواریاں نہیں تھیں جو ان کو دیتے تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انھیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کا نام ”بکائین“ اور اس لشکر کا نام ”جیش العسرة“ پڑ گیا۔

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ اللہ سے اجر و ثواب پانے کی نیت سے اس کی راہ میں مال خرچ کریں۔ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اپیل پر بیک کہنے کے لیے تیزی سے لپکے۔ خود حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ ان معانین کی صف اول میں شامل تھے۔ انھوں نے دو سو اوقیہ کی نحیطر رقم بارگاہ رسالت میں پیش کی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ ”میں سمجھتا ہوں کہ عبدالرحمان بن عوف ایسا کر کے ایک گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے اہل و عیال کی ضروریات کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے۔“ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا کہ

”هَلْ تَرَكْتَ شَيْئًا لِأَهْلِكَ يَا عَبْدَ الرَّحْمَنِ؟“
 ”عبدالرحمان! تم نے بچوں کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟“

”ہاں، میں نے ان کے لیے جو کچھ چھوڑا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ اور بہتر ہے جو میں نے خرچ کیا ہے۔“

آپ نے دوبارہ سوال کیا۔
 ”کَمَّ؟“ کتنا؟

تو انھوں نے جواب دیا۔

”مَا وَعَدَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ خَيْرٍ“

بلکہ ایک اوقیہ = ساڑھے دس تولے۔

الْخَيْرُ وَالْآجِرُ“ اور اس کے رسولؐ نے کیا ہے“

شکرِ تنوک روانہ ہوا۔ قیامِ تنوک کے دوران اللہ عزوجل نے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کو ایک ایسے شرف سے نوازا جو تمام مسلمانوں میں سے صرف انھیں کے لیے مخصوص تھا۔ ہوا یہ کہ نماز کا وقت ہو گیا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت موجود نہیں تھے۔ آخر حضرت عبدالرحمانؓ بن عوفؓ کی امامت میں نماز کھڑی ہو گئی۔ ابھی پہلی رکعت ختم نہیں ہوئی تھی کہ نبی کریمؐ تشریف لے آئے اور نمازیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور حضرت عبدالرحمانؓ بن عوفؓ کی اقتدار میں نماز ادا فرمائی۔

کیا اس سے بڑھ کر بھی کسی فضل و شرف کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص سرورِ عالم، امام الانبیاء، حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کے شرف سے مشرف ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ اہمات المؤمنینؓ کی ذاتی ضروریات اور ان کے نجی کاموں کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ وہ ان کی تمام حاجتیں پوری کرتے۔ جب وہ لوگ سفر میں نکلتے تو یہ ان کے ہم رکاب ہوتے، جب وہ لوگ حج کے لیے جاتے تو یہ ان کے ہمراہ ہوتے۔ ان کے کچاؤں اور ہودجوں پر قیمتی طیلسان کے پردوں کا نظم کرتے اور ان کی پسندیدہ جگہوں پر ان کے قیام کا بندوبست کرتے تھے۔ اہمات المؤمنینؓ کی دل و جان سے خدمت کرنا اور ان کے نزدیک پورے طور پر ان کا قابلِ اعتماد ہونا حضرت عبدالرحمانؓ بن عوفؓ کی وہ خصوصیت ہے جس پر وہ جتنا بھی فخر و ناز کریں، کم ہے۔

عامۃ المسلمین اور اہبات المؤمنین کے ساتھ حضرت عبدالرحمان بن عوف کے حسن سلوک اور پروا احسان کا یہ حال تھا کہ ایک بار انھوں نے اپنی ایک زمین چالیس ہزار دینار میں فروخت کی اور وہ ساری رقم انھوں نے بنو زہرہ، ضرورت مند مسلمانوں، ہاجرین اور نبی کریمؐ کی ازواج میں تقسیم کر دی۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حصے کی رقم ان کے پاس پہنچی تو انھوں نے دریافت کیا کہ یہ رقم کس نے بھیجی ہے؟ جب ان کو بتایا گیا کہ عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے، تو انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

”لَا يَخْنُودُ عَلَيْكَ مِنْ بَعْدِي إِلَّا الصَّابِرُونَ۔“
 ”میرے پیچھے تم لوگوں کی نگہداشت نہیں کریں گے مگر صابریں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر و برکت کی جو دعاء فرمائی تھی وہ زندگی بھر ان کے اوپر سایہ فلک رہی۔ یہاں تک کہ وہ صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ مالدار آدمی ہو گئے۔ ان کا تجارتی کاروبار برابر ترقی کرتا اور اس کا دائرہ لگاتار وسعت اختیار کرتا رہا۔ ان کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا جو دوسرے شہروں سے اہل مدینہ کے لیے گہوں، آٹا، کپڑے، برتن اور خوشبو وغیرہ اشیاء ضرورت لے کر مدینے پہنچتے اور وہاں کی پیداوار کا وہ فاضل حصہ دوسرے علاقوں میں لے جاتے تھے جو ان کی ضرورت سے بچ رہتا۔

ایک بار ان کا ایک تجارتی قافلہ جو سات سو اونٹوں پر مشتمل تھا۔ مدینہ پہنچا۔ جی ہاں، وہ قافلہ سات سو اونٹوں پر مشتمل

تھا جن کی پیٹھوں پر خوراک کے ذخیرے، ضروریاتِ زندگی کے سامان اور وہ تمام چیزیں لدی ہوئی تھیں جن کی ضرورت لوگوں کو اکثر پڑتی ہے۔ جیسے ہی وہ قافلہ مدینے میں داخل ہوا، پوری زمین دہل گئی، گلیاں گونج اٹھیں اور ہر طرف چیخ و پکار اور شور و غل سنائی دینے لگا۔ شور سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یہ کیسا ہنگامہ ہے؟ جب ان کو بتایا گیا کہ عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کا سات سو اونٹوں پر مشتمل ایک تجارتی قافلہ گنم، آٹا اور سامان خوراک لے کر پہنچا ہے تو انھوں نے فرمایا۔

”بَارَكَ اللهُ لَهُ فِيمَا أَعْطَاهُ
فِي الدُّنْيَا، وَلِثَوَابِ الْآخِرَةِ اعْظَمُ
فَلَقَدْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى
اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: ”يَدْخُلُ
عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ الْجَنَّةَ
حَبُوبًا.“

اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں جو کچھ
دیا ہے اس میں برکت دے۔ یقیناً
آخرت کا ثواب بہت بڑا ہے۔ میں
نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عبدالرحمان
بن عوف گھسٹتے ہوئے جنت میں جائیں گے۔“

اونٹوں کے بیٹھنے سے پہلے کسی نے ام المؤمنینؓ کی زبان مبارک سے
نکلے ہوئے یہ الفاظ حضرت عبدالرحمان بن عوف تک پہنچاتے ہوئے ان
کو جنت کی خوش خبری سنادی۔ یہ مزہ جہاں فزا سنتے ہی وہ اڑ کر
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پہنچے اور ان سے دریافت کیا۔
”اماں! کیا خود آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے
ہوئے سنا تھا؟“

تو انھوں نے فرمایا، ”ہاں“
یہ سن کر وہ بے حد خوش ہوئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کر کے بولے۔

”اماں جان! اگر ہو سکا تو میں کھڑا ہو کر جنت میں داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں آپ کو اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں یہ پورا قافلہ اس کے اوپر لدے ہوئے سامانوں، اس کے کجاؤں اور ٹاٹوں سمیت اللہ کی راہ میں دے رہا ہوں۔“

اس روشن، تابناک اور مبارک دن سے — جس دن سے ان کو دہلی جنت کی خوش خبری دی گئی تھی — حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ مال کمانے اور اسے خدا کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کی طرف غیر معمولی شوق اور جذبے کے ساتھ متوجہ ہو گئے۔ چنانچہ اب وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے خفیہ اور علانیہ، دائیں اور بائیں ہر طرف مال خرچ کرنے لگے۔ انھوں نے چالیس ہزار درہم صدقہ کے طور پر دیے۔ پھر دوسو اوقیہ سونا خیرات کیا۔ پھر مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے پانچ سو گھوڑے اور دوسرے مجاہدین کے لیے ڈیڑھ ہزار اونٹ فراہم کیے۔ اور جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے غلاموں اور لونڈیوں کی ایک بڑی تعداد کو غلامی کے بندھن سے آزاد کر دیا۔ اور اس وقت اصحاب بدر میں سے جتنے صحابہ کرام زندہ تھے ان میں سے ہر ایک کے لیے چار چار سو دینار کی وصیت کی۔ چنانچہ ان حضرات نے وصیت کے مطابق وہ رقم لے لی۔ اس وقت ان کی تعداد ایک سو تھی۔ اور انھوں نے اہمات المؤمنین میں سے ہر ایک کے لیے کثیر رقم کی وصیت کی۔ حضرت عائشہؓ اکثر ان کے لیے دعا کرتے ہوئے فرماتی تھیں۔

”سَقَاةَ اللّٰهِ مِنْ مَّاءِ السَّلْسَبِيْلِ“ ”اللّٰهُ تَعَالٰی اِن كُوْجِبْتُمْ سَلْسَبِيْلِ سَعِیْرَاب كَرِی“

انہوں نے اپنے ورثاء کے لیے اس قدر مال چھوڑا کہ اعداد ان کا شمار کرنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے ایک ہزار اونٹ، سو گھوڑے اور تین ہزار بکریاں چھوڑیں۔ وفات کے وقت موجود ان کی چار بیویوں میں سے ہر ایک کو کل ترکے کا ۱/۴ ملا جس کی مالیت اسی ہزار تھی۔ انہوں نے سونے اور چاندی کے جو ڈھیر ترکے میں چھوڑے انہیں وارثوں کے درمیان تقسیم کرنے کے لیے کلہاڑیوں سے کاٹنا پڑا۔ اور کاٹنے والوں کے ہاتھوں میں پھلے پڑ گئے۔

یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کی وجہ سے تھا جو آپ نے ان کے مال میں برکت کے لیے کی تھی۔ لیکن یہ مال نہ تو ان کو کسی قسم کے مالی فتنے میں مبتلا کر سکا نہ ان کے رویے میں کسی تبدیلی کا سبب بن سکا۔ لوگ جب ان کو ان کے غلاموں کے درمیان دیکھتے تو ان کے اور غلاموں کے درمیان تمیز نہیں کر پاتے تھے۔ ایک دن ان کے سامنے کھانا لایا گیا۔ اس روز وہ روزے سے تھے۔ تو انہوں نے کھانے کو دیکھ کر بڑی حسرت کے ساتھ کہا۔

”جب مصعب بن عمیر شہید کیے گئے۔ اور وہ مجھ سے بہت بہتر تھے۔ تو ان کو کفن دینے کے لیے ہم لوگوں کو صرف اتنا کپڑا میسر آسکا کہ جب اس سے ان کا سر چھپایا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور جب پاؤں کو چھپایا جاتا تو سر کھلا رہ جاتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کو غیر معمولی خوش حالی اور فراخی سے نوازا۔ مجھے تو اس بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ ہمیں ہمارے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں نہ دے دیا

گیا ہو، یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگے اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔
حضرت عبدالرحمان بن عوف کی پوری زندگی خیر و سعادت سے
معمور اور انتہائی قابل رشک تھی۔

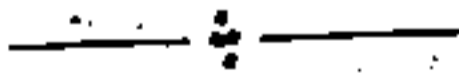
• صادق و مصدوق حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ان کو جنت کی بشارت دی۔

• آخری آرام گاہ تک لے جاتے ہوئے ان کے جنازے کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ
نے کندھا دیا۔

• ان کی نماز جنازہ ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ
نے پڑھائی۔

• اور ان کے جنازے کی مشایعت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے
کی اور ان الفاظ میں ان سے اپنی عقیدت کا اظہار فرمایا۔

”لَقَدْ أَذْرَكْتَ صَفْوَهَا، وَ
سَبَقْتَ زَيْفَهَا، يَرْحَمُكَ
اللَّهُ“
آپ نے دنیا میں سے اس کے عمدہ
حصے کو اپنایا اور اس کے خراب حصے
کو چھوڑ کر گزر گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو
غریقِ رحمت کرے۔



حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

بنی عبدمناف میں سے پانچ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی غیر معمولی مشابہت رکھتے تھے کہ کم روز نگاہ والوں کو ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اکثر التباس ہو جایا کرتا تھا۔
یقیناً آپ ان پانچوں حضرات کا تعارف حاصل کرنا چاہتے ہوں گے جو آپ کے بنی کے ساتھ اتنی مشابہت رکھتے ہوں۔ تو آئیے ہم ان کا تعارف حاصل کریں۔

وہ ہیں حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برادرِ عم زاد اور رضاعی بھائی حضرت قثم بن عباس بن عبدالمطلب، آپ کے چچا زاد بھائی۔ حضرت سائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم، امام شافعیؒ کے دادا۔ حضرت حسن بن علی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے۔ وہ پانچوں میں سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔ اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ، امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کے برادرِ حقیقی۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

ذیل کی سطروں میں ہم حضرت جعفر بن ابی طالب کی زندگی کی چند جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔
ابوطالب قریش اور خاندان بنی ہاشم میں اپنی رفعتِ شان اور علو منزلت

کے علی الرغم ایک کثیر العیال اور تنگ دست شخص تھے۔ اور اس قحط نے ان کی مفلوک الحالی میں مزید اضافہ کر دیا تھا جس میں قریش کے لوگ بتلا تھے۔ جس کی پیٹ میں آکر جانور ہلاک اور فصیلیں تباہ برباد ہو رہی تھیں۔ جس نے لوگوں کو بوسیدہ ہڈیاں تک کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے چچا عباس بن عبدالمطلب بنو ہاشم کے خوش حال ترین افراد تھے۔ ایک روز محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عباس سے کہا۔

”چچا جان! آپ کے بھائی ابوطالب ایک کثیر العیال آدمی ہیں۔ آپ بیکھ رہے ہیں کہ لوگ کس بڑی طرح سے قحط کی شدت اور فاقہ کشی کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم ان کے پاس چلیں اور ان کے بچوں میں سے کچھ کی کفالت اپنے ذمے لے کر ان کے بار کو کچھ ہلکا کرنے کی کوشش کریں۔“

عباس نے ان کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔
”بے شک تم نے ایک کار خیر کی طرف دعوت دی ہے اور حسن سلوک پر اکسایا ہے۔“

پھر دونوں نے جا کر ابوطالب سے کہا۔

”جب تک لوگوں کے سروں سے مصیبت کے یہ بادل چھٹ نہیں جاتے، ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی پرورش کا جو بھاری بوجھ تنہا آپ کے کندھوں پر ہے، اس میں آپ کا ہاتھ بٹائیں اور آپ کے اس بوجھ کو کچھ ہلکا کریں۔“

ابوطالب نے بھائی اور بھتیجے کی اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم لوگ عقیل کو میرے لیے چھوڑ دو تو باقی بچوں کے متعلق جو چاہو فیصلہ کر سکتے ہو۔“
چنانچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے علی کو اور عباس نے جعفر کو لے کر اپنے بچوں کے
ساتھ شامل کر لیا۔ اس کے بعد علی برابر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ
نے ان کو نبی بنایا اور دین حق اور ہدایت دے کر مبعوث فرمایا۔ اسی طرح
جعفر بھی برابر اپنے چچا عباس کے یہاں رہے یہاں تک کہ وہ جوانی کی
عمر کو پہنچ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہتے
ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔
حضرت جعفر بن ابی طالب اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت اسماء بنت
عمیس اس کاروانِ نکہت و نور میں آغاز سفر ہی سے شریک تھے۔ یہ
دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دارِ ارقم میں داخل ہونے سے
پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دست مبارک پر ایمان لائے
تھے۔ اور اس ہاشمی نوجوان اور اس کی نو عمر بیوی نے قریش کے ہاتھوں
وہ ساری بلائیں اور مصیبتیں جھیلیں جن سے ابتدائی زمانے کے مسلمانوں کو
پالا پڑا تھا۔ انھوں نے ہر اذیت پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا کیوں کہ ان کو
یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ جنت تک پہنچنے کے لیے ان پر خار و ادیوں اور
دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرنا ناگزیر ہے۔ لیکن یہ چیز ان کے اور ان کے
دوسرے دینی بھائیوں کے لیے انتہائی تکدر اور پریشانی کا سبب بنی
ہوئی تھی کہ قریش کے لوگ ان کے اور اسلامی شعائر و احکام کی ادائیگی
کے درمیان حائل ہو کر انھیں لذتِ عبادت سے محروم کر رہے تھے۔ وہ
ہر جگہ ان کی گھات میں بیٹھے رہتے اور ہر وقت ان کی نگرانی کرتے
رہتے تھے۔

اس صورت حال سے تنگ آکر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی اجازت طلب کی کہ وہ اپنی بیوی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ آپ نے انھیں اس کی اجازت تو دیدی مگر آپ کو اس پر دلی صدمہ ہوا۔ کیوں کہ یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مستقل سوہانِ روح کا باعث تھی کہ ان پاک طینت اور نیک نفس ہستیوں کو صرف اس جرم میں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعلان کیا ہے، ناحق اور ظالمانہ طور پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنا پیارا وطن جس کی گلیوں اور میدانوں میں انھوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے بہترین ایام گزارے ہیں، جس کے گوشے گوشے اور ذرے ذرے پر ان کی محبت کے لافانی نقوش ثبت ہیں۔ چھوڑ کر چلے جائیں۔ لیکن اس وقت آپ کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ قریش کے ان مظالم کو روک سکتے۔

ہاجرین کا یہ پہلا قافلہ خدا کی راہ میں اپنا وطن چھوڑ کر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں سرزمین حبشہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور وہاں پہنچ کر اس کے نیک دل اور انصاف پسند حکم ان نجاشی کی پناہ میں قیام پذیر ہو گیا۔ اور قبولِ اسلام کے بعد پہلی بازار انھوں نے سکون و اطمینان کا سانس لیا اور عبادتِ الہی کی لذت اور اس کی حلاوت سے لطف اندوز ہوئے۔ وہاں نہ ان کو اس بات کا کھٹکا تھا کہ کوئی ان کی عبادت کا غزہ کر کرے گا نہ وہ اس اتدیشے میں مبتلا تھے کہ کوئی ان کے پُر سکون لمحات کو بے چینی اور بے اطمینانی سے بدل دے گا۔

ادھر جب قریش کو ان مسلمانوں کے ارضِ حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا علم ہوا اور ان کو پتہ چلا کہ وہ لوگ شاہِ حبشہ کی حمایت اور اس کی پناہ میں اپنے دین و عقیدہ کے مطابق اطمینان اور بے خونی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں تو وہ ان کے خلاف سازش اور صلاح و مشورہ میں مصروف ہو گئے۔ تاکہ یا تو انھیں قتل کرنے میں کامیاب ہو جائیں یا واپس لا کر قید خانے میں ڈال دیں۔ اب وہ پوری سرگزشت ہم حضرت ام سلمہ کے حوالے کرتے ہیں کہ وہ اُسے ہو بہو اس طرح بیان کریں جس طرح ان کی آنکھوں نے دیکھا اور ان کے کانوں نے سنا تھا۔ وہ فرماتی ہیں۔

”جب ہم لوگ حبشہ کی سرزمین میں جا کر ٹھہرے تو وہاں ہم کو بہترین لوگوں کی ہم سائیگی ملی۔ وہاں ہم اپنے دین کے متعلق ہر طرح بے خوف ہو کر اپنے رب کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ وہاں نہ تو ہم کو کسی اذیت سے دوچار ہونا پڑا نہ کوئی ناپسندیدہ اور دل آزار بات سننی پڑی۔ ان حالات کی اطلاع جب قریش کو ہوئی تو انھوں نے ہمارے خلاف سازش کر کے اپنے دو مضبوط آدمیوں، عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو نجاشی کے پاس بھیجا۔ اور ان کے ہاتھ نجاشی، اس کے درباریوں اور فوجی سرداروں کے لیے سرزمینِ حجاز کی وہ نادر اور بیش قیمت چیزیں تحفہ کے طور پر بھیجیں جنھیں وہ پسند کرتے تھے۔ ساتھ ہی ان کو اس بات کی تاکید بھی کر دی کہ ہمارے مسلمانوں کے مسئلہ پر بادشاہ سے گفتگو کرنے سے پہلے ہر سردار کو اس کا تحفہ دیدینا۔

جب وہ دونوں حبشہ پہنچے تو حسبِ ہدایت سب سے پہلے وہ نجاشی کے درباریوں سے ملے اور ان میں سے ہر ایک کے سامنے ہدیہ پیش کرنے

کے بعد اس سے کہا کہ ہمارے یہاں سے کچھ نا سمجھ لڑکے جنھوں نے اپنے آباؤ اجداد کا پرانا دین ترک کر کے ایک نیا دین اپنالیا اور اپنی قوم کے اندر پھوٹ ڈال دی ہے۔ بھاگ کر بادشاہ کے ملک میں آگئے ہیں۔ جب ہم بادشاہ سے ان کے معاملہ میں گفتگو کریں تو آپ لوگ ہماری تائید کریں اور اس کو یہ مشورہ دیں کہ وہ ان سے ان کے دین کے بارے میں کوئی سوال و جواب کیے بغیر انھیں ہمارے حوالے کر دے، کیوں کہ ان کے قبیلوں کے سربراہ ان کو اور ان کے عقائد کو زیادہ بہتر طور پر جانتے اور سمجھتے ہیں۔ تو درباریوں نے کہا کہ ہم ضرور بادشاہ کو مشورہ دیں گے۔“

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں۔

”عمر بن عاص اور اس کے ساتھی کو اگر کوئی بات سب سے زیادہ ناگوار تھی تو وہ یہ کہ نجاشی ہم لوگوں میں سے کسی کو اپنے پاس بلا کر اس کی بات سنے۔ ان دونوں نے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر اس کی خدمت میں ہدیے پیش کیے جن کو اس نے بہت پسند کیا، پھر اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔“

”اے بادشاہ! ہمارے کچھ بدترین قسم کے نوجوان ہیں جنھوں نے بھاگ کر آپ کے ملک میں پناہ لے رکھی ہے۔ انہوں نے ایک ایسا دین اختیار کر رکھا ہے جس سے نہ ہم لوگ واقف ہیں نہ آپ ہی اس سے متعارف ہیں۔ انھوں نے ہمارا دین چھوڑ دیا ہے مگر وہ آپ کے دین میں بھی نہیں داخل ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی قوم کے سرداروں، ان کے آباؤ اعمام اور ان کے خاندان کے سربراہوں نے اس درخواست کے ساتھ ہم کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ انھیں واپس بھیج دیں۔“

کیونکہ جو فتنہ ان لوگوں نے برپا کر رکھا ہے اس کو وہی لوگ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔“

یہ سن کر بادشاہ نے سرداروں کی طرف نظر اٹھائی۔ انھوں نے قریشی سفیروں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔
 ”عالی جاہ! یہ دونوں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے جو غلط رویہ اپنایا ہے اس کے متعلق وہی لوگ بہتر جانتے ہیں اس لیے ان کو واپس بھیج دیں تاکہ وہ لوگ ان کے بارے میں جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔“

بادشاہ کو درباریوں کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ اُس نے سخت غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں، خدا کی قسم جب تک ان کو بلا کر ان باتوں کے متعلق ان سے پوچھ نہیں لیتا جو ان کی طرف منسوب کی جا رہی ہیں، انھیں کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔ اگر وہ باتیں جو یہ دونوں ان کے بارے میں کہہ رہے ہیں درست ہوئیں تو میں انھیں ان کے سپرد کر دوں گا۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو میں اس وقت تک ان کی حمایت سے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا جب تک وہ یہاں رہیں گے۔“

حضرت ام سلمہؓ اپنے بیان کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہتی ہیں۔
 ”پھر نجاشی نے ہم لوگوں کو ملاقات کے لیے بلا بھیجا۔ اُس کے یہاں جانے سے پہلے ہم لوگ ایک جگہ جمع ہوئے اور ہم نے آپس میں کہا کہ بادشاہ ہم سے ہمارے دین کے بارے میں ضرور پوچھے گا۔ اس موقع پر ہمیں کسی لاگ پیٹ کے بغیر بالکل واضح طور پر وہ باتیں اس کے سامنے

رکھ دینی چاہئیں جن پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ اور بادشاہ کے سامنے ہم سب لوگوں کی نمائندگی صرف جعفر بن ابی طالب کریں گے۔ ان کے سوا دوسرا کوئی نہیں بولے گا۔

جب ہم لوگ بادشاہ کے دربار میں پہنچے تو دیکھا کہ اس نے اپنے درباریوں کو بلارکھا ہے، جو اپنی اپنی جگہوں پر، اپنے مخصوص درباری لباس زیب تن کیے، سروں پر ٹوپیاں رکھے، سامنے کتابیں کھولے بیٹھے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ عمر بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ بھی اس کے پاس پہلے سے موجود ہیں۔ جب سب لوگ اطمینان سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو نجاشی نے ہماری طرف رخ کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کون سا نیا دین ہے جو تم لوگوں نے اختیار کیا ہے، جس کے لیے تم نے اپنے آباء و اجداد کا دین ترک کر دیا مگر نہ تو میرے دین میں داخل ہوئے نہ دیگر ادیان و ملل میں سے کسی کو اپنایا؟“

بادشاہ کا سوال سن کر جعفر بن ابی طالب اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اے بادشاہ! ہم جاہل تھے، بت پرستی کرتے، مُردار کھاتے، فواحش کا ارتکاب کرتے، قطع رحمی کرتے اور پڑوسیوں سے بدسلوکی کرتے تھے۔ ہم میں کا ہر طاقت وراپنے کمزوروں پر ظلم ڈھاتا تھا۔ ایک زمانے تک ہماری زندگی کے شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا جو خود ہم ہی میں سے تھا۔ جس کی خاندانی شرافت و نجابت، ذاتی صداقت و امانت اور فطری عفت و عصمت سے ہم سب اچھی طرح واقف تھے۔ اُس نے ہم کو خدا کی طرف پکارا۔ اس

نے ہمیں دعوت دی کہ ہم خدا کو ایک مانیں، صرف اسی کی عبادت کریں اور پتھر سے ترلشے ہوئے ان بے جان بتوں کی پرستش سے باز آجائیں جن کی پوجا ہم اور ہمارے آباء و اجداد کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے ہم کو راست گوئی، امانت داری، صلہ رحمی، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک، محارم سے اجتناب اور نچول بریزی سے احتراز کرنے کی تلقین کی۔ نیز بے حیائی، دروغ گوئی، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا۔ اس نے ہم کو حکم دیا کہ ہم خدائے واحد کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور ماہِ رمضان کے روزے رکھیں.....

ہم نے اس کی تصدیق کی، اس پر ایمان لائے اور اس کے ان تمام احکامات و ہدایات کی پیروی کی جن کو وہ خدا کے یہاں سے لایا تھا۔ اس نے جن چیزوں کو ہمارے لیے حلال کیا، ہم نے ان کو حلالی جانا اور جن چیزوں کو ہمارے اوپر حرام قرار دیا، ہم نے ان کو حرام مان لیا۔

اے بادشاہ! یہی ہمارے وہ جرائم ہیں جن کی وجہ سے ہماری قوم ہماری مخالف ہو گئی۔ وہ ہمارے اوپر ٹوٹ پڑی۔ اس نے ہم کو سخت ترین عذاب سے دوچار کیا تاکہ وہ ہم کو ہمارے دین سے پھیر کر دوبارہ بت پرستی میں مبتلا کر دے۔ جب انھوں نے ہمارے اوپر ظلم و ستم کی حد کر دی، ہمارے اوپر عرضۂ حیات تنگ کر دیا، ہم کو مغلوب کر لیا اور ہم کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روک دیا اور پانی ہمارے سر سے اونچا ہو گیا تو ہم اپنا وطن چھوڑ کر آپ کے ملک میں چلے آئے۔ ہم نے دوسروں پر آپ کو ترجیح دی اور آپ کی ہم سائیگی کو پسند کیا کیوں کہ ہم کو

اس بات کی پوری اُمید تھی کہ آپ کے یہاں ہمارے اوپر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں۔

اس موقع پر نجاشی نے جعفر بن ابی طالبؓ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے دریافت کیا کہ تمہارے نبی اللہ کی طرف سے جو پیغام لاتے ہیں، کیا اس میں سے کچھ تمہارے پاس ہے؟

انہوں نے جواب دیا۔ ”ہاں۔“

”اس کو مجھے سناؤ۔“ نجاشی نے کہا۔

چنانچہ جعفر نے پڑھنا شروع کیا۔

”یہ ذکر ہے اُس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی، جب کہ اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ اُس نے عرض کیا اے پروردگار! میری ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے۔۔۔۔۔“

كَهَيْعَصَٰهٖ ذِكْرٌ رَّحْمَةً رَبِّكَ
عَبْدَهُ زَكْرِيَّا هٗ اِذْ نَادَى رَبَّهُ
رَبِّدَاعًا خَفِيًّا هٗ قَالَ رَبِّ اِنِّى
وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّى وَاشْتَعَلَ
الرَّاسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْ
بِدُعَاؤِكَ رَبِّى شَقِيًّا (مریم ۱-۴)

یہاں تک کہ انہوں نے سورہ کا ابتدائی حصہ مکمل کر لیا۔

حضرت ام سلمہؓ سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں۔

”کلام الہی کو سن کر نجاشی اتنا متاثر ہوا کہ زار و قطار رونے لگا، یہاں تک کہ روتے روتے اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس کے ساتھ اس کے درباری بھی رو رہے تھے۔ وہ بھی اتنا روتے کہ ان کی کتابیں اشکوں سے بھیک گئیں۔ اس کے بعد نجاشی نے ہم سے کہا کہ یہ کلام

جو تمہارے نبی پر اتر ہے اور وہ کلام جو عیسیٰ لائے تھے، دونوں ایک ہی نور کی شعاعیں ہیں۔

پھر اس نے عمرو بن عاص اور اس کے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا۔
 ”تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ خدا کی قسم میں انہیں کبھی تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔“

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں۔

”جب ہم لوگ نجاشی کے دربار سے باہر نکلے تو عمرو بن عاص نے ہم لوگوں کو دھمکی دیتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

”خدا کی قسم میں کل پھر بادشاہ کے پاس آؤں گا اور اس کو ان لوگوں کے متعلق ایک ایسی بات بتاؤں گا جو اس کے سینے کو ان کے حلات غیظ و غضب اور اس کے دل کو نفرت و کراہت سے بھر دے گی۔ میں اس کو اس بات پر آمادہ کر کے چھوڑوں گا کہ وہ مکمل طور پر ان کا استیصال کر دے اور ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے۔“

اس پر عبداللہ بن ربیعہ نے کہا۔

”عمرو! خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ یہ سب اگرچہ ہمارے مخالف ہیں مگر ہیں تو ہمارے قریبی عزیز ہی۔“

مگر عمرو بن عاص نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو اس بات کو..... میں بادشاہ کو ایسی بات بتاؤں گا جس کی وجہ سے ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک جائے گی..... خدا کی قسم میں اس سے کہوں گا کہ عیسیٰ بن مریمؑ کے متعلق ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خدا کے بیٹے نہیں اس کے بندے ہیں۔“

اور اگلے روز عمرو بن عاص نے نجاشی کے دربار میں حاضر ہو کر کہا۔
 ”عالی جاہ! یہ لوگ جن کو آپ نے اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے
 اور جن کو آپ نے اپنی حمایت کا سایہ فراہم کیا ہے یہ لوگ عیسیٰ بن مریمؑ
 کے متعلق بہت سخت اور نہایت ناپسندیدہ بات کہتے ہیں۔ آپ انہیں
 بلوائیے اور اس بات پر باز پرس کیجئے جو وہ عیسیٰ ابن مریمؑ کے بارے میں
 کہتے ہیں۔“

حضرت ام سلمہؓ کا سلسلہ بیان آگے بڑھتا ہے۔

”ہم لوگوں کو اس کا پتہ چلا تو ہمیں اس کی بڑی فکر ہوئی اور ہم لوگ
 غم سے نڈھال ہو گئے۔ پھر ہم نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے باہم
 مشورہ کی ایک مجلس منعقد کی کہ اگر بادشاہ نے عیسیٰ ابن مریمؑ کے بارے
 میں پوچھا تو ہمیں کیا جواب دینا چاہیے۔ آخر کار یہ بات طے ہوئی کہ ہم
 ان کے متعلق وہی بات کہیں گے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتائی ہے۔ اس معاملے
 میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم سے سرمُوانخراں نہیں
 کریں گے، چاہے اس کے نتیجے میں ہمارا جو بھی حشر ہو۔ ہم نے یہ بات بھی
 متفقہ طور پر طے کی کہ بادشاہ کے سامنے اس دفعہ بھی جعفر بن ابی طالب ہی
 ہماری نمائندگی کریں گے۔“

پھر جب بادشاہ کے طلب کرنے پر ہم اس کے دربار میں پہنچے تو دیکھا
 کہ اس کے درباری آج بھی حسبِ معمول اور حسبِ مراتب اپنی اپنی جگہوں پر
 بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم نے عمرو بن عاص اور اس کے ساتھی کو بھی بادشاہ کے
 پاس موجود پایا۔ جب ہم بادشاہ کے سامنے پہنچ گئے تو اس نے سلسلہ
 گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”تم لوگ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“
 ”اُن کے بارے میں ہم وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے نبیؐ نے ہم کو بتائی ہے۔“ جعفر نے جواب دیا۔

”وہ اُن کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“ نجاشی نے پوچھا۔
 ”وہ کہتے ہیں،“ جعفر نے کہا ”کہ وہ اللہ کے بندے، اس کے رسولؐ اس کی رُوح اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے کنواری مریم بتول کی طرف اتقار کیا تھا۔“

جعفر کی یہ بات سُن کر نجاشی نے اپنے ہاتھ کو زمین پر مارتے ہوئے کہا۔
 ”خدا کی قسم، عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں تمہارے نبیؐ نے جو بات بتائی ہے، اُن کی حیثیت ایک بال کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔“
 نجاشی کے مُنہ سے یہ باتیں سُسن کر اس کے پاس بیٹھے ہوئے درباری غصے سے پیچ و تاب کھانے اور پھنکاریں مارنے لگے۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر نجاشی نے پھر کہا۔

”چاہے تم لاکھ پھنکاریں مارو مگر حقیقت یہی ہے جو میں کہ رہا ہوں؛ پھر اس نے ہماری طرف ملتفت ہوتے ہوئے کہا۔

”جاؤ، تم لوگ بے خوف و خطر اور اطمینان کے ساتھ رہو۔ جو شخص بھی تم کو گالی دے گا یا بُرا بھلا کہے گا، اس کو تاوان ادا کرنا پڑے گا اور جو تم کے کسی قسم کا تعرض کرے گا، اسے سزا بھگتنی پڑے گی۔ خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی منظور نہیں ہے کہ تم میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے اور اس کے عوض مجھے سونے کا پہاڑ مل جائے۔“

پھر اُس نے عمرو بن عاص اور اس کے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

”ان کے ہدیے انھیں واپس لوٹا دو۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔“

حضرت ام سلمہؓ اپنی سرگزشت کا آخری ورق پلٹتی ہیں۔

”اس کے بعد عمر بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ وہاں سے غائب و

غائب واپس لوٹ گئے اور ہم لوگ عزت اور آرام کے ساتھ نجاشی کے یہاں رہنے لگے۔“

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نہایت امن و اطمینان کے

ساتھ نجاشی کے یہاں دس سال گزارنے کے بعد سن سات ہجری میں مسلمانوں

کی ایک جماعت کے ساتھ حبشہ چھوڑ کر یثرب کا رخ کیا۔ ادھر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی فتح سے فارغ ہو کر مدینہ واپس پہنچے ہی تھے کہ

ہاجرین حبشہ کا یہ قافلہ بھی حضرت جعفر کی قیادت میں وہاں پہنچ گیا۔ آپ

ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنی خوشی کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا۔

”مَا أَدْرِي بِأَيِّ مِمَّا أَنَا أَشَدُّ

فَرِحًا أَوْ بَفَتْحِ خَيْبَرَ أَمْ بِقُدُومِ

جَعْفَرٍ“

”مجھے نہیں معلوم کہ دونوں میں کس بات

کی مجھے زیادہ خوشی ہے، آیا خیبر کی

فتح کی یا جعفر کی آمد کی؟“

اور ان کی واپسی پر مسلمانوں، خصوصاً ان میں سے فقراء و مساکین کی

خوشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ کیوں کہ وہ

مکروروں، ضعیفوں اور حاجت مندوں کے ساتھ نہایت ہربانی اور حسن

سلوک کا معاملہ کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے لوگ ان کو ”ابوالمساکین“ کے

لقب سے یاد کرتے تھے۔ ان کے متعلق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا

بیان ہے۔

”ہم مساکین کے حق میں جعفر بن ابی طالبؑ سب سے اچھے تھے۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے جاتے اور جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا، ہم کو کھلاتے۔ یہاں تک کہ اگر کھانے کی چیز ختم ہو جاتی تو وہ گھی رکھنے کا خالی شدہ مشکیزہ لاکر ہمارے آگے رکھ دیتے جس کو پھاڑ کر ہم گھی کی وہ معمولی مقدار بھی جو اس کی اندرونی دیوار کے ساتھ لپٹی ہوتی — چاٹ لیا کرتے تھے۔“

مدینہ منورہ میں حضرت جعفر بن ابی طالبؑ کا زمانہ قیام بہت مختصر رہا۔ کیوں کہ شہ ہج کے آغاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلادِ شام میں رومیوں کے ساتھ معرکہ آرائی کے لیے ایک فوج تیار کی اور اس فوج کی قیادت حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا۔

”اگر زید بن حارثہ قتل یا زخمی ہو جائیں تو فوج کی امارت جعفر بن ابی طالب کے ذمے ہوگی۔ اگر جعفر بھی شہید یا مجروح ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں گے۔ لیکن اگر عبداللہ بن رواحہ بھی جنگ میں کام آجائیں یا وہ گھائل ہو جائیں تو مسلمان خود اپنے میں سے کسی کو اپنا سپہ سالار بنالیں۔“

جب مسلمان ”موتہ“ پہنچے جو اردن میں شام کے بالائی حصے میں واقع ہے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے مقابلے کے لیے ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل زبردست رومی فوج تیار کھڑی ہے۔ اور اس کی مدد کے لیے نصرانی عربوں نے مزید ایک لاکھ کی بھاری جمعیت فراہم کر رکھی ہے جس میں لخم، جذام اور قضاعہ وغیرہ عیسائی قبائل کے جنگ جو شامل ہیں۔ اس دو لاکھ کے عظیم لشکر کا مقابلہ کرنے والی مسلمانوں کی فوج صرف تین ہزار

مجاہدین پر مشتمل تھی۔

آخر کار جب دونوں فوجوں میں مڈ بھیر ہوئی اور جنگ کی چکی اپنی پوری رفتار سے چلنے لگی تو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کے گرتے ہی حضرت جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ اپنی گھوڑی (شقرا) سے کود پڑے۔ پھر انھوں نے تلوار سے اس کی ٹانگیں کاٹ دیں تاکہ ان کے بعد دشمن اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور جھنڈا لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے دشمن کی صفوں میں دوڑ تک گھستے چلے گئے۔

”ابا، کتنی عمدہ ہے جنت، کتنا خوش آئند ہے اس کا قرب اور کیسا ٹھنڈا ہے اس کا پانی۔ رومیوں کا عذاب قریب آ گیا ہے۔ یہ سب کافر اور بعید النسب ہیں۔ جب ان سے مڈ بھیر ہو گئی ہے تو لازم ہے کہ میں ان کے اوپر کاری ضرب لگاؤں!“

وہ دشمن کی صفوں میں ہر طرف چکر لگاتے اور اپنی شمشیر خارا شگاف کے جوہر دکھاتے پھر رہے تھے کہ دشمن کی ایک کاری ضرب نے ان کے دائیں ہاتھ کو کاٹ کر الگ کر دیا۔ انھوں نے جھنڈے کو بائیں ہاتھ میں تھام لیا مگر دشمن نے تلوار کا دوسرا وار کیا اور ان کا بائیں ہاتھ بھی کٹ کر جدا ہو گیا۔ اب انھوں نے جھنڈے کو اپنے دونوں بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے سے چٹا لیا مگر جلد ہی تیسری ضرب نے ان کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اب جھنڈا حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بھی برابر لڑتے رہے یہاں تک کہ اپنے دونوں ساقیوں سے جا ملے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے تینوں سالاروں کے

قتل کی خبر پہنچی تو آپ رنج اور صدمے سے ٹڈھال ہو گئے اور تعزیت کے لیے اپنے ابن عم حضرت جعفر بن ابی طالب کے گھر تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ ان کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس ان کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ وہ روٹی کے لیے اٹا گوندھ کر رکھ چکی تھیں اور بچوں کو نہلا دھلا کر، تیل وغیرہ لگا کر، صاف ستھرے کپڑے پہنا کر تیار کر چکی تھیں۔

حضرت اسماء کہتی ہیں۔

”جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے یہاں تشریف لائے تو میں نے حزن و ملال کے وہ سائے آپ کے چہرہ انور پر پھیلے ہوئے دیکھ لیے تھے جو آپ کے اندرونی کرب کی غمازی کر رہے تھے۔ آپ کو اس طرح رنجیدہ دیکھ کر میرے دل میں مختلف اندیشے اور دوسو سے سرائٹھا رہے تھے مگر اس وقت میں جعفرؓ کے متعلق آپ سے کوئی سوال اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی کہ مبادا مجھے آپ کی زبان مبارک سے کوئی ناپسندیدہ بات سننی پڑ جائے۔ آپ نے سلام کے بعد مجھ سے فرمایا کہ جعفرؓ کے بچوں کو میرے پاس لاؤ۔ میں نے انھیں آواز دی تو وہ خوشی سے چہکتے ہوئے آپ کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ آپ کے پاس پہنچنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکا رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ وہ سب سے پہلے آپ کے پاس پہنچ جائے۔ آپ نے ان کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا، ان کے اوپر جھک گئے اور انہیں چومنے لگے۔ اس وقت آپ کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو جاری تھے۔ جب میں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ کیوں رو رہے ہیں۔ کیا آپ کے پاس جعفرؓ اور

ان کے دونوں ساتھیوں کے متعلق کوئی نانا خوشگوار اطلاع آئی ہے ؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہاں، آج وہ سب شہید ہو گئے۔“

اس وقت جب چھوٹے بچوں نے اپنی ماں کو روتے دیکھا تو ان کے معصوم چہروں سے بسم کی کرنیں غائب ہو گئیں اور وہ سب اپنی جگہ پر اس طرح بے حس و حرکت اور ساکت و جامد ہو گئے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آنسو پوچھتے اور یہ کہتے ہوئے واپس گئے۔

”اللَّهُمَّ اخْلُفْ جَعْفَرًا فِي وِلْدِهِ، اے اللہ جعفر کے پیچھے اس کے بچوں کی کفالت فرما۔“

پھر فرمایا کہ میں نے جعفر کو جنت میں اس حال میں دیکھا ہے کہ ان کے دو بازو ہیں جو خون سے رنگین ہیں۔

حضرت ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ

دو شخصوں کے درمیان شاید ہی کبھی ایسے گہرے اور مضبوط تعلقات قائم ہوئے ہوں گے، جیسے حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوسفیان بن حارث کے درمیان تھے۔

ابوسفیان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر اور ان کے ہم جولی تھے، دونوں ایک زمانے میں پیدا ہوئے، اور ایک ہی خاندان میں ان کی نشوونما ہوئی۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عم ناد تھے۔ ان کے والد حارث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ ایک ہی صلب، صلب عبدالمطلب سے تھے۔ مزید برآں یہ کہ وہ آپ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ سیدہ حلیمہ سعدیہ نے ان دونوں کو ایک ہی وقت میں دودھ پلایا تھا۔ ان تعلقات کے علاوہ وہ نبوت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت گہرے دوست تھے اور جسمانی طور پر آپ سے غیر معمولی مشابہت رکھتے تھے۔ انھیں تمام وجوہ و اسباب کی بنا پر ابوسفیان کی ذات سے اس بات کی توقع کی جاتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے میں پہل کریں گے، اور آپ کی پیروی میں سب پر سبقت لے جائیں گے۔ لیکن اس کے توقع کے علی الرغم معاملہ بالکل برعکس سامنے آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ہی کارِ دعوت کا آغاز فرمایا، اور

اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا شروع کیا، اچانک ابوسفیان کے سینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف غیظ و غضب اور بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی اور ان کی دوستی دشمنی میں، صلہ رحمی قطع رحمی میں اور بھائی چاہرگی نفرت و اعراض میں بدل گئی۔

ابوسفیان بن حارث کا شمار اس وقت قریش کے مشہور شہسواروں اور اس کے اونچے درجے کے شعراء میں ہوتا تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ان کی دعوت کی مزاحمت میں اپنی تلوار اور زبان دونوں کا بھرپور استعمال کیا۔ اور اسلام کو نقصان پہنچانے اور مسلمانوں کی اذیت رسانی اور انھیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں انھوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔

قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جتنی بھی جنگیں لڑیں، ان سب جنگوں کی آگ بھڑکانے والے یہی ابوسفیان تھے۔ اور مسلمانوں کو جتنی بھی اذیتیں اور تکلیفیں جھیلنی پڑیں ان سب میں ان کا زبردست ہاتھ تھا۔ اس شخص نے اپنی شاعری کے شیطان کو بیدار کیا اور اپنی زبان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں بے لگام چھوڑ دیا۔ اور آپ کی شان مبارک میں انتہائی دریدہ دہنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت گھٹیا، فحش اور دل آزار قسم کے اشعار کہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی دشمنی کا زمانہ بیس سال کی طویل مدت تک پھیلتا چلا گیا۔ اس دوران میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں، ریشہ دوانیوں اور ایذا رسانیوں کے تمام مکروہ حربے استعمال کر ڈالے اور انھیں صفحہ ہستی

سے نیست و نابود کرنے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔
ابوسفیان بن حارث فتح مکہ کے کچھ دنوں پہلے نعمتِ ایمان سے ہم فرراز
ہوئے۔ ان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی تفصیلات کتب سیرت
میں محفوظ ہیں، اور تاریخ کے صفحات نے انھیں ہم تک منتقل کیا ہے۔ وہ
تفصیلات انھیں کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہیں۔

”اسلام کا معاملہ جب پورے طور پر مستحکم ہو گیا، اسے بڑی حد تک
قرار و ثبات حاصل ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں
یہ خبر مشہور ہوئی کہ آپ مکہ کو فتح کرنے کے لیے تشریف لارہے ہیں تو زمین
اپنی وسعت و کشادگی کے باوجود میرے لیے تنگ ہو گئی۔ میں نے اپنے
دل میں سوچا کہ اب میں کہاں جاؤں، کس کی صحبت اختیار کروں اور کس
کے ساتھ رہوں؟ پھر میں اپنے اہل و عیال کے پاس آیا اور ان سے کہا۔
”تم لوگ مکہ سے بیکل چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ کیوں کہ محمدؐ بہت جلد یہاں
پہنچنے والے ہیں۔ اور اگر مسلمانوں نے مجھے پکڑ لیا تو یقیناً میں قتل کر دیا جاؤں گا۔“
”کیا آپ کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ
تقریباً پورا عرب محمدؐ کے آگے سرفگندہ، ان کے دائرہ اطاعت میں داخل
اور ان کے دین کا حلقہ بگوش ہو چکا ہے، اور آپ ابھی تک ان کی عداوت
پر مضر ہیں۔ حالانکہ آپ ان کی نصرت و تائید کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔“
انھوں نے کہا۔ اور برابر مجھے محمدؐ کے دین کی طرف مائل کرتے، اور مسلسل
مجھے اس کی طرف رغبت لاتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو
قبول اسلام کے لیے کھول دیا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا
اور اٹھ کر اپنے غلام مذکور سے کہا۔

”ہماری سواریاں سفر کے لیے تیار کر دو۔“

پھر اپنے بیٹے جعفر کو ساتھ لیا۔ اور ہم دونوں تیز رفتاری کے ساتھ ”ابوار“ کی طرف چل پڑے۔ ہمیں خبر ملی تھی کہ محمدؐ وہیں فرود ہیں۔ جب مقام ابوار کے قریب پہنچا تو میں نے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے ہی کوئی مجھے پہچان کر قتل کر دے۔ میں ایک میل تک پیدل چلتا رہا۔ مسلمانوں کے دستے یکے بعد دیگرے مکہ کی سمت بڑھتے رہے اور میں ان کے راستے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اصحاب محمدؐ میں سے کوئی مجھے دیکھ کر پہچان نہ لے۔

میں اسی حالت میں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستے کے ساتھ نمودار ہوئے۔ میں نے آپؐ کی طرف رخ کیا اور جا کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ آپؐ نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور مجھے پہچانتے ہی اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں گھوم کر سامنے آکھڑا ہوا۔ آپؐ نے پھر مجھ سے اعراض کیا اور میری طرف سے رخ پھیر لیا، میں پھر سامنے آ گیا۔ جب میں آپؐ کے سامنے آتا آپؐ اپنا رخ دوسری طرف کر لیتے۔

جب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے ارادے سے چلا تھا تو اس وقت مجھے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے قبول اسلام سے خوش ہوں گے۔ اور آپؐ کی خوشی آپؐ کے اصحابؓ کے لیے باعثِ فرحت و انبساط ہوگی۔ لیکن

اشک اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ ہے۔

جب مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعراض کو دیکھا تو ان کے چہروں پر بھی نفرت و بے زاری کے آثار ظاہر ہو گئے۔ ان کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں اور میں نے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت و حقارت کے شعلے رقص کرتے دیکھے۔

میں ابو بکرؓ سے ملا تو انہوں نے بھی میری طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ میں نے عمر بن خطابؓ کو ایسی تسلی طلب نظر سے دیکھا جو ان کے دل میں نرمی اور ہمدردی کے جذبات بیدار کر دے۔ مگر ان کی نگاہوں میں بھی میرے لیے غصہ، نفرت اور غیظ و غضب کے سوا کچھ نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کیا کہ ایک انصاری کو میرے خلاف اکسار دیا۔ اور اس نے مجھ سے کہا کہ ”دشمن خدا! تو ہی وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں حد سے متجاوز ہو گیا تھا؟“ وہ انصاری برابر مجھے لعنت ملامت کرتا اور مسلسل میرے اوپر چختا چلاتا رہا۔ دوسرے مسلمان بھی مجھے خشکیوں نظروں سے دیکھتے اور میری پریشانی سے خوش ہو رہے تھے۔ اس وقت اچانک میری نظر اپنے چچا حضرت عباسؓ پر پڑی۔ میں ان کے پاس پہنچا اور بولا۔ ”چچا جان! خاندان میں اپنے مقام و مرتبہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے قریبی رشتے کی بنا پر میں سمجھتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے قبول اسلام سے خوش ہوں گے۔ لیکن ان کا جو رویہ سامنے آیا ہے، آپ جانتے ہیں۔ تو اب آپ میرے متعلق ان سے بات کر کے انہیں مجھ سے راضی کر دیجئے۔“

مگر انہوں نے کہا کہ

”نہیں! خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے اعراض کو دیکھ چکا ہوں۔ ایسی حالت میں تمہارے متعلق میں ان سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ میں ان کا احترام کرتا ہوں اور ان سے ڈرتا ہوں۔ البتہ آئندہ موقع و محل کی مناسبت سے کوئی بات کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”چچا جان! تو اس وقت آپ مجھے کس کے حوالے کر رہے ہیں؟“ انھوں نے جواب دیا۔

”جو کچھ تم مجھ سے سن چکے ہو، اس کے علاوہ میرے پاس کوئی

جواب نہیں ہے۔“

ان کا یہ جواب سن کر میرے اوپر شدید حزن و ملال کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اپنے عم زاد علی بن ابی طالب کو دیکھا۔ اور ان سے اپنے اس معاملے میں بات کی مگر انھوں نے بھی وہی کہا جو چچا عباسؓ نے کہا تھا۔ تب میں پھر چچا عباسؓ کے پاس واپس آیا اور ان سے کہا۔

”چچا جان! اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کر کے میرے لیے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں بنا سکتے تو کم از کم مجھے اس شخص سے بچا لیجئے جو برابر مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے اور دوسروں کو بھی اس پر اکسار رہا ہے۔“

”کون ہے وہ؟ ذرا اس کا حلیہ تو بیان کرو۔“ انھوں نے پوچھا۔

جب میں نے اس کا حلیہ بیان کیا تو انھوں نے کہا کہ ”وہ نعمان

بن حارث نجاری ہیں۔“ پھر ایک شخص کو بھیج کر انھیں بلوایا اور ان

سے کہا۔

”نعیمان! ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عم زاد اور میرا بھتیجہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ آج اس سے مخفا ہیں لیکن عنقریب آپ اس سے راضی ہو جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اس کو ستانے سے باز آ جاؤ“ اور برابراں سے اصرار کرتے رہے حتیٰ کہ وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ سب دشتم سے باز آ جائیں گے اور کہا کہ اب میں ان سے کوئی تعرض نہیں کروں گا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جحفہؓ میں نزول فرمایا تو میں آپ کی قیام گاہ کے دروازے پر جا بیٹھا، اور اپنے لڑکے جعفر کو اپنے پاس کھڑا کر لیا۔ خیمے سے نکلتے ہوئے جب آپ کی نگاہیں میرے اوپر پڑیں تو آپ نے میری طرف سے نظریں پھیر لیں۔ لیکن پھر بھی میں آپ کی رضامندی سے ناامید نہیں ہوا۔ میں نے اپنا معمول بنا لیا کہ جب بھی کسی منزل پر آپ کا قیام ہوتا، میں آپ کے دروازے پر جا کر بیٹھ جاتا اور اپنے لڑکے جعفر کو اپنے پاس کھڑا کر لیتا۔ لیکن آپ جب بھی مجھے دیکھتے منہ پھیر لیتے۔

میں کافی دنوں تک اس صبر آزمایا صورت حال سے دوچار رہا، آخر کار جب یہ پریشانی میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تو ایک دن میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

”خدا کی قسم اب میرے سامنے دوہی راستے باقی رہ گئے ہیں۔ یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے راضی ہو جائیں، ورنہ میں اپنے اس

لہ مدینہ اور مکہ کے درمیان ایک مقام جو مکہ سے چار منزل کے فاصلے پر واقع ہے۔

لڑکے کو ساتھ لے کر نیکل جاؤں گا اور زمین میں حیران و سرگرداں پھرتا رہوں گا۔ حتیٰ کہ ہم دونوں بھوک پیاس سے مرجائیں۔ جب یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو وہ کچھ نرم پڑے اور ان کے دل میں میرے لیے ہمدردی اور رحمت و شفقت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ اور جب خیمہ سے باہر تشریف لائے تو پہلی بار میری طرف محبت آمیز نظر سے دیکھا اور میں نہال ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لب مبارک کی بند کلی اب کھل اٹھے گی۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے، میں بھی آپ کا ہم رکاب تھا۔ آپ مسجد حرام کی طرف روانہ ہوئے میں دوڑتا ہوا آپ کے آگے آگے چل رہا تھا۔ غرضیکہ میں کسی حال میں بھی آپ سے جدا نہ ہوتا۔ حنین کی وادی میں بنو ہوازن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے زبردست جمعیت اکٹھا کی اور غیر معمولی تیاریوں اور بے پناہ جوش کے ساتھ آپ کے مد مقابل ہوئے۔ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے صحابہ کا لشکر لے کر روانہ ہوئے تو میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اور جب میں نے مشرکین کے اس زبردست اجتماع کو دیکھا تو اپنے دل میں کہا۔

”خدا کی قسم آج میں ان تمام محرومیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کروں گا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے نتیجے میں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں۔ آج میں ایسی جرات و شجاعت کا مظاہرہ کروں گا جو میرے تمام پچھلے گناہوں

کافکارہ بن جائے گی۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم
مجھ سے راضی ہو جائیں گے۔“

جب دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور مشرکین کا دباؤ مسلمانوں پر
بڑھنے لگا تو ان کے اندر کمزوری اور بزدلی کو راہ مل گئی۔ وہ نبی کریم صلی
اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد سے منتشر ہو گئے اور راہ فرار اختیار کر لی اور قریب
تھا کہ ہم ہزیمت سے دو چار ہو جائیں۔

اس کٹھن گھڑی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلیری و شجاعت
دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آپ میدان جنگ کے بچوں بیچ اپنے نچر ”شہباز“
پر مضبوط چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ اور ایک پھرے ہوئے شیر کی
مانند شمشیر بکت اپنی اور اپنے آسن پاس کے لوگوں کی طرف سے مدافعت کر
رہے تھے۔ اس وقت میں اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور اپنی تلوار کی نیام
توڑ کر پھینک دی۔ خدا جانتا ہے کہ اس وقت میرا ارادہ یہی تھا کہ میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں لڑتا ہوا آپ کے سامنے ہی
شہید ہو جاؤں۔ میرے چچا حضرت عباسؓ آپ کے نچر کی لگام تھامے
ایک جانب کھڑے تھے۔ میں نے دوسری سمت اپنی جگہ سنبھالی۔ میرا
دایاں ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا اور بائیں ہاتھ سے حضورؐ کی رکاب تھامے
دشمنوں کو آپ سے دور ہٹا رہا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس طرح بے جگری کے
ساتھ لڑتے ہوئے دیکھا تو بڑے تحسین آمیز انداز میں چچا عباسؓ سے پوچھا
”یہ کون ہے جو اس طرح داد شجاعت دے رہا ہے؟“
”یہ آپ کا بھائی، آپ کا عم زاد ابوسفیان بن حارث ہے۔ اے اللہ

کے رسول! آپ اس سے راضی ہو جائیں، چچانے جواب دیا۔
 ”میں اس سے راضی ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کی اس ساری عداوت
 کو معاف فرمائے جو اس نے اب تک میرے ساتھ کی ہے،“ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے راضی ہو گئے۔ اس سے مجھے
 بے پناہ مسرت حاصل ہوئی اور میرا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھلنے لگا۔
 میں نے رکاب ہی میں آپ کے قدم مبارک کو بوسہ دیا۔ پھر آپ نے میری
 طرف ملتفت ہوتے ہوئے فرمایا۔

”میرے بھائی! آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو۔“

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اپنے لیے یہ کلمات
 سن کر میرے اندر شجاعت و دلیری کے شعلے بھڑک اٹھے اور میں نے مشرکین
 پر ایسا زور دار حملہ کیا کہ ان کے قدم ڈگمگائے اور وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔
 اس حملے میں بہت سے مسلمان بھی میرے ساتھ شریک ہو گئے۔ ہم ان کو
 تقریباً تین میل تک کھد پڑتے چلے گئے۔ اور وہ مختلف اطراف میں بھاگ نکلتے۔
 حضرت ابوسفیان بن حارثؓ کو غزوہ عینین کے موقع پر نبی کریمؐ کی
 رضامندی کی نعمت حاصل ہوئی اور وہ آپ کی صحبت کی سعادت سے بھی
 سرفراز ہو گئے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے سابقہ رویے
 کی وجہ سے ان کو ایسی شرمندگی و پشیمانی دامن گیر ہوئی کہ وہ زندگی بھر آپ
 کے چہرے کی طرف کبھی نظر نہ اٹھا سکے، نہ کبھی آپ سے آنکھیں چار کر سکے۔
 حضرت ابوسفیانؓ اپنی زندگی کے اُن تاریک ایام پر بے حد ندامت و خجالت
 محسوس کرتے جو دور جاہلیت کی نذر ہو گئے، جن میں نورِ خداوندی اور کتابِ الہی

سے محروم رہے۔ لیکن اب وہ شب و روز قرآنِ کریم پر جھکے رہتے، اس کی آیات کی تلاوت اور اس کے احکام پر غور و فکر میں مشغول رہتے اور اس کی نصیحتوں سے بھرپور استفادہ کی کوشش کرتے۔

انھوں نے دنیا اور اس کے عیش و آرام سے یکسر کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے تمام اعضاء و جوارح کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک روز جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا۔

”عائشہؓ! جانتی ہو یہ کون ہے؟“

حضرت عائشہؓ نے تم کہا۔

”نہیں اے اللہ کے رسولؐ!“

”یہ میرے عم زاد ابوسفیان بن حارثؓ ہیں۔ دیکھو! یہ سب سے پہلے مسجد میں آتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں اس سے نکلتے ہیں۔ اور جب تک اس میں رہتے ہیں، نماز میں مشغول رہتے ہیں،“ آپ نے فرمایا۔

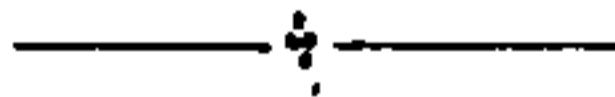
اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وہ اپنے رب سے جا ملے تو حضرت ابوسفیانؓ شدید صدمہ اور رنج و الم سے دوچار ہوئے، ایسے صدمے سے جو کسی ماں کو اپنے اکلوتے فرزند کی وفات پر بھی نہیں ہوتا۔ وہ آپ کی جدائی کے غم میں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے جس طرح کوئی شخص اپنے محبوب کی جدائی پر بھی نہیں روتا۔ اور آپؐ کی یاد میں ایسا شاہکار اور درد انگیز مثنوی کہا جو ان کے سوزِ محبت، دردِ شوق اور اندرونی کرب و الم کا آئینہ دار ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں انھیں اس بات کا احساس ہوا

کہ اب ان کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے تو انھوں نے اپنے ہاتھوں اپنے لیے قبر کھودی۔ اور اس پر ابھی تین دن بھی نہیں گزرے تھے کہ ان کا آخری وقت آ پہنچا، جیسے موت کے ساتھ ان کا کوئی عہد و پیمان ہو۔ اس وقت انھوں نے اپنے گھر والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

نبرد دار! میری موت پر آنسو نہ بہانا۔ خدا گواہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ پھر ان کی پاکیزہ روح اس دار فانی کو چھوڑ کر اپنی ابدی آرام گاہ کی طرف پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی نماز جنازہ حضرت عمر فاروق اعظم نے پڑھائی۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہما صحابہ کرام غم سے نڈھال ہو گئے۔ اور ان کی وفات کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک زبردست حادثہ شمار کیا گیا۔



حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

میں شیطانِ رحیم سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی تاکید کی۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ میں نے اس کو نصیحت کی کہ میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کر جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک بڑتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے، اس وقت میں تمہیں بتا

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ
حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَى وَهْنٍ
وَفِصَالَهُ فِي عَامَيْنِ أَنْ اشْكُرْ
لِي وَلِوَالِدَيْكَ، إِلَى الْمَصِيرِ وَ
إِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ
بِي شَيْئًا مَّا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ
فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُكُمْ فِي
الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ
مَنْ أَنْابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ
مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُونَ ۝

رقمان ۱۳، ۱۵

دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے۔“

ان آیات کریمہ کے پس منظر میں ایک بڑی انوکھی اور حیرت انگیز کہانی ہے جس میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کم سن نوجوان مختلف اور باہم متضاد جذبات و میلانات کی اندرونی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اور آخر کار یہ کش مکش شر پر خیر کی فتح اور کفر پر ایمان کی کامیابی پر منتج ہوتی ہے۔ اس کہانی کا ہیرو ایک نجیب الطرفین نوجوان ہے جو اپنی نسبی شرافت اور خاندانی عظمت کے لحاظ سے اپنے ہم چشموں میں بلند ترین مقام کا حامل نظر آتا ہے۔ اور وہ نوجوان ہیں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وارضاه۔

اُس وقت، جب نور نبوت نے مکہ کے دروہام اور اس کے گلی کوچوں کو روشنی کا لباس پہنا دیا تھا۔ سعد بن ابی وقاص ابھی ایک کم سن نوجوان تھے، شباب سے بھرپور اور ناز و نعمت کے پروردہ۔ وہ بڑے رقیق اور نازک احساسات کے مالک، والدین کے انتہائی فرماں بردار اور اپنی والدہ سے غیر معمولی محبت رکھنے والے تھے۔

باوجود اس کے کہ سعد بن ابی وقاص اس وقت ابھی اپنی عمر کی سترہویں بہار کا استقبال کر رہے تھے۔ اپنے وجود میں پنجمے عمر والوں کی سی بُرد باری و دانش مندی اور بوڑھوں جیسی دانائی و دور اندیشی سمیٹے ہوئے تھے۔ ان کو ان بچکانہ کھیلوں سے کوئی رغبت نہیں تھی جن میں اُن کے ہم سن نوجوان غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کرتے اور بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے۔ اس کے برعکس وہ اپنی کوششیں صرف تیروں کی تیاری، کمانوں کی دستی اور تیر اندازی کی مشق میں صرف کیا کرتے تھے۔ ان کی ان مصروفیات اور ان میں غیر معمولی اہماک دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید وہ خود کو مستقبل

میں کسی عظیم الشان کارنامے کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ نیز وہ اپنی قوم کی اس بد عقیدگی اور زیوں حالی پر انتہائی بے چینی اور بے اطمینانی محسوس کر رہے تھے، جس میں وہ مبتلا تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہ کسی مضبوط، دوراندریش اور مہربان ہاتھ کے منتظر ہیں جو غیب سے برآمد ہو کر لوگوں کو ان تاریکیوں سے نکال دے جن کے اندر وہ ٹاماک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔

ان حالات میں اللہ عزوجل کی مشیت نے ساری انسانیت کو اس مہربان اور کارساز ہاتھ سے نوازنا چاہا۔ اور وہ ہاتھ تھا سرور کائنات محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کا ہاتھ، جس کی مچھلی میں وہ ستارہ روشن تھا، وہ کوکب درخشاں تھا جس کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑ سکتی یعنی کتاب الہی، قرآن عظیم۔

سعد بن ابی وقاصؓ نے حق اور ہدایت کی اس پیکار کے بلند ہوتے ہی کسی تاخیر کے بغیر اس پر بیک کہی۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے مردوں میں ان کا تیسرا یا چوتھا نمبر تھا۔ بسا اوقات وہ بڑے فخر کے ساتھ یہ بات کہا کرتے تھے کہ ”سات روز تک میں اسلام کا تیسرا حصہ تھا۔“

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے پناہ مسرت حاصل ہوئی اس لیے کہ ان کے اندر شرافت و مردانگی کی ایسی علامات یابی جاتی تھیں جو اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ عنقریب یہ ہلال بدرِ کامل بن کر آسمان شہرت پر جگمگائے گا۔ اور حسب و نسب کے لحاظ سے ان کو معاشرے میں جو بلند مرتبہ حاصل تھا وہ مکہ کے نوجوانوں کو اس بات پر ابھار رہا تھا کہ وہ بھی ان کے راستے کو اپنائیں اور خود کو ان کے سانچے میں ڈھالیں۔ اور ان ساری

باتوں کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں تھے۔ کیونکہ ان کا تعلق بنو زہرہ سے تھا اور بنو زہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ آمنہ بنت وہب کا قبیلہ تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ اپنے اس رشتے پر فخر کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ کرام کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ آپ نے سامنے سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو آتے ہوئے دیکھ کر فرمایا۔

”هَذَا خَالِي فَلْيُرِنِي امْرُؤًا
يَمِيرُ مَمُومًا هِيَ - ايسا اگر کسی کا
ماموں ہو تو مجھے دکھائے۔“

لیکن حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا قبول اسلام کا معاملہ اتنی آسانی اور سہولت کے ساتھ نہیں گزر گیا۔ بلکہ اس کی وجہ سے انہیں سخت آزمائش کے دور سے گزرنا پڑا۔ ان کی آزمائش کی سختی کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق قرآن نازل فرمایا۔ ہم یہ بات حضرت سعدؓ ہی پر چھوڑتے ہیں کہ اس انوکھی آزمائش کی تفصیلات سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

”میرے قبول اسلام سے تین دن پہلے کی بات ہے۔ میں نے ایک رات خواب دیکھا کہ میں تہ برتہ تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہوں۔ اور اس اثناء میں کہ میں ان تاریکیوں سے باہر آنے کے لیے ان کی موجوں میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں، اچانک ایک چاند میرے سامنے نمودار ہوا۔ میں اس کی طرف چل پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چند آدمی میرے آگے آگے اسی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا، وہ زید بن حارثہ، علی بن ابی طالب اور ابو بکر صدیق تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ آپ لوگ یہاں کب سے ہیں۔“

انہوں نے کہا، ہم ابھی آتے ہیں۔ جب دن کو مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کام کر رہے ہیں تو میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ان کے ذریعہ مجھے تاریکیوں سے روشنی کی طرف لائے۔ میں فوراً ان کی تلاش میں نکل پڑا۔ آپ مجھے جیاد کی گھائی میں ملے اور اسی وقت عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تھے۔ چنانچہ میں مسلمان ہو گیا۔ ان تین آدمیوں کے علاوہ جن کو میں نے خواب میں دیکھا تھا، کوئی اور مجھ سے پہلے اسلام نہیں لایا تھا۔“

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اس دل چسپ داستان کے اگلے حصے سے پردہ اٹھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”میرے قبولِ اسلام کی خبر سنتے ہی میری ماں سخت ناراض ہوئی۔ میں ایک اطاعت شعار اور خدمت گزار لڑکا تھا مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ اس نے اپنے انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”سعد! یہ کیسا دین ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔ جس نے تم کو تمہارے ماں باپ کے دین سے برگشتہ کر دیا ہے۔ خدا کی قسم، تم اپنے اس نئے دین کو ترک کر دو، ورنہ میں کھانا پانی چھوڑ کر خود کو ہلاک کر لوں گی۔ اس وقت تمہارا سینہ شدتِ غم سے شق ہو جائے گا، ندامت و پشیمانی کے مارے اپنے کئی پرکھتے افسوس ملو گے اور لوگ تم کو ہمیشہ اس پر غار ڈالتے رہیں گے۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”ماں! ایسا نہ کرو کیوں کہ میں کسی بھی قیمت پر اپنے دین کو ترک نہیں کر سکتا،“ لیکن وہ اپنی دھمکی پوری کرنے پر اڑ گئی۔ اس نے کھانا، پینا سب چھوڑ دیا۔ آخر کسی روز کی مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے اس کا جسم ڈبلا ہو گیا، ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ میں چھوڑ

تھوڑی دیر کے بعد اس کے پاس جا کر کہتا رہا کہ کچھ کھا لو، مگر وہ شدت سے انکار کرتی رہی اور قسم کھا کر کہتی تھی کہ ”یا تو تم اپنا دین چھوڑ دو ورنہ میں کھانا پینا چھوڑ کر جان دے دوں گی۔“ اس وقت میں نے اس سے کہا۔

”ماں! بے شک میں تیرے ساتھ شدید محبت رکھتا ہوں، لیکن اللہ اور اس کے رسول کی محبت تیری محبت سے زیادہ ہے۔ تو یہ بات اچھی طرح سن لے۔ خدا کی قسم اگر تیری ہزار جانیں ہوں اور وہ سب ایک ایک کر کے تیرے اندر سے نکل جائیں تب بھی میں اپنے دین کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

جب اس نے میرا یہ اٹل فیصلہ سنا اور میرے استقلال کو دیکھا اور اس کو یقین ہو گیا کہ میں اپنے دین کو کسی حال میں چھوڑنے والا نہیں ہوں تو آخر کار وہ اپنی ضد سے باز آگئی اور کھانے پینے پر مجبور ہو گئی۔ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے ہمارے متعلق اپنا یہ قول نازل فرمایا۔

”وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ
تَشْرِكْ بِى مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ
عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُهُمَا
فِى الدُّنْيَا مَعْرُوفًا۔“

”اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے
ساتھ کسی ایسے کو شریک کر جسے تو
نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان
اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ
کرتا رہ۔“

جس روز حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اسلام قبول کیا، وہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے انتہائی خیر و برکت کا دن تھا۔ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور ان کے بھائی حضرت عمیر بن ابی وقاصؓ نے جو موقف اختیار کیا وہ بڑا قابل دید تھا۔

حضرت عمیرؓ اس وقت ایک کم سن نوجوان تھے ان کی عمر حد بلوغت

سے کچھ ہی متجاوز تھی۔ جنگ کے لیے روانگی سے قبل، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان مجاہدین کا جازرہ لے رہے تھے، حضرت عمیرؓ اس ڈر سے آپ کی نگاہوں سے چھپنے کی کوشش کے باوجود وہ خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں آنے سے نہیں بچا سکے۔ آپ نے ان کو دیکھ لیا اور واپس کر دیا۔ واپسی کا حکم سن کر وہ رونے لگے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترس کھا کر ان کو جنگ میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اجازت مل گئی تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ خوش خوش ان کے پاس گئے اور اپنے ہاتھ سے ان کی کمر میں تلوار باندھی، پھر دونوں بھائی جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ اور جب جنگ ختم ہوئی تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اپنے بھائی عمیرؓ کو خون شہادت میں لت پت میدان بدر میں چھوڑ کر اللہ سے ان کے اجر کی امید لیے تنہا مدینہ واپس لوٹے۔

اور جنگ اُحد میں۔ جب مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بکھر گئے، یہاں تک کہ اس وقت آپ کے ساتھ صرف چند صحابہ کرام رہ گئے تھے، جن کی تعداد دس سے بھی کم تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ڈٹ کر اپنی کمان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت اور حفاظت کرتے رہے۔ اس وقت ان کی کمان سے نکلا ہوا ہر تیر اپنے صحیح نشانے پر لگتا اور کسی نہ کسی مشرک کے لیے فرشتہ اجل ثابت ہوتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس شان سے تیر اندازی کرتے دیکھا تو یہ کہہ کر ان کو مزید تیر اندازی پر اکسایا۔

”إِذْ مِرْسَعِدُ، إِذْ مِرْسَعِدُ، فَذَلِكَ
 ”تیر چلاؤ سعد! تیر چلاؤ، میرے ماں
 باپ تم پر قربان ہوں۔“

لیکن حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اس وقت اپنی عظمت کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ گئے۔ جب حضرت عمر فاروقؓ نے ایرانیوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ کا ارادہ فرمایا۔ ایسی فیصلہ کن جنگ کا جو ان کی سلطنت کا خاتمہ کر دے، جو ان کے تخت کو متزلزل کر دے اور ایران کی سر زمین سے بت پرستی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے سارے گورنروں کے نام یہ تحریری حکم بھیجا۔

”ہر اس شخص کو میرے پاس بھیج دو جس کے پاس اسلحہ یا گھوڑا ہو۔ یا اس کے اندر شجاعت، اصابت رائے، جنگی مہارت یا شعر و شاعری اور تقریر و خطابت کی کوئی امتیازی خوبی ہو، یا اس کے اندر کوئی ایسا وصف پایا جاتا ہو جس سے جنگ میں کوئی مفید کام لیا جاسکے“

خلیفہ کے اس حکم کی تعمیل میں ہر طرف سے مجاہدین کے وفد مدینہ پہنچنا شروع ہو گئے۔ اس کام کے مکمل ہو جانے کے بعد جب حضرت عمرؓ نے ارباب حل و عقد سے اس عظیم الشان لشکر کی قیادت کے سلسلے میں مشورے طلب کیے تو سب نے یک زبان ہو کر شیر و فاع حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا نام لیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان کو طلب کر کے فوج کی کمان ان کے ہاتھ میں سونپ دی۔

جب اس لشکر جرار نے مدینہ سے کوچ کرنے کا قصد کیا تو حضرت عمرؓ اس کو الوداع کہنے اور اس کے قائد کو نصیحت کرنے کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر انھوں نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

”سعد! اللہ عز و جل کے مقابلے میں یہ چیز تم کو ہرگز کبھی قسم کے فریب میں مبتلا نہ کرے کہ تم کو ”خال رسول اللہ“ اور ”صاحب رسول اللہ“

کے معزز القاب سے پکارا جاتا ہے۔ یاد رکھو، اللہ تعالیٰ کبھی بُرائی کو بُرائی کے ذریعے نہیں مٹاتا، بلکہ وہ ہمیشہ بُرائی کو بھلائی سے موکرتا ہے۔“

”سعد! بے شک اللہ تعالیٰ اور کسی بندے کے درمیان اطاعت و

فرماں برداری کے سوا دوسرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اور وہ صرف اطاعت ہی

کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ ہمیشہ اپنی

نگاہیں ان امور پر مرکوز رکھنا جن پر تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا تھا،

اور ان کا حد درجہ اہتمام اور التزام کرنا کہ دراصل وہی اس لائق ہیں کہ ان کا

اتباع کیا جائے اور ان کو نافذ کیا جائے۔“

یہ مبارک لشکر اس شان سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا کہ اس میں

ننانوے وہ خوش قسمت صحابہ کرام شریک تھے جن کو حق و باطل کے اولین

معرکہ ”معرکہ بدر“ میں شرکت کا زریں موقع نصیب ہوا تھا۔ تین سو دس

سے کچھ اوپر وہ محترم ہستیاں تھیں جو بیعت رضوان اور اس کے بعد کے

غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہیں۔ تین سو وہ حضرات

تھے جو غزوہ فتح مکہ میں نبی کریم کے ساتھ تھے۔ اور ان کے علاوہ ان لوگوں

کی تعداد سات سو تھی جن کو صحابہ کرام کی اولاد ہونے کا شرف حاصل تھا۔

حضرت سعد مدینہ سے روانہ ہو کر قادیسیہ پہنچے اور اپنی فوج کے ساتھ

۱۰ کو فوسے ۲۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام جہاں مسلمانوں اور ایرانیوں

کے درمیان ۱۰ھ میں وہ فیصلہ کن معرکہ پیش آیا تھا جس میں مسلمانوں

کو زبردست فتح حاصل ہوئی، جس کے بعد ایرانی کسی میدان میں مسلمانوں

کے سامنے جم نہیں سکے۔

یومہ زن ہو گئے۔ یوم ہریرہ کے موقع پر مسلمانوں نے ایرانیوں پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا عزم بالجزم کیا۔ چنانچہ انھوں نے دشمن کو ہر طرف گھیرے میں لے لیا اور لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے ہر سمت سے ان کی صفوں میں گھس گئے۔ آخر ایک زبردست اور گھمسان کی جنگ کے بعد مسلمان ایرانی سپہ سالار "رستم" کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے اس کا سر نیزے پر اٹھایا۔ اس کے بعد ایرانی افواج کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب اس طرح مسلط ہو گیا اور ان کی ہمتیں اس طرح پست ہو گئیں کہ ایک مسلمان سپاہی کسی ایرانی کو اشارے سے اپنے پاس بلاتا اور بسا اوقات اسی کی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیتا تھا۔

اس جنگ میں بے شمار مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور ایرانی مقتولین کی تعداد کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ صرف دریائے قادیسیہ میں ڈوب کر مرنے والوں کی تعداد تیس ہزار تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو عمر طویل اور مال کثیر سے نوازا تھا مگر جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنا ایک پیرانا اونی جبہ منگوا یا اور اپنے ورثاء کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

”مجھے اسی جبے میں کفنانا کیونکہ اسی کو پہن کر میں نے جنگ بدر میں مشرکین کا سامنا کیا تھا اور چاہتا ہوں کہ اسی کو پہن کر اللہ عزوجل کے سامنے جاؤں۔“

ۛ

۱۰ جنگ قادیسیہ کا تیسرا اور آخری معرکہ جس میں شدتِ قتال کی وجہ سے تلواروں کی جھنکار، تیروں کی سنسناہٹ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے سوا کوئی دوسری آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

رازدانِ رسولِ حضرتِ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ

”تم چاہو تو ہاجرین میں شامل ہو جاؤ اور اگر چاہو تو انصار میں شمولیت اختیار کر لو۔ تمہیں اختیار ہے، دونوں میں سے جو بھی پسند ہو، اپنالو۔“

یہ ہیں وہ الفاظ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن الیمان سے اس وقت فرماتے تھے جب وہ پہلے پہل دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ حضرت حذیفہ کے والد حضرت یمانؓ مکی تھے اور قبیلہ بنی عیس سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے اپنے ہی قبیلے کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ مکہ چھوڑنے اور یثرب میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے وہاں انہوں نے قبیلہ بنی عبدالاشہل کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ کر لیا، پھر اسی خاندان میں شادی کر لی اور وہیں حضرت حذیفہؓ کی پیدائش ہوئی۔ بعد میں جب وہ موانع دور ہو گئے جو ان کے اور مکہ کی آمد و رفت کے درمیان حائل تھے، تو وہ آزادی کے ساتھ وہاں آنے لگے۔ لیکن ان کا قیام زیادہ تر مدینہ ہی میں رہتا۔ اور جب آفتابِ اسلام جزیرہ نمائے عرب پر صوفگن ہوا تو حضرت یمانؓ بنی عیس کے دس افراد پر مشتمل اس وفد کے ایک رکن تھے، جس نے بارگاہِ نبوت میں باریاب ہو کر اپنے اسلام کا اعلان کیا تھا۔ یہ واقعہ ہجرتِ نبوی سے پہلے کا ہے۔ اس طرح حضرت حذیفہؓ اپنی اصل کے اعتبار سے مکی اور پیدائش و پرورش کے لحاظ سے مدنی تھے۔ ان کی پرورش و پرداخت ایک مسلم گھرانے

میں ایسے مسلمان والدین کی آغوش میں ہوئی تھی جو ابتدا ہی میں اسلام کے ٹھنڈے اور خوشگوار سائے میں آگئے تھے۔ اس طرح حضرت حذیفہؓ آنحضرتؐ کے دیدار سے مشرف ہونے سے قبل ہی دائرۃ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ حضرت حذیفہؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے بے حد مشتاق تھے۔ اسلام لانے کے بعد سے وہ حضورؐ کے حالات اور اوصاف کے متعلق لوگوں سے برابر پوچھتے رہتے اور ان کے دل میں آتش شوق دیدار و زیارت ہمیشہ بھڑکتی رہتی تھی۔ آخر کار سمنہ شوق پر سوار وہ آپؐ کی ملاقات کے لیے مدینہ جا پہنچے اور بارگاہ نبوت میں حاضر ہوتے ہی دریافت کیا:

”اللہ کے رسولؐ! میں ہاجر ہوں یا انصاری؟“

”تم چاہو تو ہاجرین میں شامل ہو جاؤ اور اگر چاہو تو انصار میں شمولیت اختیار کر لو، تمہیں اختیار ہے، دونوں میں سے جو بھی پسند ہو اپنالو، آپؐ نے فرمایا۔“ ”یا رسول اللہؐ! میں انصاری ہوں،“ حضرت حذیفہؓ نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو حضرت حذیفہؓ نے حضورؐ کی صحبت اختیار کر لی۔ وہ سائے کی طرح آپؐ کے ساتھ لگے رہتے، اور غزوہ بدر کے سوا تمام غزوات میں حضورؐ کے ساتھ شریک رہے۔ غزوہ بدر میں اپنی عدم شرکت کی وجہ انھوں نے خود ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

”میں اُس وقت اپنے والد کے ساتھ ایک ضرورت سے مدینہ سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہاں کفار قریش نے ہم دونوں کو گرفتار کر لیا اور پوچھا کہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“

ہم نے کہا ”مدینہ“ انھوں نے پوچھا ”کیا تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)،

کے پاس جانا چاہتے ہو؟ ” ہم نے جواب دیا ” ہم مدینہ جانا چاہتے ہیں۔“ اور پھر وہ ہم کو اس شرط پر رہا کرنے پر آمادہ ہوئے کہ ہم ان سے اس بات کا عہد کریں کہ ” نہ ہم ان کے خلاف محمدؐ کی مدد کریں گے، نہ جنگ میں ان کا ساتھ دیں گے۔“ یہ عہد لے کر جب انہوں نے ہم کو رہا کیا تو ہم نے مدینے پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورت حال سے آگاہ کیا، اور آپ سے دریافت کیا کہ ایسی حالت میں ہم کیا کریں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اپنا عہد پورا کرنے اور ان کے خلاف خدائے تعالیٰ سے استعانت کی تاکید فرمائی۔

جنگِ اُحد میں حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد حضرت یمانؓ دونوں نے شرکت کی۔

حضرت حذیفہؓ نے اس میں خوب دادِ شجاعت دی اور اختتامِ جنگ کے بعد صبحِ سالم واپس لوٹے لیکن ان کے والد حضرت یمانؓ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ مگر ان کو یہ سعادت مشرکین کی بجائے مسلمانوں کی تلوار سے حاصل ہوئی۔

ہوا یہ کہ اس غزوے کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یمانؓ اور حضرت ثابت بن وقش رضی اللہ عنہما کو عورتوں اور بچوں کے ساتھ ایک محفوظ جگہ میں چھوڑ دیا۔ کیونکہ یہ دونوں حضرات کافی ضعیف اور سن رسیدہ تھے۔ جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو حضرت یمانؓ نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”ہم کس بات کے منتظر ہیں؟ خدا کی قسم اب ہماری عمر کا بہت قلیل حصہ باقی رہ گیا ہے ہم بہت جلد اپنی مدتِ حیات پوری کرنے والے ہیں کیوں نہ ہم اپنی تلواریں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں

شریک ہو جائیں۔ ممکن ہے خدائے تعالیٰ ہم کو دولت شہادت سے بہرہ ور فرماتے۔“ پھر وہ دونوں اپنی اپنی تلواریں لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت ثابت بن وقش کو تو مشرکین کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی مگر حضرت یحییٰ بن یزید کی تلواریں برسنے لگیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے والد... میرے والد... پکارتے رہ گئے۔ مگر کسی نے ان کی آواز پر دھیان نہ دیا اور بوڑھے یحییٰ اپنے سناٹھوں کی تلواروں سے زخمی ہو کر گرے اور گوہر مقصود اپنے دامن میں سمیٹے بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہو گئے۔ اور حضرت حذیفہ صرف اتنا کہہ کر رہ گئے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کی مغفرت کرے وہ ارحم الراحمین ہے۔“ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ بیٹے کو اس کے باپ کی دیت ادا کر دیں۔ مگر حضرت حذیفہ نے یہ کہہ کر دیت لینے سے معذرت کر دی کہ ”وہ شہادت کے طالب تھے اور ان کی مطلوبہ چیز ان کو حاصل ہو گئی۔ خدا تو گواہ رہنا۔ میں نے اپنے باپ کی دیت کو مسلمانوں پر صدقہ کر دیا۔“ اس وسیع النظری اور کشادہ دلی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ان کا مرتبہ اور بلند کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی صلاحیتوں کو بھانپ کر ان کے اندر پوشیدہ اور مخفی صلاحیتوں سے ان کے حسب استعداد کام لیا کرتے تھے۔ آپ نے جب اس پہلو سے حضرت حذیفہ کو جانچا تو ان کے اندر تین اعلیٰ ترین اور غیر معمولی خوبیوں کا انکشاف ہوا۔ ایک تو غیر معمولی ذہانت جس سے کام لے کر وہ مشکل سے مشکل مسائل کو بہ آسانی حل کر لیا کرتے۔ دوسری زود فہمی اور حاضر دماغی، جس کے ذریعہ وہ بہت جلد معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ اور تیسری چیز تھی رازداری،

جس پر وہ سختی کے ساتھ کاربند تھے۔

مدینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے سب سے مشکل اور ان کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ یہ تھا کہ یہودیوں اور ان کے ہم خیال وہم مشرب مشرکین میں منافقین کا ایک گروہ موجود تھا جو اپنی گھناؤنی سازشوں اور مکروہ ریشہ دوانیوں کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات کھڑی کرتا رہتا تھا۔ اس لیے آپ نے حضرت حذیفہ کو ان تمام منافقوں کے ناموں سے آگاہ کر دیا تھا۔ اور یہ ایک ایسا راز تھا جس سے حضرت حذیفہؓ کے سوا کسی دوسرے کو مطلع نہیں کیا تھا۔ اور یہ خدمت ان کے سپرد کی تھی کہ وہ ان منافقین کی سرگرمیوں اور ان کی حرکات و سکنات پر برابر نظر رکھیں۔ اور ان کی طرف سے پیش آنے والے خطرات کا سدباب اور تدارک کریں۔ اسی وجہ سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ "راز دان رسول" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

یوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف مواقع پر بہت سی اہم اور نازک ذمہ داریوں کی ادائیگی میں حضرت حذیفہؓ کا تعاون حاصل کرتے رہتے تھے لیکن سب سے مشکل اور خطرناک ذمہ داری جس میں ان کی ذہانت، زود فہمی اور رازداری کا زبردست امتحان تھا۔ اس وقت ان کے حوالے کی گئی تھی جب غزوہ خندق کے موقع پر دشمن نے ہر طرف سے مسلمانوں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اور محاصرے کے طول پکڑ جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی پریشانیوں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے۔ اور کتنے ہی مسلمان خدا کے متعلق بدگمانی میں مبتلا ہو گئے۔

مسلمانوں کی تو یہ حالت تھی، لیکن قریش اور ان کے حلیف مشرک

قتال کی حالت بھی ان سخت گھڑیوں میں مسلمانوں سے بہتر نہیں تھی۔ ان کے قدم ڈمگ گئے۔ خدائے تعالیٰ نے ان کے اوپر تیز آندھی کا عذاب مسلط کر دیا تھا جس سے ان کے نیمے اٹھ گئے۔ دیکھیں اونڈھی ہو گئیں اور ان کے چوٹھے بچھ گئے تہ ہوا کے تیز جھکڑوں نے ان کے چہروں پر کنکریوں کی بوچھاڑ کر دی اور ان کی آنکھوں اور نکتوں کو گرد و غبار سے بھر دیا۔

جنگ کے ان نازک اور فیصلہ کن لمحات میں جو فریق گھبرا کر صبر و ثبات کا دامن ہاتھوں سے چھوڑ دیتا ہے، وہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد رہتا ہے۔ اور وہ فریق جو ضبط و تحمل سے کام لیتا ہے اور فریق مخالف کے راہ و راہ اختیار کرنے کے بعد تک محاذ پر ڈٹا رہتا ہے، فتح مند اور کامران ہوتا ہے۔ اور ایسے لمحات میں جو جنگ کے انجام پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ برتری اسی فریق کو حاصل ہوتی ہے جو فریق ثانی کے حالات سے مکمل طور پر آگاہی حاصل کر کے اپنے موقف کا تعین کرتا اور نقشہ جنگ کو ترتیب دیتا ہے۔

اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی صلاحیتوں اور ان کے تجربات سے کام لینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور آپ نے طے کیا کہ کوئی آخری اور فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے ان کورٹ کی تاریکی میں دشمن کے کیمپ میں بھیج کر اس کے حالات معلوم کر لیں۔ تن تنہا دشمن کے کیمپ میں جانا، موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا لیکن جذبہ اطاعت و جاں سپاری کی رہنمائی میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس مہم کو کس طرح انجام دیا۔ اس کو انھوں نے خود اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے۔

”اس رات ہم لوگ صفیں باندھے محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھی مشرکین ہم سے بالائی جانب صف آرا تھے۔ اور بنو قریظہ کے

یہودی ہم سے نشیب کی طرف تھے۔ ہم لوگوں کو بنو قریظہ کے ان یہودیوں سے اپنے اہل و عیال کے متعلق سخت خطرات لاحق تھے۔ وہ رات، ظلمت، ٹھنڈک اور ہواؤں کی شدت کے لحاظ سے مختصر سے کی شدید ترین رات تھی۔ ہوائیں اس طرح گرج رہی تھیں جیسے وہ کانوں کے پردے پھاڑ ڈالیں گی اور تاریکی کا یہ عالم تھا کہ ہم کو اپنے ہاتھ نہیں دکھائی دیتے تھے۔

ایسی سخت گھڑیوں میں منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اپنے گھر لوٹ جانے کی اجازت مانگنے لگے۔ وہ کہتے کہ ”ہمارے مکانات دشمن کے سامنے کھلے پڑے ہیں“۔ حالانکہ دراصل وہ کھلے ہوتے نہ تھے۔ تو منافقین میں سے جو بھی آپ سے جانے کی اجازت مانگتا آپ اُسے اجازت مرحمت فرمادیتے۔ یہاں تک کہ محاذ پر صرف تقریباً تین سو آدمی رہ گئے تھے۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ایک کر کے ہم میں سے ہر شخص کے پاس تشریف لائے۔ آپ میری طرف بھی آئے۔ اس وقت ٹھنڈک سے بچاؤ کے لیے میرے پاس صرف بیوی کی ایک ہلکی سی چادر تھی، جو میرے گھٹنوں تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے قریب آئے۔ میں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا۔

”کون ہے؟“

”حذیفہ“ میں نے جواب دیا۔

”حذیفہ؟“

میں فلقے اور سردی کی شدت کے مارے زمین کی طرف سمٹ گیا

اور بولا۔

”ہاں اسے اللہ کے رسول! میں حذیفہؓ ہوں، حذیفہ بن یمان!“
 آپ مجھ سے اور قریب آگے اور سرگوشی کے انداز میں فرمایا۔
 ”تم چپکے سے دشمن کے کیمپ میں جاؤ اور اس کے حالات معلوم کر کے
 مجھے آگاہ کرو۔“ حکم سن کر انتہائی خوف اور سخت ٹھنڈک کے باوجود
 میں نے موت کی وادعی کی سمت قدم اٹھا دیئے۔ اور آپ کی زبان مبارک
 سے میرے لیے دعا کے الفاظ نکلے۔

اللَّهُمَّ احْفَظْهُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ وَ عَنْ يَمِينِهِ وَ عَنْ شِمَالِهِ وَ عَنْ قُوَّتِهِ وَ تَحْتِهِ۔
 ”خدا یا اس کی حفاظت فرما۔ اس کے
 سامنے سے، اس کے پیچھے سے، اس
 کے دائیں سے، اس کے بائیں سے،
 اس کے اوپر سے اور اس کے نیچے سے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے یہ الفاظ ابھی ختم بھی نہیں
 ہونے پاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل سے خوف اور میرے جسم
 سے ٹھنڈک کے اثرات کو زائل کر دیا۔ جب میں جانے کے لیے مڑا تو
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پکارا اور فرمایا۔

”حذیفہؓ! دیکھو ان کے کیمپ میں پہنچ کر کوئی اقدام نہ کرنا۔“ میں نے
 کہا بہت اچھا۔ اور خاموشی کے ساتھ تاریکی کے پردے میں چلتا ہوا
 مشرکین کے لشکر میں پہنچ گیا۔ اور ان کے درمیان اس طرح گھل مل گیا
 گویا میں انھیں میں کا ایک فرد ہوں۔ میرے پہنچنے کے کچھ ہی دیر کے
 بعد ابوسفیان ان کے درمیان تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔ اس نے کہا۔
 ”قریش کے لوگو! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، مگر مجھے
 اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ

جائے۔ اس لیے تم میں سے ہر شخص اپنے بغل والے کو اچھی طرح سے دیکھ لے۔“
 میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے آدمی کا ہاتھ پکڑا اس سے پوچھا کہ تم کون
 ہو؟ اس نے کہا فلاں ابن فلاں۔ اور پھر ابوسفیان نے تقریر کا سلسلہ آگے بڑھتا
 ”قریش کے لوگو! اب تمہارے لیے یہاں مزید ٹھہرنے کی کوئی گنجائش نہیں
 رہ گئی ہے تم دیکھ ہی رہے ہو کہ ہمارے جانور ہلاک ہوتے جا رہے ہیں، بنو
 قریظہ کے یہودی ہم سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ اور تند و تیز ہواؤں کے ہاتھوں
 جن پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا ہمیں کرنا پڑ رہا ہے، ان کا بھی تم مشاہدہ
 کر رہے ہو۔ اس لیے اب بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے کوچ کر چلو۔ میں خود
 بھی واپس جا رہا ہوں!“

یہ کہہ کر وہ اپنے اونٹ کے پاس آیا اس کے گھٹنے سے بندھی ہوئی رسی
 کھولی اور اس پر سوار ہو گیا۔ پھر اسے ایک کوڑا رسید کر دیا۔ اونٹ اچھل کر
 کھڑا ہو گیا اور اپنے سوار کو لے کر روانہ ہو گیا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 نے واپسی سے پہلے مجھے کسی اقدام سے روک نہ دیا ہوتا تو اس وقت تیر مار کر
 ابوسفیان کو قتل کر ڈالنا میرے لیے بہت آسان تھا۔

اس کے بعد جب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس
 آیا تو دیکھا آپ ازواجِ مطہرات میں سے کسی کی چادر اور ٹھٹھے نماز میں مشغول
 ہیں۔ آپ نے مجھے دیکھا تو اپنے قریب بلایا، میں جا کر آپ کے قدموں میں
 بیٹھ گیا۔ اور آپ نے میرے اوپر اپنی چادر کا ایک کنارہ ڈال دیا۔ میں
 نے پوری رپورٹ خدمتِ اقدس میں پیش کر دی۔ جسے سن کر آپ بہت
 خوش ہوئے۔ اس پر اللہ کی تعریف کی اور اس کا شکر ادا کیا۔“

”حضرت حذیفہ ابن الیمانؓ زندگی بھر منافقین سے متعلق رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے رازوں کے ایمن رہے۔ خلفاء راشدین منافقوں کے متعلق ہمیشہ ان کی طرف رجوع کرتے رہے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر بن خطابؓ کا تو یہ حال تھا کہ جب بھی کسی مسلمان کا انتقال ہوتا تو وہ لوگوں سے دریافت فرماتے کہ حذیفہؓ اس کی نماز جنازہ میں شریک ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہوتا تو وہ بھی شریک جنازہ ہوتے۔ بصورت دیگر انھیں اس کے مومن مخلص ہونے میں شک ہو جاتا اور نماز جنازہ نہ پڑھتے۔ ایک بار انھوں نے حضرت حذیفہؓ سے دریافت کیا کہ ”میرے گورنروں میں سے کوئی منافق ہے؟“ حضرت حذیفہؓ نے کہا ”ہاں ایک ہے۔“ حضرت عمرؓ نے پوچھا، کون؟ مگر حضرت حذیفہؓ نے اس کا نام بتانے سے معذرت کر دی۔ حضرت حذیفہؓ کا بیان ہے کہ ”اس کے چند ہی دنوں کے بعد حضرت عمرؓ نے اس عامل کو معزول کر دیا۔ جیسے انھیں اس کی نشان دہی کر دی گئی ہو۔“

شاید کچھ لوگوں کو یہ بات نہ معلوم ہو کہ حضرت حذیفہؓ نہاوند، دینور، ہمدان اور رے کے فاتح تھے۔ اور تمام مسلمانوں کے ایک مصحف پر جمع کیے جانے کے محرک بھی یہی حضرت حذیفہؓ تھے۔

مگر ان تمام خدمات اور عظیم الشان کارناموں کے باوجود خدا کے خون اور اس کی گرفت سے ہمیشہ لرزہ براندام رہتے تھے۔ جب ان کا مرض الموت شدت اختیار کر گیا اور وقت موعود قریب آ پہنچا تو کچھ صحابہ کرامؓ رات کے پچھلے پہر ان کی عیادت کو تشریف لائے۔

حضرت حذیفہؓ نے دریافت فرمایا کہ ”یہ کون سا وقت ہے؟“ جب ان کو بتایا گیا کہ اب صبح ہونے ہی والی ہے تو فرمایا۔ اعوذ باللہ من صباح یفضی الی السار۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس صبح سے

جو مجھے جہنم میں پہنچا دے گی۔ پھر پوچھا، ”کفن لائے ہو؟“
 کہا گیا ”ہاں“ تو فرمایا ”دیکھو! میرے کفن میں غلو سے کام نہ لینا۔ اگر
 خدائے تعالیٰ کے یہاں میرے لیے خیر ہے تو وہاں مجھے اس سے اچھا لباس
 مل جائے گا۔“ پھر کہنے لگے، ”خدایا! تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ فقر کو غنا پر، تواضع
 کو تکبر پر اور موت کو زندگی پر ترجیح دیتا رہا۔“

پھر ان کی زبان سے آخری الفاظ ادا ہوئے۔ حبیبؓ جاء علی شوق،
 لا افلح من ندم اور طائر روح نفس حاکی کو چھوڑ کر
 اپنے ابدی اور دائمی آشیانے کی طرف پرواز کر گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ
 رَاجِعُونَ۔

خدائے تعالیٰ حضرت حذیفہؓ بن ایمان پر رحم فرمائے۔ وہ اپنی طرز
 کے ایک نرالے شخص تھے۔



ردیف رسول حضرت عقیبہ بن عامرؓ رضی اللہ عنہ

یہ ہیں رسول خدا جو ایک طویل انتظار اور شدید بے چینی کے بعد یثرب کے بالائی حصے سے نمودار ہو رہے ہیں۔ اور ادھر مدینہ منورہ کے باشندے ہیں جو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ملاقات کی خوشی میں اپنے گھروں کے دروازوں اور مکانوں کی چھتوں پر اکٹھا ہو رہے ہیں۔ اور ان کے ہونٹوں پر تہلیل و تکبیر کے سردی کلمات چل رہے ہیں۔ اور اس طرف مدینہ کی کم سن اور بھولی بھالی بچیاں اپنے ہاتھوں میں دت اور آنکھوں میں شوقِ انتظار لیے نکل پڑی ہیں۔ ان کے لبوں پر خیرِ مقدمی نغمات ہیں، جنھیں وہ ایک ساتھ مل کر بار بار دہرا رہی ہیں

أَقْبَلَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا
مِنْ ثَنِيَاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَّ الشُّكْرُ عَلَيْنَا
مَادَعَى إِلَهُ دَاعٍ

ہو کر ماہِ کامل ہمارے سامنے آ گیا جب تک بلانے والا اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا رہے ہمارے اوپر اس کا شکر واجب ہے اور یہ رہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوس جو دورویہ صفت بستہ کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نہایت سبک خراہی اور نرم روی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ جس کو مشتاقِ روحوں اور پر شوقِ دلوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے، جس کے اوپر

اشکھائے مسرت و نشاط کے گہر ہائے آبدار اور تبسم ہائے سرور و انبساط کے گلہائے مشکبار نچھاور کیے جا رہے ہیں۔

لیکن حضرت عقبہ ابن عامرؓ جنہیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جلوس کا مشاہدہ نہ کر سکے۔ وہ آپ کے استقبال کی سعادت سے محروم رہ گئے۔ یہ محرومی ان کے حصے میں اس لیے آئی کہ وہ اپنی بکریوں کو لے کر انھیں چرانے کے لیے وادیوں کی طرف نکل گئے تھے کیونکہ بھوک پیاس کی وجہ سے ان کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ جب کہ یہ چند بکریاں ہی ان کا کل سرمایہ تھیں جو دنیا کے متاعِ فانی میں سے ان کے زیرِ ملکیت تھا۔

فرحت و سرور کی وہ کیف پرور فضا جو مدینہ پر چھائی ہوئی تھی، بہت جلد اس کی دور و قریب کی وادیوں تک عام ہو گئی، سارے کھسار بیابان اس کی ضیا باریوں سے جگمگا اٹھے اور اس کی خوش خبریاں حضرت عقبہ ابن عامرؓ جنہیؓ کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں حالانکہ وہ مدینہ سے دور وسیع میدانوں میں اپنی بکریاں چراتے پھر رہے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات کیسے اور کن حالات میں ہوئی۔ اس کی تفصیل ہم انھیں کے الفاظ میں ہدیہ قارئین کر رہے ہیں۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو میں اس وقت اپنی بکریوں میں تھا۔ آٹ کا تشریف آوری کی خبر جیسے ہی مجھے ملی، میں نے بکریوں و رہیں چھوڑا اور بمانا خیر آپ سے ملنے کے لیے مدینہ روانہ ہو گیا اور بارگاہِ نبوی میں پہنچ کر عرض کیا ”اللہ کے رسول! آپ میری

بیعت قبول فرمائیں گے؟“

”تم کون ہو؟“ آپ نے پوچھا۔

”عقبہ ابن عامر جہنی“ میں نے جواب دیا۔

”کون سی بیعت تمہیں پسند ہے۔ تم بیعت اعرابہ کرو گے یا بیعت

ہجرت؟ آپ نے پوچھا۔

”بیعت ہجرت“ میں نے جواباً عرض کیا۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے بھی انھیں باتوں پر بیعت کی جن پر اور ہاجرین سے لی تھی۔ پھر میں آپ کی خدمت میں ایک رات گزار کر واپس اپنی بکریوں میں آ گیا۔

ہم لوگ کل بارہ آدمی تھے جو اسلام لانے کے بعد اپنی بکریاں چرانے کے لیے مدینہ منورہ سے دور — وادیوں میں اقامت گزین تھے — ایک دن ہمارے ایک ساتھی نے کہا — ”اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین سیکھنے اور ان کے اوپر آسمان سے نازل ہونے والی وحی کو سُننے کے لیے باری باری خدمت اقدس میں حاضری نہ دے سکیں تو ہمارے اندر زخیر کی کوئی بات نہ ہوگی۔ مناسب یہ ہے کہ روزانہ ہم میں سے ایک آدمی شرب جائے اور اپنی بکریاں باقی ساتھیوں کی حفاظت میں چھوڑ جلتے“

میں نے کہا کہ ”تم لوگ یکے بعد دیگرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور ہر جانے والا اپنی بکریاں میرے حوالے کر جایا کرے — میں اپنی بکریوں کے بارے میں بہت محتاط رہتا تھا اور انھیں کسی کے سپرد کر جانا مجھے گوارا نہ تھا۔“

”اس کے بعد سے روزانہ صبح کو میرا ایک ساتھی حضور کی خدمت میں جاتا۔“

اور اس کی بکریوں کو چرانے کی ذمہ داری میں انجام دیتا۔ اور واپسی پر میں وہ تمام باتیں اس سے پوچھ کر معلوم کر لیتا جو وہاں سے سن کر اور دیکھ کر وہ آتا تھا۔

لیکن چند روز کے بعد میں نے اپنے آپ سے کہا۔

”تمہارا بُرا ہو۔ کیا تم ان چند مقبرسی بکریوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور ان سے براہِ راست اور بالمشافہ دین سیکھنے پر ترجیح دینا چاہتے ہو؟ پھر میں اپنی بکریوں سے کنارہ کش ہو کر مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ وہاں پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ ہمسائیگی مسجد نبوی میں قیام کروں۔“

حضرت عقبہ بن عامرؓ جہنی جس وقت یہ اہم فیصلہ کر رہے تھے اس وقت اُن کے دل میں یہ بات کھٹکی بھی نہ ہوگی کہ چند سال گزرنے کے بعد وہ اکابرِ علماء صحابہؓ میں سے ایک زبردست عالم، بڑے قُرّار میں سے ایک مشہور قاری، عظیم فاتحین میں سے ایک نامور فاتح اور قابلِ ذکر والیانِ اسلام میں سے ایک کامیاب والی ہو جائیں گے۔ اور جب وہ اپنی بکریوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف جارہے تھے تو ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ وہ ام الدنیا۔ دمشق۔ کو فتح کرنے والے لشکر کا ہراول دستہ ہوں گے۔ اور اس کے سرسبز و شاداب باغات کے درمیان بابِ توما کے پاس اپنے لیے ایک شاندار محل تعمیر کروائیں گے نیز وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ دنیا کے سبز نگینہ اور اس کے والی۔ مصر۔ کو فتح کرنے والی فوجِ ثنکے قائدین میں سے ایک قائد ہوں گے اور وہاں جبلِ مقطم کی جڑ میں ایک خوبصورت

مکان بنوائیں گے۔ یہ ساری باتیں مستقبل کے سینے میں پوشیدہ تھیں اور
خدا نے تعالیٰ کے سوا کوئی بھی انھیں نہیں جانتا تھا۔

مدینہ منورہ آکر حضرت عقبہ ابن عامرؓ نے مستقل طور پر رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کر لی۔ وہ سائے کی طرح ہمیشہ آپ کے ساتھ
رہتے۔ آپ جہاں کہیں تشریف لے جاتے، آپ کے حجر کی لگام ان کے ہاتھ
میں ہوتی۔ آپ جدھر بھی رخ کرتے، وہ ہمیشہ آپ کے آگے آگے چلتے۔ اور
بسا اوقات آپ انھیں اپنی سواری پر اپنے پیچھے بٹھالیتے تھے۔ جس کی وجہ
سے وہ ”ردیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ کے لقب سے پکارے جانے
لگے۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ آنحضرتؐ خود اپنی سواری سے اتر جاتے تاکہ وہ
سوار ہو جائیں۔ اور آپ خود پا پیادہ چلیں۔ خود ان کا بیان ہے کہ

”ایک دفعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجر کی لگام تھامے
مدینہ کے ایک بن میں آپ کے آگے چل رہا تھا۔ آپ نے مجھے مخاطب
کرتے ہوئے فرمایا۔ ”عقبہ! کیا تم سوار نہیں ہو گے؟“

میرے دل میں آیا کہ کہدوں ”نہیں“ مگر پھر اس خوف سے کہ کہیں
اس میں حضورؐ کی نافرمانی نہ ہو جائے، میں نے کہا۔

”جی ہاں! اے اللہ کے نبیؐ۔“

تب آپ اپنے حجر سے نیچے اتر آئے اور میں امتثال امر کے طور پر
سوار ہو گیا۔ اور آپ پیدل چلنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نیچے
اتر آیا اور رسول اللہؐ سوار ہو گئے۔ پھر آپ نے فرمایا۔

”عقبہ! میں تم کو دو بے مثل سورتیں بتاؤں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں اے اللہ کے رسولؐ! ضرور بتائیں۔“

تب آپ نے مجھے ”قیل اعوذ بر رب الفلق“ اور ”قیل اعوذ بر رب الناس“ پڑھایا۔ اس کے بعد جب نماز کھڑی ہوئی تو آپ نے نامت فرمائی اور انھیں دونوں سورتوں کو اس نماز میں پڑھا۔ اور مجھ سے فرمایا۔
 ”سوئے سے پہلے اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان دونوں سورتوں کو ضرور پڑھ لیا کرو۔“

اس کے بعد سے میں زندگی بھر اس وظیفے پر عمل پیرا رہا۔
 حضرت عقبہ ابن عامرؓ نے صرف دو چیزوں علم اور جہاد پر اپنی تمام توجہ مرکوز کر دی تھی۔ اور اپنی تمام طاہری اور باطنی صلاحیتوں کو ان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ علم کے گہرے اور میٹھے چشمے — چشمہ نبوت — سے خوب خوب سیراب ہوئے۔ اور مختلف اصنافِ علم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسب فیض کیا۔ حتیٰ کہ قرآن و حدیث، فقہ و فرائض، ادب و فصاحت اور شعر و شاعری میں درجہ کمال کو پہنچ گئے۔

حضرت عقبہؓ نہایت خوش گلو شخص تھے۔ قرآن نہایت خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے جب رات کا سناٹا چھا جاتا اور فضا پرسکون اور خاموشی کی چادرتن جاتی تو یہ کتاب اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اس کی آیات کی تلاوت شروع کرتے تو صحابہ کرامؓ ان کی قرأت کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو جاتے، اس سے سجد متاثر ہوتے اور خدا کے خوف سے ان کے دلوں میں سوز و گداز ہو جاتا اور ان کی آنکھیں بے تحاشا اشک ریز ہو جاتیں۔

ایک روز حضرت عمرؓ نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ ”عقبہ!

مجھے کچھ قرآن سناؤ، انھوں نے قرآن حکیم کی آیات پڑھنی شروع کیں۔ ایک تو ”رب السموات والارض“ کا پڑشوکت اور لرزہ براندام کر دینے والا کلام، دوسرے حضرت عقبہ ابن عامرؓ کی پُرسوزا اور دل میں اتر جانے والی آواز۔ حضرت عمرؓ بے حد متاثر ہوئے ان کے اوپر بے اختیار گریہ طاری ہو گیا اور روتے روتے ان کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

انتقال کے بعد حضرت عقبہ ابن عامرؓ اپنے ہاتھ کا بکھا ہوا ایک مصحف چھوڑ گئے تھے۔ یہ مصحف مصر کی ایک جامع مسجد — جامع عقبہ ابن عامرؓ — میں بہت زلمنے تک موجود تھا جس کے آخر میں ”کتب عقبہ بن عامر الجہنی“ کے الفاظ درج تھے۔

حضرت عقبہ ابن عامرؓ کا یہ مصحف دنیا میں پایا جانے والا قدیم ترین مصحف تھا، لیکن یہ بھی ہمارے دیگر قدیم اور بیش قیمت سرمایوں کی طرح زمانے کی دست برد سے نہ بچ سکا۔

اور جہاں تک جولانگاہ جہاد میں ان کی سرگرمیوں اور کارناموں کا تعلق ہے، تو ہمارے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ حضرت عقبہ ابن عامرؓ جہنی غزوہ احد اور اس کے بعد پیش آنے والے تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ وہ ان جانبازوں میں سے ایک تھے جنھوں نے فتح دمشق کے موقع پر غیر معمولی شجاعت اور ہمت و مردانگی کا مظاہرہ کیا اور دشمن کے چھکے چھرا دیے۔ اور حضرت ابو عبیدہؓ ابن جراح نے اس کے صلہ میں ان کو اس اعزاز سے نوازا کہ فتح دمشق کی خوش خبری انھیں کے ذریعہ امیر المومنین حضرت عمر ابن خطابؓ کی خدمت میں مدینہ بھجوائی، وہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک آٹھ دن سات راتیں

کہیں رُکے بغیر تیز رفتاری کے ساتھ سفر کر کے وہاں پہنچے اور حضرت عمرؓ کو فتحِ عظیم کی خوش خبری سنائی۔ وہ اس لشکرِ اسلام کے قائدین میں سے تھے جس نے مصر کو فتح کیا تھا اور اس کا بدلہ امیر المومنین حضرت معاویہؓ ابن ابی سفیان نے یہ دیا کہ انھیں وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ تین سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ پھر حضرت معاویہؓ نے انھیں جہاد کے لیے بحرِ ابیض متوسط میں واقع جزیرہ روڈس لے بھیج دیا۔

جہاد سے ان کے شوق و تعلق کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے جہاد سے متعلق بہت سی احادیث نبویہ کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا تھا اور ان کی روایت خاص طور پر مسلمانوں سے کرتے تھے۔ وہ بڑی جانفشانی اور شوقِ دل چسپی کے ساتھ تیر اندازی کی مشق کرتے اور اس میں غیر معمولی بہارت پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔

جب حضرت عقبہ ابن عامرؓ جہنمیؓ مرض الموت میں مبتلا ہوئے — اور اس وقت وہ مصر میں تھے — تو انھوں نے اپنے لڑکوں کو پاس بلا کر یہ نصیحت کی۔ میرے جگر گوشو! میں تم کو تین باتوں سے روکتا ہوں۔ ان کی سختی سے ساتھ پا بندی کرنا۔

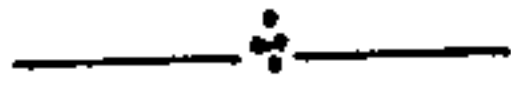
۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کبھی کسی غیر ثقہ سے قبول نہ کرنا۔

۲۔ کبھی قرض نہ لینا۔ خواہ تم فقر و احتیاج کے اس درجے تک پہنچ جاؤ

۳۔ بحر متوسط میں واقع ایک جزیرہ قبرص کے مغربی اور ترکی کے جنوب مغربی سمت میں ہے۔

کہ تمہیں کبیل اور موٹے جھوٹے کپڑے پہننے پڑیں۔
 ۳۔ اشعار کبھی نہ لکھنا کہ اس کی مشغولیت کے نتیجے میں تمہارے دل
 قرآن سے غافل ہو جائیں۔ اور جب ان کی وفات ہوگئی تو انہیں جیل
 مقطم کی تلی میں دفن کیا گیا۔ پھر جب لوگ ان کے ترکے کی طرف متوجہ
 ہوئے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ستر سے اوپر کمائیں چھوڑی ہیں۔ اور ہر
 کمان کے ساتھ ترکش اور تیر بھی ہیں۔ اور ان کے متعلق ان کی یہ وصیت
 موجود تھی کہ انہیں راہِ خدا میں وقف کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ قاری، عالم اور غازی حضرت عقبہ ابن عامر جنہیؓ کے چہرے کو
 شاداب رکھے اور انہیں اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین اجر سے
 نوازے۔ آمین۔



حضرت حبیب بن زید انصاری رضی اللہ عنہ

حضرت حبیب بن زید رضی اللہ عنہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کے ایک ایک شخص سے ایمان کی خوشبو پھوٹتی تھی اور ان کی نشوونما ایک ایسے گھر میں ہوئی تھی جس کے ایک ایک فرد کی لوحِ جبین پر قربانی و فداکاری کی ان گنت داستانیں رقم تھیں۔

ان کے والد حضرت زید بن عاصم رضی اللہ عنہ تھے جو یشرب میں مسلمانوں کے ہراول میں شامل تھے۔ وہ ان شتر سعادت مند لوگوں میں سے تھے جو لیلۃ العقبہ میں موجود تھے، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ اس موقع پر ان کے ساتھ ان کی زوجہ محترمہ اور ان کے دونوں صاحب زادے بھی موجود تھے۔ اور ان کی والدہ تھیں حضرت ام عمارہ نسیبہ مازنیہ۔ وہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے اللہ کے دین کی حفاظت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں ہتھیار اٹھایا تھا۔ اور ان کے بھائی تھے حضرت عبداللہ بن زید جنہوں نے غزوہ احد کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں اپنی جان کی بازی لگادی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر ان لوگوں کے متعلق فرمایا تھا۔

”بَارَكَ اللهُ عَلَيْكُمْ مِنْ أَهْلِ بَيْتِ رَحِمَتِ اللهِ مِنْكُمْ اللهُ مِنْ”
 ”تم گھر والوں پر اللہ اپنی برکت نازل فرمائے، تم گھر والوں پر اللہ اپنی

آہل بیت۔ رحمت نازل کرے۔“

ایمان کا نور حضرت حبیب بن زیدؓ کے دل میں اس وقت جاگزیں ہو چکا تھا جب وہ ابھی اپنی عمر کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے۔ اور قتلاً ازل کی طرف سے ان کے مقدر میں یہ بات لکھ دی گئی تھی کہ وہ اپنے والدین خالہ اور بھائی کے ساتھ مکہ جائیں اور ستر خوش بخت اور فرخندہ فال ہستیوں کے ساتھ مل کر اسلام کی تاریخ بنانے میں اپنا کردار ادا کریں، جہاں انھوں نے تاریکی کے پردے میں اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو بڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقبہ کی بیعت کی تھی۔ اور اُس تاریخ سے اللہ کا رسولؐ ان کو اپنے والدین سے زیادہ محبوب اور اس کا دین ان کے نزدیک اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔

اپنی کم سنی کے باعث حضرت حبیب بن زیدؓ معرکہ بدر میں شریک نہیں ہو سکے۔ اسی طرح وہ غزوہ احد میں شرکت کے شرف سے بھی محروم رہے کیونکہ اس موقع پر بھی ان کی عمر ہتھیار اٹھانے کی نہیں تھی۔ البتہ اس کے بعد سارے غزوات میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوتا رہا اور ان میں سے ہر ایک میں انھوں نے عزت و غلبہ، مجد و شرف اور فداکاری و جاں سپاری کے لافانی نقوش اور ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے۔

لیکن یہ سارے کارنامے اپنی عظمت و دل کشی کے باوجود حقیقت میں اس عظیم الشان کارنامے کی زبردست تیاری کے مختلف مراحل تھے جس کا ذکر ہم آئندہ سطور میں کرنے والے ہیں جو آپ کے ضمیر کو اس طرح جھنجھوڑ کر رکھ دے گا جس طرح وہ زمانہ نبوت سے لے کر اب

تک لاکھوں مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ چکا ہے اور جس کی کہانی مُرور زمانہ کے باوجود آپ کو اسی طرح پیرت و استعجاب سے دوچار کر دے گی جس طرح ان کو کر چکی ہے۔ تو آئیے ہم اس الم ناک کہانی کو اس کے آغاز سے سنیتے ہیں۔

۹۔ تک شجر اسلام کا تنہ کافی مضبوط و توانا ہو چکا تھا، اس کی شاخیں قوی ہو چکی تھیں اور اس کی جڑیں گہرائیوں میں اتر چکی تھیں۔ اس سال عرب کے اطراف و جوانب سے مختلف قبائل کے وفد کی آمد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ وفد مدینہ منورہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے، ان کے سامنے اپنے قبول اسلام کا اعلان کرتے اور ان کے دست مبارک پر سمع و طاعت کی بیعت کرتے تھے۔ انھیں وفد میں بنی حنیفہ کا وہ وفد بھی تھا جو نجد کے بالائی حصے سے آیا تھا۔ اس وفد نے مدینہ الرسول کے کنارے پڑاؤ ڈالا اور مسیلمہ ابن حبیب نامی ایک شخص کو سامان کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑ کر دربار نبوی میں حاضری کے لیے روانہ ہو گیا۔ انھوں نے آپ کے سامنے اپنی اور اپنے قبیلے کی طرف سے اسلام کا اعلان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا، ان کی خاطر تواضع فرمائی اور پیچھے رہ جانے والے ساتھی سمیت ان میں سے ہر ایک کے لیے عطیات کا حکم دیا۔ اس وفد کے واپس نجد پہنچنے کے ساتھ ہی مسیلمہ ابن حبیب اسلام سے پھر گیا اور اس نے لوگوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بنو حنیفہ کے لیے نبی بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ محمد بن عبد اللہ کو قریش کے لیے بھیجا ہے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی بنو حنیفہ کے لوگ مختلف عوامل و داعیات کے تحت اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان عوامل میں زبردست عامل قبائلی عصبیت کا جذبہ تھا۔ یہاں تک کہ اس کے سردار نے کہا۔

”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے اور مسیلمہ جھوٹا ہے لیکن مجھے بنو ربیعہ کا کذاب بنو مضر کے سچے سے زیادہ پسند ہے۔“

جب مسیلمہ کے بازو مضبوط ہو گئے، اس کا معاملہ قوی ہو گیا اور اس کے متبعین کی تعداد کافی بڑھ گئی تو اس نے اپنے دو آدمیوں کے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک خط بھیجا جس میں اس نے لکھا تھا ”اللہ کے رسول مسیلمہ کی طرف سے، اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو۔“

سلام علیک۔ اما بعد۔ نبوت کے اس منصب میں آپ کے ساتھ مجھے بھی شریک کیا گیا ہے۔ لیکن قریش زیادتی کرتے ہیں۔“

جب یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پڑھ کر سنایا گیا تو آپ نے ان دونوں قاصدوں سے پوچھا۔

”تم دونوں اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”ہم بھی وہی کہتے ہیں جو اس خط میں لکھا ہوا ہے۔“ ان دونوں

نے جواب دیا۔

”خدا کی قسم، اگر سفراء کا قتل جائز ہوتا تو میں دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔“ آپ نے فرمایا اور یہ خط لکھ کر انھیں دونوں کے ہاتھ مسیلمہ کے یہاں بھیج دیا۔

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت

”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“

مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللَّهِ إِلَىٰ مُسَيْلِمَةَ. رجم کرنے والا ہے۔ محمد رسول اللہ کی
 الْكُذَّابِ - السَّلَامُ عَلَىٰ مَنْ طرف سے مسیلمہ کذاب کو۔ سلام اس
 اتَّبَعَ الْهُدَىٰ اِمَّا بَعْدَ - فَاِنَّ پر جو ہدایت خداوندی کی پیروی کرے۔
 الْاَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ اما بعد۔ بلاشبہ زمین اللہ کی ہے، اے
 يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ جس کو چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے۔ اور
 لِلْمُتَّقِينَ - آخرت کا بہترین انجام متقیوں کے لیے ہے۔“

جب مسیلمہ کا شر حد سے تجاوز کرنے اور اس کا فساد ہر طرف پھیلنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ اس کی گمراہی پر زبرد تو بیخ کرتے ہوئے اس کو ایک خط بھیجیں۔ چنانچہ اس خدمت کے لیے آپ نے ہماری اس کہانی کے ہیرو حضرت حبیب بن زید رضی اللہ عنہما کو طلب فرمایا جو اس وقت ایک خوبصورت اور بھرپور جوانی کے مالک اور سرتاپا ایمان کی ایک مکمل تصویر تھے۔

حضرت حبیب بن زید رضی اللہ عنہما کسی شستی اور تاجیر کے بغیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ راستے کے نشیب و فراز کو طے کرتے ہوئے نجد کے بالائی حصے میں واقع بنو حنیفہ کے دیار میں ہیں پہنچے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک مسیلمہ کے حوالے کر دیا۔

خط کے مندرجات سے آگاہ ہوتے ہی مسیلمہ کا سینہ نفرت اور کینہ سے پھول گیا اور اس کے زرد اور قبیح چہرے پر شرارت اور غداری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے حکم دیا کہ حضرت حبیب بن زید کو پابہ زنجیر کر دیا جائے اور اگلے روز چاشت کے وقت میرے سامنے پیش کیا جائے۔

اگلے روز مسیلمہ نے اپنی مجلس منعقد کی، کرسی صدارت پر متمکن ہوا، دائیں بائیں اپنے متبعین کے سرغنون کو بٹھایا اور عوام کو مجلس میں آنے کا حکم دیا۔ پھر اس نے حضرت حبیب بن زیدؓ کو پیش کرنے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ وہ بوجھل بیڑیوں میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے سامنے پہنچے اور اس کینہ پرور مجمع میں اپنے لمبے قد، بلند سر اور اونچی ناک کے ساتھ اس طرح تن کر کھڑے ہو گئے جیسے کوئی مضبوط نیزہ زمین میں سیدھا گاڑ دیا گیا ہو۔

مسیلمہ نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
 ”کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں؟“
 ”ہاں“ انھوں نے فوراً جواب دیا۔ ”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔“

یہ جواب سن کر وہ غصے سے پھٹ پڑا۔ اس نے پھر پوچھا۔
 ”اور کیا تم یہ بھی گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟“
 ”میرے کان تمہاری یہ بات سننے کے لیے بہرے ہیں۔“ انھوں نے
 تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

یہ سن کر مسیلمہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ غصے میں اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اس نے اپنے جلاذ کو حکم دیا کہ اس کے بدن کا ایک عضو کاٹ دو۔ جلاذ نے تلوار کا ایک بھر پور وار کیا اور ان کے جسم کا ایک حصہ کٹ کر زمین پر ترپنے لگا۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔

”کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں؟“
 ”ہاں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے

رسول ہیں۔“ انھوں نے پھر وہی جواب دیا۔
 ”اور تم یہ بھی گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟“ اس نے
 دوبارہ وہی سوال کیا۔

”میں کہہ چکا ہوں کہ میرے کان تمہاری یہ بات سننے سے معذور ہیں۔“
 انھوں نے جواب دیا۔

اس نے جلاد کو ان کے جسم کا ایک اور عضو کاٹنے کا حکم دیا، جو کاٹ دیا
 گیا اور لڑھکتا ہوا پہلے عضو کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ لوگ پورے عرصے میں
 نگاہیں اٹھائے بڑی حیرت و استعجاب کے ساتھ ان کی ثابت قدمی اور
 ضد کو دیکھتے رہے۔

سیلہ سوال کرتا رہا، جلاد ایک ایک عضو کاٹتا رہا اور حضرت حبیب بن
 زید کہتے رہے۔

”میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔“ یہاں
 تک کہ ان کا آدھا جسم کٹے ہوئے ٹکڑوں کی شکل میں زمین پر بچھ گیا اور
 آدھا گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں بوتلا رہا۔ پھر ان کی رُوح قفس
 عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس وقت ان کے پاکیزہ ہونٹوں پر اسی رسول پاک
 کا نام تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام۔ جس کے دست مبارک
 پر انھوں نے عقبہ کی رات میں بیعت کی تھی۔

جب ان کی ماں، حضرت نسیبہ مازنیہ رضی اللہ عنہا کو ان کی شہادت
 کی خبر دی گئی تو انھوں نے صرف اتنا کہا۔

”میں نے ایسے ہی مواقع کے لیے اس کو تیار کیا تھا۔۔۔۔۔ اور اس
 کے بدلے میں اللہ سے بہترین اجر کی توقع کی تھی۔۔۔۔۔ اس نے بچپن

میں رسول سے عقبہ کی بیعت کی اور جوان ہو کر ان سے وفاداری کا حق ادا کر دیا..... اگر اللہ نے مجھے مسیلمہ پر قابو بخشا تو میں اس کی لڑکیوں کو اس پر نوحہ کرنے کے لیے مجبور کر دوں گی۔“

اور حضرت نسیبہؓ کو جس دن کی تمنا کی تھی، اس کے آنے میں زیادہ دن نہیں لگے..... ایک روز خلیفہ رسول اللہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا یہ اعلان ان کے منادی کی زبانی مدینہ منورہ کے تمام گلی کوچوں میں سنائی دے رہا تھا۔

”جھوٹے مدعی نبوت — مسیلمہ کذاب — سے جنگ کے لیے چلو۔“ اور مسلمان تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس سے مقابلے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس فوج میں حضرت نسیبہ مازنیہؓ اور ان کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زیدؓ بھی شامل تھے۔ جنگ کے دوران یہ دیکھا گیا کہ حضرت نسیبہؓ ایک بھری ہوئی شیرنی کی طرح دشمن کی صفوں کی چیرتی ہوئی پکارتی پھر رہی تھیں۔ ”کہاں ہے دشمن خدا..... بتاؤ مجھے، کہاں ہے وہ اللہ کا دشمن؟“ اور جب اس کے پاس پہنچیں تو دیکھا کہ وہ زمین پر گرا ہوا ہے اور مسلمانوں کی پیاسی تلواریں اس کے خون سے سیراب ہو رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کا جی خوش ہو گیا اور ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے نیک اور متقی فرزند کا انتقام ان کے ظالم اور بد بخت قاتل سے نہیں لے لیا؟ کیوں نہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان کا انتقام لے لیا اور وہ دونوں فریق اپنے رب کی طرف گئے۔ مگر ایک فریق جنت میں ہے اور دوسرا جہنم میں۔

حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ

حضرت زید بن سہل بخاری (ابو طلحہ) کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ رَمِيصَا بنتِ مِلْحَانَ (امُّ سَلِيم) بخاریہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد بیوہ ہو گئی ہیں تو وہ فرطِ مسرت سے اچھل پڑے۔ اور ان کی یہ خوشی کچھ زیادہ حیران کن بھی نہیں تھی کیونکہ ام سلیم ایک پاک دامن، سنجیدہ و باوقار، عاقلہ اور مجموعہ صفات خاتون تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اس بات کا ارادہ کر لیا کہ دوسرے خواہش مندوں سے پہلے ہی ان کو نکاح کا پیغام دے دیں۔ اور ان کو اس بات کا پورا اطمینان تھا کہ ام سلیم ان کے مقابلے میں کسی دوسرے کو ترجیح نہیں دے سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ مردانگی کا کامل نمونہ، معاشرے میں اونچے مقام کے مالک اور ایک دولت مند شخص تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے قبیلے — بنو بخار کے مشہور شہسوار اور یثرب کے معدودے چند اور نامور تیراندازوں میں سے تھے۔

یہ سب سوچ کر ابو طلحہ ام سلیم کے گھر کی طرف چل پڑے۔ لیکن راستے میں ان کو خیال آیا کہ ام سلیم مکہ سے آتے ہوئے داعی — مصعب بن عمیر — کی باتیں سن کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم، پر ایمان لاجکی اور ان کے دین کی پیروی اختیار کر چکی ہیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد انھوں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس میں کیا حرج ہے؟ کیا ان کا پہلا شوہر جس کا ابھی انتقال ہوا ہے،

اپنے آباء و اجداد کے دین پر کاربند اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اور ان کی دعوت سے بے تعلق نہیں تھا؟

ابو طلحہ نے ام سلیم کے دروازے پر دستک دی اور ام سلیم نے ان کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس وقت ان کا لڑکا انس بھی وہاں موجود تھا۔ ابو طلحہ نے بات چھپڑ دی اور حرف مدعا زبان پر لائے۔ لیکن اس وقت وہ سخت حیران ہوئے جب ام سلیم نے ان کی توقع کے خلاف جواب دیا۔

”ابو طلحہ! آپ جیسے شخص کی بات رو نہیں کی جاتی، لیکن جب تک آپ کفر پر قائم ہیں میں آپ سے نکاح نہیں کر سکتی؛“

ابو طلحہ نے سمجھا کہ ام سلیم بہانہ کر رہی ہیں۔ دراصل وہ کسی ایسے شخص کو میرے اوپر ترجیح دے چکی ہیں جو مال اور افرادی قوت کے لحاظ سے مجھ سے برتر ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا۔

”ام سلیم! خدا کی قسم میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے انکار کی اصل وجہ یہ نہیں ہے؛“

”پھر کیا ہے میرے انکار کی اصل وجہ؟“ ام سلیم نے پوچھا۔

”سونا چاندی اور مال و دولت؛“ ابو طلحہ نے جواب دیا۔

”سونا چاندی؟“ ام سلیم نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں“ ابو طلحہ نے کہا۔

”ابو طلحہ! میں آپ کو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ اگر آپ اسلام قبول کر لیں تو میں سونا چاندی اور مال و دولت کے بغیر آپ سے نکاح کر لوں گی اور آپ کے اسلام کو اپنا ہر قرار دوں گی۔“

ام سلیم کی یہ بات سن کر ابو طلحہ کا ذہن اپنے بت کی طرف منتقل ہو گیا

جس کو انھوں نے نہایت نفیس اور قیمتی لکڑی سے تراشا تھا اور قبیلے کے دوسرے رئیسوں کی طرح اسے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ لیکن ام سلیم نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے گرم لوہے پر مزید ضرب لگائی۔

”ابو طلحہ! کیا آپ کو یہ بات نہیں معلوم کہ خدا کو چھوڑ کر آپ جس معبود کی پرستش کرتے ہیں وہ زمین سے آگا ہوا ہے؟“

”کیوں نہیں، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔“ ابو طلحہ کے لہجے میں قدرے ندامت تھی۔

”تو کیا آپ کو کبھی اس بات پر شرمندگی کا احساس نہیں ہوتا کہ درخت کے ایک ٹکڑے کو معبود بنا کر آپ اس کی پوجا کرتے ہیں اور اسی درخت کے دوسرے ٹکڑے کو کوئی دوسرا شخص آگ جلاسنے کے لیے ایندھن کے طور پر استعمال کرتا اور اس سے کھانا پکاتا ہے؟“ انھوں نے ایک لمحہ رُک کر کہا۔

”ابو طلحہ! اگر آپ مسلمان ہو جائیں تو میں آپ کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے پر راضی ہوں اور اس صورت میں اسلام کے سوا میں آپ سے کسی ہجر کا مطالبہ نہیں کروں گی۔“ ام سلیم نے آخری اور بھرپور ضرب لگائی۔

”مجھے دائرۃ اسلام میں داخل کون کرے گا؟“ ابو طلحہ نے پوچھا۔

”یہ کام میں خود کروں گی،“ حضرت ام سلیم نے جواب دیا۔

”وہ کس طرح؟“ ابو طلحہ نے وضاحت چاہی۔

”وہ اس طرح کہ آپ اپنی زبان سے کلمہ حق ادا کرتے ہوئے اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ

کے رسول ہیں۔ پھر آپ اپنے گھر جائیں اور اپنے بت کو توڑ کر پھینک دیں۔“
حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر ان کا چہرہ فرط مسرت سے جگمگا اٹھا اور وہ بے ساختہ بول پڑے۔
”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ“ اور پھر انھوں نے
حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا۔ مسلمان اس نکاح کے متعلق
کہتے تھے کہ ”ہم نے آج تک کسی ہر کے بارے میں نہیں سنا جو ام سلیم
کے ہر سے زیادہ بہتر اور قیمتی ہو۔ انھوں نے اسلام کو اپنا ہر قرار دیا۔“

اور اس روز سے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اسلامی جماعت میں شامل
ہو گئے اور انھوں نے اپنی غیر معمولی اور بے مثال صلاحیتیں اس کی خدمت
کے لیے وقف کر دیں۔ وہ ان ستر افراد میں سے تھے جو بیعت عقبہ میں شریک
ہوئے۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کی بیوی حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ وہ
ان بارہ آدمیوں میں سے تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانان
یثرب کا نقیب بنایا تھا۔ وہ تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے ہم رکاب رہے اور ان میں غیر معمولی شجاعت و جواں مردی کا مظاہرہ
کرتے رہے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا اور ناقابل فراموش دن یوم اُحد ہے،
جس کی روداد نذرِ قازین ہے۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
بے انتہا محبت تھی۔ ایسی محبت جس کی جڑیں ان کے دل کی گہرائیوں میں
اُتری ہوئی تھیں۔ ایسی محبت جو ان کی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتی
تھی۔ ان کا حال یہ تھا کہ نہ آپ کے چہرہ انور کو دیکھنے سے کبھی آسودہ ہوتے
نہ آپ کی پیاری باتیں سننے سے سیراب ہوتے اور جب کبھی تنہائی میں آپ

کے پاس ہوتے تو گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہتے۔

”میری جان آپ پر قربان ہے، میرا چہرہ آپ کے لیے ڈھال ہے۔“
 جنگ اُحد میں جب ایک موقع پر مسلمان آپ کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے اور
 مشرکین نے ہر طرف سے آپ پر دھاوا بول دیا، آپ کے دانت توڑ دیے،
 پیشانی اور ہونٹوں کو زخمی کر دیا اور چہرہ مبارک کو لہولہاں کر دیا یہاں تک کہ
 دشمنوں نے یہ افواہ اڑادی کہ محمدؐ (نعموذا اللہ) قتل کر دیے گئے، جس سے مسلمانوں
 کے حوصلے بالکل پست ہو گئے اور وہ دشمنوں کے سامنے سے شکست کھا کر بھاگنے
 لگے۔ اس کٹھن وقت میں رسول اللہؐ کے ساتھ صرف چند آدمی رہ گئے تھے،
 اور حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ ان میں پیش پیش تھے۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ایک
 مضبوط اور غیر متزلزل پہاڑ کی طرح کھڑے ہو گئے، اور آپ نے کفار کے تیروں
 اور نیزوں سے بچنے کے لیے ان کی آڑ لے رکھی تھی۔ انہوں نے کمان کی تانت
 چڑھائی اور اس پر تیر جوڑ جوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دفاع
 کرتے ہوئے کفار پر تیروں کی بارش کر دی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 ان کے پیچھے سے جھانگ کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتے کہ ان کے تیر کہاں
 گر رہے ہیں تو وہ زخمی ہونے کے خوف سے یہ کہتے ہوئے آپ کو چھپاتا دیتے
 ”میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، ان کی طرف نہ جھانکیں، کہیں وہ
 آپ کو زخمی نہ کر دیں۔ میری گردن آپ پر نثار، میری جان آپ پر فدا، میں
 آپ کے آگے سینہ سپر ہوں!“

جس طرح حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ جنگ کے مواقع پر بے دریغ اپنی
 جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے حاضر رہتے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ

کمرانفاق فی میل اللہ کے ہر موقع پر اپنا مال خرچ کرنے میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیتے تھے۔ انھیں۔ واقع میں سے ایک موقع یہ ہے۔

ان کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ تھا جو اپنے درختوں کی کثرت پھلوں کی عمدگی اور پانی کی شیرینی کے لحاظ سے یثرب کے تمام باغوں سے اچھا تھا۔ ایک روز حضرت ابو طلحہؓ اس کے گھنے سائے میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک خوش الحان پرندے نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنی جس کے پر سبز، چونچ سرخ اور پاؤں رنگین تھے۔ وہ درختوں کی شاخوں پر خوشی سے چہمانا، رقص کرتا اور پھدکتا پھر رہا تھا۔ حضرت ابو طلحہؓ کو یہ منظر اتنا بھلا معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ اس کی دل کشی میں کھو گئے۔ جب ان کی توجہ نماز کی طرف واپس آئی تو وہ بھول چکے تھے کہ انھوں نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔ دو؟ تین؟ وہ سوچتے رہ گئے مگر کچھ یاد نہیں آیا۔

وہ نماز ختم کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے اپنے نفس کی شکایت کی جس کو باغ، اس کے گھنے اور سایہ دار درختوں اور اس کے خوش نوا پرندے نے نماز سے غافل کر دیا۔ پھر انھوں نے کہا۔

”اللہ کے رسولؐ! آپ گواہ رہیں، میں اس باغ کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر رہا ہوں۔ آپ اس کو جس مصرف میں چاہیں صرف کریں۔“

حضرت ابو طلحہؓ نے اپنی پوری زندگی صائم النہار اور مجاہد فی سبیل اللہ کی حیثیت سے گزاری اور اسی حالت میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقریباً تیس سال زندہ رہے۔ یہ پوری مدت انھوں نے روز کی حالت میں گزاری اور ایام عیدین کے سوا جن کے روزے حرام ہیں۔ انھوں نے کوئی روزہ نہیں چھوڑا۔

انہیں کافی طویل عمر ملی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن یہ ضعف بھی ان کے جذبہ جہاد کو سرد نہیں کر سکا۔ وہ بڑی پابندی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت دین کی فوجی مہمات میں شریک ہوتے تھے۔ انہیں میں سے ایک مہم وہ تھی کہ جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں مسلمانوں نے بحری جنگ کا ارادہ کیا تو انہوں نے بھی اس میں شرکت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ دیکھ کر ان کے لڑکوں نے کہا۔

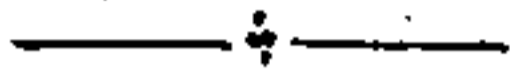
”ابا جان! اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ کافی جہاد کر چکے ہیں۔ اب آپ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ عمر جہاد کی نہیں ہے۔ اب آپ آرام کریں اور ہمیں چھوڑ دیں، ہم آپ کی طرف سے جہاد میں حصہ لیں گے۔“ مگر وہ نہیں مانے اور انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا..... ”نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل۔“ اس نے عمر کی تحدید کے بغیر نکلنے کا حکم دیا ہے، خواہ ہم بوڑھے ہوں یا جوان۔

اور جب حضرت ابوظلمہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی فوج کے ساتھ بحری جہاز میں سوار، سمندر کا سفر کر رہے تھے۔ سخت بیمار پڑے اور اسی بیماری میں اپنے رب سے جا ملے۔

انتقال کے بعد ان کو دفن کرنے کے لیے مسلمان کسی جزیرے کی تلاش میں تھے مگر سات روز سے پہلے ان کو اپنے اس مقصد میں کامیابی نہیں

ہوشی۔ اس دوران ان کی لاش کپڑے سے ڈھکی ہوئی ان کے درمیان رکھی رہی اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں واقع ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بڑے آرام سے سو رہے ہیں۔ اور ان کو ان کے اہل و عیال اور ملک و وطن سے بہت دور سمندر کے درمیان دفن کر دیا گیا۔



اُمّ المؤمنین حضرت رملہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا

یہ بات تو ابوسفیان بن حرب کے ماشیہ خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ قریش کا کوئی فرد اس کے کسی فیصلے سے بغاوت یا کسی اہم معاملے میں اس کی مخالفت کرنے کی جرأت کرے گا۔ کیوں کہ وہ مکے کا ایک ایسا سردار اور قریش کا ایسا لیڈر تھا جس کا ہر فیصلہ واجب التعمیل اور ہر حکم واجب الطاعت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کی اپنی ہی بیٹی رملہ نے جو اپنی کنیت ام حبیبہ سے معروف تھی۔ اس کے باطل معبودوں کی الوہیت سے انکار کر کے اس کے غبارے کی ساری ہوائیں نکال دی۔ نیز اس نے اور اس کے شوہر عبید اللہ بن جحش نے خدائے واحد پر ایمان اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کا اعلان کر کے اس کی چودھراہٹ کا سارا بھرم کھول کر رکھ دیا۔

ابوسفیان نے اپنی بیٹی اور داماد کو ان کے دین سے پھر کر اپنے اور اپنے آباء و اجداد کے دین میں واپس لانے کی انتہائی کوشش کی۔ اس کے لیے اس نے اپنا اڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر ڈالا مگر اس کی ساری ہیکڑی دھری کی دھری رہ گئی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ایمان جو رملہ کے دل میں راسخ ہو چکا تھا، اس کی جڑیں اتنی گہرائی میں اتر چکی تھیں کہ ابوسفیان کے غیظ و غضب کی آندھیاں اسے اکھاڑ تو کیا سکتیں۔

اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکیں۔

ابوسفیان کو رملہ کے مسلمان ہو جانے کا بڑا شدید قلق تھا۔ اور اپنی بیٹی کو اپنے منشار کے مطابق مجبور کرنے اور اس کو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر متبعین کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوششوں میں ناکامی کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس منہ سے قریش کا سامنا کرے۔

جب قریش نے یہ دیکھا کہ ابوسفیان، رملہ اور اس کے شوہر پر ناراض ہے تو وہ ان دونوں کے خلاف جری ہو گئے، وہ ان کو سخت اور اذیت ناک مزائیں دیتے اور ان کے گرد زندگی کا دائرہ روز بروز تنگ کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کے لیے مکے میں زندگی گزارنا دو بھر ہو گیا۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی تو رملہ بنت ابوسفیان، ان کا شوہر عبید اللہ بن محش اور ان کی پھوٹی بچی حبیبہ ہاجرین کے اس قافلے میں پیش پیش تھے جس نے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے نجاشی کی حمایت حاصل کی تھی۔

لیکن مسلمانوں کی اس مختصر سی جماعت کا ان کے ہاتھ سے بچ بچلنا اور حبشہ میں اس کا آرام و سکون سے رہنا ابوسفیان اور اس کے ہم خیال دوسرے زعماء قریش کو سخت ناگوار گزرا، اس لیے انھوں نے نجاشی کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے، ان کی واپسی کا مطالبہ کرنے اور اس کو یہ باور کرانے کے لیے کہ یہ لوگ عیسیٰ ابن مریم اور ان کی والدہ مریم کے متعلق نہایت ناپسندیدہ بات کہتے ہیں۔ اپنے سفیروں کو حبشہ بھیجا۔

نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور ان سے ان کے دین کی حقیقت اور اس بات کی اصلیت دریافت کی جو وہ عیسیٰ مسیح اور ان کی والدہ کے متعلق کہتے

ہیں۔ اُس نے مسلمانوں سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ وہ قرآن کے کچھ اجزاء سے سنائیں جو ان کے نبی کے قلب پر نازل ہوتا ہے۔ جب مسلمانوں نے اس کے سامنے اسلام کی حقیقت بیان کی اور قرآن کریم کی چند آیات اسے سنائیں تو وہ اتنا متاثر ہوا کہ روتے روتے اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر اس نے مسلمانوں سے کہا۔

”یہ کلام جو تمہارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور وہ جس کو عیسیٰ ابن مریم لائے تھے۔ دونوں ایک ہی نور کی شعاعیں ہیں“ اور پھر وہ خدائے واحد پر ایمان اور نبوت محمدیہ کی تصدیق کا اعلان کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اس موقع پر اس نے ان مسلمانوں کے لیے اپنی حمایت کا اعلان بھی کیا جو ہجرت کر کے اس کے ملک میں آتے تھے۔ اس معاملے میں اس نے اپنے سرداروں کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں کی جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے دین نصرانیت پر قائم رہے۔ اس کے بعد حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے سمجھا کہ طویل پریشانیوں کے بعد اب حالات ان کے لیے سازگار ہو گئے ہیں اور آلام و مصائب کے اس دشوار گزار سفر نے ان کو امن و امان کے گہوارے میں پہنچا دیا ہے مگر وہ حالات ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے جنہیں نوشتہ تقدیر نے ان کے لیے چھپا رکھا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو ایک ایسے مشکل امتحان میں ڈالنا چاہا جس میں بڑے بڑے ازباب عقل و دانش حیران و سرگشتہ ہو کر رہ جاتیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی چاہا کہ ان کو اس سخت ترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ نکال کر فوز و فلاح کی بلند ترین چوٹی پر پہنچا دے۔

پننانچہ ایک رات حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھا کہ ان کا شوہر عبید اللہ بن جحش ایک ایسے بحرِ موج کی سرکش موجوں میں پھنسا ہوا ان سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے جس پر تہ بہ تہ تاریکیاں مسلط ہیں اور وہ انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں گرفتار ہے۔

خوف اور اضطراب کی وجہ سے ان کی نیند کھل گئی۔ اس خواب کا ذکر وہ اپنے شوہر یا کسی دوسرے شخص سے کرنا نہیں چاہتی تھیں لیکن وہ خواب بہت جلد ایک حقیقت کی شکل میں ان کے سامنے آ گیا۔ اس منحوس رات کی صبح ابھی شام سے تبدیل نہیں ہونے پائی تھی کہ عبید اللہ بن جحش نے اپنے دین سے مزید ہو کر نصرانیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد اس کا زیادہ تر وقت شراب خانوں میں گزرنے لگا۔ اس کثرت کے ساتھ شراب نوشی کے باوجود وہ اس سے آسودہ نہیں ہوتا تھا۔ اس نے حضرت ام حبیبہؓ کو دوہیں سے ایک چیز کے انتخاب کی آزادی دے دی جو دونوں ہی انتہائی ناپسندیدہ تھیں یعنی یا تو وہ طلاق لے لیں یا نصرانیت اختیار کریں۔

حضرت ام حبیبہؓ نے خود کو اچانک تین مشکلات میں محصور پایا۔ یا تو وہ اپنے شوہر کی بات مان لیں۔ جو مسلسل انھیں نصرانیت کی دعوت دے رہا تھا۔ اور اس طرح (العیاذ باللہ) اپنے دین سے پھر جائیں اور دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی سے دوچار ہوں۔ اور یہ ایسا کام تھا جس کو وہ کسی قیمت پر نہیں کر سکتی تھیں چاہے اس کے نتیجے میں ان کے جسم کا گوشت پوست لوسے کی کنگھوں کے ذریعہ ان کی ہڈیوں سے کھرچ کر الگ کر دیا جاتا۔ یا وہ مکہ میں اپنے والد کے گھر واپس چلی جائیں اور وہاں ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں جس میں ان کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روک دیا گیا ہو۔ کیونکہ مکہ ابھی

تک کفر و شرک کا گڑھ تھا۔ یا پھر وہ تنہا اور بے یار و مددگار سر زمین حبشہ میں ٹھہری رہیں۔ انھوں نے اللہ عزوجل کی رضا کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہوئے تیسری اور آخری شکل کو ترجیح دی اور خدا سے تعالیٰ کی طرف سے آسانی و کشادگی کی امید پر حبشہ میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت ام حبیبہؓ نے اللہ تعالیٰ سے جس کشادگی کی توقع کی تھی اس کے لیے انھیں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ ان کے شوہر کی عدتِ دفا سے فارغ ہوتے ہی۔ جو ارتداد کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکا تھا۔ بالکل غیر متوقع طور پر ان کے پاس ان کی خوش نصیبی کا پیغام آ پہنچا۔

ایک روز چاشت کے وقت جب دن خوب روشن ہو چکا تھا اور سورج کی رو پہلی کرنوں نے زمین کو چاندی کا لباس پہنا دیا تھا۔ ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ جب انھوں نے دروازہ کھولا تو اچانک اپنے سامنے نجاشی کی خادمہ خاص ”ابرہہ“ کو دیکھ کر بہوت رہ گئیں۔ ابرہہ نے بڑے ادب اور خندہ چینی کے ساتھ سلام کر کے اندر آنے کی اجازت مانگی اور کہا۔

”بادشاہ سلامت آپ کو سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو نکاح کا پیغام بھیجا ہے اور ایک خط کے ذریعے ان کو اپنا وکیل بنایا ہے، تو آپ بھی اپنی طرف سے کسی کو وکیل مقرر کر دیجئے“

یہ سن کر حضرت ام حبیبہؓ خوشی سے پھوٹی نہ سمائیں اور بے ساختہ بول پڑیں۔

”بَشْرِكِ اللّٰهِ بِالْخَيْرِ.....“
 ”اللہ تم کو خوش رکھے۔ اللہ تم کو خوش خبری سنائے۔“

پھر اپنے جسم سے ایک ایک کر کے تمام زیورات اتارنے لگیں۔ انھوں نے اپنے کنگن اتار کر ابرہہ کو دے دیے۔ پھر پازیب، پھر دونوں کانوں کی بالیاں اور انگوٹھیاں اس کو دیدیں۔ اور اگر اس وقت ان کے پاس دنیا کے سارے خزانے ہوتے تو وہ سب ابرہہ کو بخش دیتیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ میں خالد بن سعید بن عاص کو اپنا وکیل بناتی ہوں کیونکہ وہ میرے قریب ترین رشتہ دار ہیں۔

نجاشی کا رہائشی محل درختوں سے گھرے ہوئے ایک بلند ٹیلے پر واقع تھا اور اس کے نشیب میں جیشہ کا سب سے خوب صورت باغ اس کے حسن کو دو بالا کر رہا تھا۔ اسی محل کے ایک وسیع و عریض ہال میں — جو نہایت خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ اور پتیل کے سنہرے چمکیلے چراغوں کی روشنی سے منور ہو رہا تھا، جن میں قیمتی اور نفیس فرش بچھا ہوا پتھار جیشہ میں مقیم صحابہ کرام، حضرت جعفر بن ابی طالب، حضرت خالد بن سعید بن عاص اور حضرت عبداللہ ابن حذافہ سہمی وغیرہم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منعقد ہونے والے ام حبیبہ بنت ابی سفیان کے نکاح میں شرکت کے لیے جمع تھے۔ جب سب لوگ آچکے تو نجاشی نے جو مجلس کے صدر نشین تھے — خطبہ دینے ہوئے کہا۔

”میں شکر ادا کرتا ہوں اُس خدائے بزرگ و برتر کا جو ہر قسم کے عیوب سے پاک، اپنے بندوں کو امن و اطمینان بخشنے والا اور لامحدود طاقت و قوت کا سرچشمہ ہے۔ اور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ خدائے وحدہ لا شریک کے سوا کوئی دوسرا بندگی اور عبادت کا حقدار نہیں ہے۔ اور اس بات کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں اور اس

بات کی کہ وہ آنحضرت کی ذات پاک ہے جس کی بشارت عیسیٰ ابن مریم نے دی تھی۔

ابا بعد! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ کو ان کے عقد میں دیدوں۔ سو میں آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں اور ان کی طرف سے ام حبیبہؓ کو چار سو طلائی دینار بطور ہجر ادا کرتا ہوں۔

اور انھوں نے دینار حضرت خالد بن سعیدؓ کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ اس کے بعد حضرت خالد بن سعیدؓ بن غاص کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنے جوابی خطبے میں فرمایا۔

”ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اسی سے اعانت طلب کرتا ہوں، اسی سے استغفار کرتا ہوں اور اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت اور حق دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دیں، خواہ یہ بات کفار کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔“

ابا بعد! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بجالاتا ہوں اور اپنی مولا ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ کو ان کے نکاح میں دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو ان کی بیوی میں برکت عطا فرمائے اور ام حبیبہ کو وہ خیر و برکت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مقدر میں لکھ دی تھی: ”

پھر جب حضرت خالد بن سعیدؓ دیناروں کو اٹھا کر کھڑے ہو گئے تاکہ

انھیں حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان کے یہاں پہنچادیں اور ان کے ساتھ ہی دوسرے صحابہ کرام بھی واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو نجاشی نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”آپ سب حضرات ابھی تشریف رکھیں۔ کیونکہ انبیاء کرام کی سنت یہ ہے کہ جب وہ نکاح کرتے ہیں تو کھانا کھلاتے ہیں۔“

پھر انھوں نے کھانا منگوایا۔ اور سب لوگ اس سے فارغ ہو کر اپنی قیام گاہوں کی طرف لوٹ گئے۔

حضرت ام حبیبہ کہتی ہیں۔

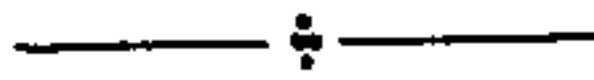
”جب ہر کی رقم میرے پاس پہنچی تو میں نے اس میں سے پچاس مثقال سونا ابرہہ کے یہاں بھیج دیا اور ساتھ ہی اس کو یہ بھی کہلا دیا کہ خوش خبری دیتے وقت میں نے تم کو جو کچھ دیا تھا وہ اس حال میں دیا تھا کہ میرے پاس اس وقت تم کو دینے کے لیے اور کچھ نہیں تھا..... تھوڑی دیر بعد ابرہہ میرے پاس آئی اور اس نے وہ سونا جو میں نے اس کے پاس بھیجا تھا، واپس کر دیا۔ پھر اس نے ایک ڈبہ نکالا جس میں میرے دیے ہوئے زیورات تھے۔ اس نے وہ سارے زیورات بھی یہ کہتے ہوئے مجھے لوٹا دیے کہ بادشاہ نے مجھے آپ سے کچھ لینے کو سختی سے منع کیا ہے۔ اور انھوں نے اپنی تمام بیگمات کو حکم دیا ہے کہ ان کے پاس جتنی خوشبو ہو، وہ سب آپ کے پاس بھیج دیں۔ اور اگلے روز ابرہہ میرے پاس زعفران، عود و عنبر لے کر آئی۔ پھر اس نے کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، میرے دریافت کرنے پر اس نے

۱۔ ایک مثقال = ۱۰۰۰ تولہ

بتایا کہ میں نے اسلام قبول کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ تو آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا سلام پہنچا دیجئے گا اور ان کو بتا دیجئے گا کہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا ہوں۔ اس کو بھولیے گا مت۔ پھر اس نے میری روانگی کا انتظام کیا۔ اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ کر دی گئی۔

جب میری ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تو میں نے نکاح کی پوری روداد آپ کو سنائی اور جو کچھ میں نے ابرہہ کے ساتھ کیا تھا، اس سے بھی آپ کو آگاہ کیا اور اس کا سلام بھی آپ کو پہنچا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی باتیں سن کر نہایت خوشی کا اظہار کیا اور اس کے سلام کے جواب میں فرمایا۔

وَعَلَيْهَا السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ



حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ

یہ کون شخص ہے جس نے غزوہ اُحد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہؓ ابن عبدالمطلب کو شہید کر کے آپ کے قلب مبارک کو زخمی کر دیا تھا؟ پھر جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کو واصل جہنم کر کے مسلمانوں کے دلوں پر خشک مرہم رکھا تھا؟ یہ ہیں حضرت وحشی ابن حرب حبشی رضی اللہ عنہ جن کی کنیت ابو دسمہ ہے۔

حضرت وحشیؓ کی داستان بڑی ہی سنگ دلانہ، غم انگیز اور خوں چسکا داستان ہے۔ آئیے ہم اس داستان کو انھیں کی زبانی سنیں۔ وہ بیان کرتے ہیں۔

”میں قریش کے ایک سردار جبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ جبیر کا چچا طعیمہ ابن عدی جنگ بدر میں حمزہ ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ جبیر کو اپنے چچا کے قتل ہونے کا بے انتہا صدمہ تھا اور اس نے لات و عزیٰ کی قسم کھائی تھی کہ اپنے چچا کے انتقام میں ان کے قاتل کو ضرور قتل کروں گا اور اس کے لیے وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ اور اس کے لیے اسے زیادہ عرصے تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیوں کہ قریش نے محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فیصلہ کن ضرب لگانے اور مقتولین بدر کا انتقام لینے کے لیے بہت جلد اُحد کی طرف کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے فوجی دستوں

کو منظم کرنے، اپنے حلیفوں کو جمع کرنے اور سامان جنگ کی فراہمی کے بعد اس فوج کی قیادت ابوسفیان ابن حرب کے سپرد کر دی۔ اور ابوسفیان نے ان عورتوں کی ایک ٹولی کو بھی فوج کے ساتھ شامل کر لیا جن کے باپ، بیٹے، بھائی یا دوسرے قریبی اعزہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے تاکہ وہ فوج کو جوش دلائیں اور اس کے لیے فرار کی راہیں مسدود کر دیں۔ ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ ان عورتوں میں سب سے پیش پیش تھی کیونکہ اس کا باپ، چچا، اور بھائی تینوں جنگ بدر میں مارے گئے تھے۔ جب فوج کی روانگی کا وقت قریب آیا تو جبیر بن مطعم نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ابو دسمہ! کیا تم اپنے آپ کو غلامی کی زنجیر سے آزاد کرانا چاہتے ہو؟“

”کیوں نہیں، لیکن میرے لیے اس کا ذمہ کون لے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تمہارے لیے اس کا ذمہ لیتا ہوں!“ اس نے جواب دیا۔

”وہ کس طرح؟“ میں نے پھر سوال کیا۔

اگر تم میرے چچا طعیمہ ابن عدی کے بدلے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا حمزہ ابن عبدالمطلب کو قتل کر دو تو تم آزاد ہو۔“ اس نے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور اس وعدے کی تکمیل کا ضامن کون ہو گا؟“ میں نے مزید

اطمینان چاہا۔

”جس کو تم چاہو، میں تمام لوگوں کو اس پر گواہ بنا سکتا ہوں!“ اس نے

اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

”میں یہ کام کر سکتا ہوں، میں یہ کام ضرور کروں گا۔“ میں نے

فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

حضرت وحشیؒ اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

”میں ایک حبشی شخص ہوں اور حربہ پھینکنے میں اتنا ماہر ہوں کہ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ میں اپنا حربہ لے کر فوج کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں فوج کے پچھلے حصے میں عورتوں کے قریب چل رہا تھا کیونکہ لڑائی سے مجھے کوئی دل چسپی یا رغبت نہیں تھی۔ جب بھی میرا گزر ہند بنت عتبہ کی طرف یا اس کا گزر میری طرف سے ہوتا اور وہ سورج کی روشنی میں چمکتے ہوئے حربے کو میرے ہاتھ میں دیکھتی تو کہتی۔

”ابو دسمہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اور اس کے چچا کو قتل کر کے ہمارے دلوں میں بھڑکتے ہوئے غیظ و غضب کے شعلوں کو ٹھنڈا کر دے۔“

اُحد پہنچ کر جب دونوں فوجوں میں ٹڈ بھڑ ہوئی اور گھمسان کارن پڑنے لگا تو میں حمزہ ابن عبدالمطلب کی تلاش میں نکلا۔ میں ان کو پہلے سے جانتا تھا، اور یوں بھی ان کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ کسی پر مخفی رہتی کیونکہ شجاعان عرب کے دستور کے مطابق امتیازی نشان کے طور پر وہ اپنے سر پر شتر مرغ کے پروں سے بنی ہوئی کلغی لگاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ وہ رجز پڑھتے، اپنی تلوار سے مخالفین کے پرچھے اڑاتے مضبوط خاکستری اونٹ کی طرح بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی ہیبت اور قوت کا یہ حال تھا کہ نہ کسی کے اندر اتنی ہمت تھی کہ ان کا سامنا کرتا نہ کسی میں یہ طاقت تھی کہ ان کے بالمقابل ثابِت قدم رہتا۔ میں ایک درخت یا چٹان کی اوٹ میں بیٹھا ان کے اوپر وار کرنے کی تیاری کر رہا تھا اور ان کے قریب آنے کا منتظر تھا۔ اتنے میں قریش کا ایک مشہور شہ سوار سباع بن عبد العزیٰ

آگے بڑھا اور اس نے حمزہ کو لٹکارتے ہوئے کہا۔

”حمزہ! ہمت ہو تو میرے سامنے آؤ۔“ اور حمزہ یہ کہتے ہوئے اس کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔

”ادھر آؤ، شکر کہ کے بچے، ادھر میری طرف آؤ،“ اور چشم زدن میں ان کی شمشیر خارا شگاف کی ایک کاری ضرب نے اس کے ٹکڑے اڑا دیے اور وہ زمین پر گر کے ان کے سامنے اپنے خون میں تر پنے لگا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ گھات سے باہر نکلا اور ایک مناسب جگہ پر کھڑے ہو کر اپنے حربے کو ہاتھ میں لیا، اسے تھوڑی سی حرکت دی اور صحیح نشانہ لے کر ان کی طرف پھینک دیا جو ان کی ناف کے نیچے لگا اور دونوں پیروں کے درمیان سے پار ہو گیا۔ زخم کھا کر وہ میری جانب بڑھے، بڑی مشکل سے دو قدم چلے لیکن زخم کی تاب نہ لا کر گر پڑے۔ حربہ ابھی ان کے جسم میں تھا۔ میں نے ان کو یوں ہی چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ جب مجھ کو ان کی موت کا یقین ہو گیا تو ان کے قریب گیا اور حربے کو ان کے جسم سے نکال کر واپس جا کر خیمے میں بیٹھ گیا کیونکہ میں اپنی آزادی کی قیمت چکانے کے لیے حمزہ کو قتل کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔

پھر جب معرکہ کارزار پوری طرح گرم ہو گیا اور طرفین کی طرف سے حملوں میں کافی تیزی آگئی تو تھوڑی دیر بعد جنگ کا پانسہ پلٹ گیا، مسلمانوں کی کشتی جنگ کے گرداب میں پھنس گئی اور ان کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ اس وقت ہند بنت عتبہ اور اس کے ساتھ کی دوسری قریشی عورتوں نے مسلمان مقتولین کی لاشوں پر پہنچ کر ان کا مثلہ کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے ان کے پیٹ چاک کر ڈالے، آنکھیں نکالیں اور ناک کان کاٹ لیے۔ پھر ان

کاٹے ہوئے اعضاء کو دھاگوں میں پروکران سے ہار اور بالیاں بنا لیں اور انھیں اپنے گلوں اور کانوں کی زینت بنا لیا۔ اور اپنے سونے کے زیورات نکال کر یہ کہتے ہوئے میرے حوالے کر دیے کہ

”ابو دسمہ! اب یہ تمہارے ہیں۔ ان کو حفاظت سے رکھنا یہ نہایت قیمتی ہیں“
جنگ ختم ہو جانے کے بعد میں فوج کے ساتھ مکے واپس لوٹ آیا اور جبیر ابن مطعم نے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے مجھے آزاد کر دیا۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین دن دوئی، رات چوگنی ترقی کرتا اور ان کے متبعین کی تعداد میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور جوں جوں ان کا معاملہ مستحکم اور مضبوط ہو رہا تھا۔ میری گھبراہٹ اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور حالات کا دائرہ میرے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں انھیں پریشان کن حالات میں گھرا رہا یہاں تک کہ وہ دقت بھی آگیا جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے لشکر جرار کے ساتھ فاتحانہ طور پر مکے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت میں پناہ کی تلاش میں طائف کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن طائف والے بھی زیادہ دیر تک ان کا مقابلہ نہیں کر سکے انھوں نے جلد ہی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اپنی اطاعت اور دین اسلام میں اپنے دخول کا اعلان کرنے کے لیے ایک وفد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس وقت میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور میری ندامت اور پشیمانی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اب زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود میرے لیے تنگ ہو چکی تھی۔ اور نجات کے تمام راستے میرے سامنے مسدود ہو کر رہ گئے تھے۔ میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ با میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ میں شام، یمن یا کسی ویر ملک میں چلا جاؤں۔ میں اسی ادھیڑ ٹہن میں مبتلا تھا کہ میرے ایک بہی خواہ

نے ترس کھاتے ہوتے مجھ سے کہا۔

”دشٹی! خدائے تعالیٰ تمہارے حال پر رحم کرے۔ خدا کی قسم، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے جو ان کا دین قبول کر کے کلمہ توحید و رسالت کا اقرار کر لیتا ہے۔“

اس کی یہ بات سنتے ہی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملنے کے ارادے سے یثرب کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر میں نے ان کا پتہ کیا۔ جب معلوم ہوا کہ وہ اس وقت مسجد میں ہیں تو میں چپکے سے مسجد میں داخل ہوا اور احتیاط سے چلتا ہوا ان کے سر پر جا پہنچا اور بلند آواز سے پکارا اٹھا۔ ”اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ“ — شہادتین کے الفاظ سن کر انہوں نے اپنی نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور مجھے پہچاننے کے بعد نظریں پھرتے ہوئے کہا۔

”کیا تم دشٹی ہو؟“

”ہاں، اے اللہ کے رسول!“ میں نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔

”اچھا، بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ تم نے حمزہ کو کس طرح قتل کیا تھا؟“ انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

حکم پا کر میں وہیں بیٹھ گیا اور شروع سے آخر تک حمزہ کے قتل کا واقعہ بیان کر دیا۔ جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو انہوں نے میری طرف سے اپنا چہرہ پھرتے ہوئے کہا۔

”دشٹی! اللہ تمہارا بھلا کرے، اپنا چہرہ مجھ سے پوشیدہ رکھنا۔ آج کے بعد سے میں تم کو دیکھنا نہیں چاہتا۔“

اور اس روز سے میں اس بات کی پوری احتیاط کرنے لگا کہ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میرے اوپر نہ پڑ سکے۔ چنانچہ جہاں تمام صحابہ کرام^{رض} آپ کے رُو برو بیٹھے تھے، میں اپنی نشست ہمیشہ آپ کے پیچھے رکھتا تھا۔ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان رہے، میں اسی طریقے پر کار بند رہا۔“

حضرت وحشی اپنے سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں۔
 میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اسلام تمام سابقہ گناہوں پر خط معافی کھینچ دیتا ہے مگر اس کے باوجود جس ناپسندیدہ فعل کا میں مرتکب ہو چکا تھا اور جس زبردست مصیبت سے میں اسلام اور اہل اسلام کو دو چار کر چکا تھا، اس کی قباحت کا شدید احساس مجھے شب و روز بے چین رکھتا اور میں ہر وقت کسی ایسے مناسب موقع کی تلاش میں رہتا، جس سے فائدہ اٹھا کر اپنی اس غلطی کی تلافی کر سکوں جس کا صدور مجھ سے ماضی میں ہو چکا تھا۔
 رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب مسلمانوں کی خلافت کی باگ ڈور آپ کے ساتھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی اور دوسرے مرتدین کے ساتھ ٹیپلہ کذاب کے حامیوں نے بھی ارتداد کی راہ اختیار کی اور خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹیپلہ سے جنگ کرنے اور اس کے قبیلہ — بنو ضیفہ — کو خدا کے دین کی طرف واپس لانے کے لیے ایک فوج تیار کی تو میں نے اپنے دل میں کہا۔

”وحشی! خدا کی قسم یہ تمہارے لیے تلافی مافات کا بہترین موقع ہے، اس سے فائدہ اٹھاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سنہرا موقع تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور تم کفِ افسوس ملتے رہ جاؤ۔“

میں نے اپنا وہی حربہ جس سے سید الشہداء حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ

کو قتل کیا تھا۔ ساتھ لیا اور شکر مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس وقت میں نے یہ بات اپنے دل میں ٹھکان لی تھی کہ یا تو اسی حربے سے مسیلمہ کذاب کو قتل کر دوں گا یا شہادت کی دولت سے سرفراز ہو جاؤں گا۔ چنانچہ جب مسلمان مجاہدین مسیلمہ کذاب اور اس کے لشکر کا تعاقب کرتے ہوئے حدیقہ الموت میں داخل ہو گئے اور وہاں دشمنانِ خدا سے فیصلہ کن اور گھمسان کی جنگ لڑنے لگے تو میں مسیلمہ کی تاک میں لگ گیا۔ آخر میری نظر اس پر جا پڑی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ میں تلوار لیے ایک جگہ کھڑا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ بالکل میری ہی طرح ایک انصاری نوجوان بھی اس کی گھات میں لگا ہوا ہے۔ ہم دونوں ہی اس کو قتل کرنا چاہتے تھے۔

میں نے ایک مناسب جگہ پر کھڑے ہو کر اس کو اپنی زد میں لیا اور اپنے حربے کو ہلا کر اس کی جانب پھینک دیا، جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگا۔ ٹھیک اسی لمحے میں جب میں نے اپنا حربہ مسیلمہ کی طرف اچھالا تھا، اس انصاری نوجوان نے بھی اس کے اوپر چھلانگ لگائی تھی اور تول کر تلوار کا ایک بھر پور ہاتھ مارا تھا۔ اب یہ بات ہدائے تعالیٰ ہی کے علم میں ہے کہ ہم دونوں میں سے کس نے اس کو قتل کیا۔ اگر اس کا قاتل میں ہوں تو پھر میں اس بات پر فخر کر سکتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہترین انسان کو قتل کرنے کے بعد سب سے بدترین شخص کو قتل کر کے میں نے اس کی تلافی کر دی ہے۔“

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ

کیا اس صحابی کی خبر آپ کو پہنچی ہے؟ تاریخ نے اپنے ریکارڈ میں یہ بات محفوظ کر لی ہے کہ یہ واحد شخص ہیں جن کی پیدائش خانہ کعبہ میں ہوئی تھی۔ ان کی ولادت کا قصہ مختصراً یہ ہے

ایک روز جب وہ کسی تیوہار کے موقع پر عوام کے لیے گھلا ہوا تھا، ان کی والدہ غم غلط کرنے اور جی بہلانے کے خیال سے اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ خانہ کعبہ میں داخل ہوئیں۔ اس وقت وہ حاملہ تھیں اور حمل کی مدت پوری ہو چکی تھی۔ خانہ کعبہ کے اندر ہی یکایک ان کو اس شدت کا دردِ زہ شروع ہو گیا کہ اس میں سے باہر نہ نکل سکیں۔ آخر کار ان کے لیے چمڑے کا ایک فرش لا کر بچھا دیا گیا جس پر انہوں نے اپنے بچے کو جنم دیا۔ اور وہ بچہ تھا حکیم ابن حزام جو ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد کا بھتیجہ تھا۔

حضرت حکیم بن حزام کی نشوونما ایک ایسے اعلیٰ اور شریف خاندان میں ہوئی تھی جو زبردست اثر و رسوخ اور غیر معمولی دولت و ثروت کا مالک تھا۔ اس کے علاوہ ذاتی طور پر بھی وہ نہایت عقلمند، شریف اور فاضل شخص تھے۔ انہیں خوبوں کی وجہ سے قبیلے والوں نے ان کو اپنا سردار منتخب کر لیا اور رقادہ کا اہم منصب ان کے حوالے کر دیا تھا۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت میں وہ اپنے ذاتی مال میں سے کافی رقم بیت اللہ کے ان حجاج پر خرچ کرتے تھے جو زادراہ

اور سواری سے محروم ہوتے۔

حضرت حکیم بن حزام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت پر فائز ہونے سے قبل آپ کے بڑے گہرے دوست تھے۔ اگرچہ عمر میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ سال بڑے تھے مگر اس کے باوجود انھیں آپ سے غیر معمولی انسیت اور محبت تھی۔ آپ کے ساتھ رہ کر اور آپ کی مجلس میں بیٹھ کر انھیں بے انتہا مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پھوپھی حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے شادی کر لی تو دوستی پر رشتہ داری کا اضافہ بھی ہو گیا جس نے ان دونوں کے تعلقات کو مزید مستحکم کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حکیم بن حزام کے ان گونا گوں اور ہمہ جہتی تعلقات کو جاننے کے بعد جن کی تفصیل میں نے آپ کے سامنے رکھی ہے، جب یہ بات آپ کے علم میں آئے گی کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر اس وقت مشرف بہ اسلام ہوئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو بیس سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی تھی تو آپ جو حیرت وہ جابیں گے، کیونکہ حکیم بن حزام جیسے آدمی سے جس کو اللہ تعالیٰ نے دانش مندی اور بالغ نظری سے نوازا ہو، جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قریبی رشتہ داری کی خصوصیت حاصل ہو، بجا طور پر اس بات کی توقع کی جاتی تھی کہ وہ رسول اللہ پر ایمان لانے والوں، ان کی دعوت کی تصدیق کرنے والوں اور ان کے طریقے کی پیروی کرنے والوں کی صف اول میں ہوں گے۔ لیکن بہر حال یہ اللہ کی مشیت تھی اور وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

اور جس طرح حضرت حکیم بن حزام کا اسلام میں پیچھے رہ جانا ہمارے لیے باعث تعجب ہے اسی طرح خود ان کے لیے بھی یہ بات انتہائی باعث حیرت

تھی۔ جب سے وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر لذتِ ایمان سے آشنا ہوئے تھے، اپنی زندگی کے ان لمحات پر مسلسل پچھتاتے اور ندامت کے آنسو بہاتے رہے جو شرک باللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب میں گزرے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ایک دن ان کے بیٹے نے ان کو روتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

”ابا جان! کیا چیز آپ کو رلا رہی ہے؟“

”بہت سی باتیں ہیں بیٹے! اور وہ سب مجھے رونے پر مجبور کر رہی ہیں۔“ انھوں نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”ان میں سے سب سے پہلی بات ہے اسلام میں میرا پچھڑ جانا جس کی وجہ سے بہت سے ایسے زریں مواقع میرے ہاتھ سے نکل گئے کہ اب اگر دنیا کی ساری دولت بھی خرچ کر دوں تو ان کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔ پھر یہ بات کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر اور اُحد سے مجھے نجات دی تو اس وقت میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی بھی موقع پر قریش کے ساتھ نہ کسی قسم کا کوئی تعاون کروں گا نہ مکے سے باہر نکلوں گا۔ مگر افسوس، قریش کی مدد کے لیے مجھے برابر گھسیٹا جاتا رہا۔ پھر یہ بات کہ جب بھی میں دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا، میری نگاہیں قریش کے ان اہم اور سردار اور وہ لوگوں کی طرف اٹھ جاتیں جو عمر میں مجھ سے بڑے اور قدر و منزلت میں مجھ سے فائق تر تھے۔ میں دیکھتا کہ وہ لوگ جاہلی دین اور اس کے طور طریقوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ اور اس وقت میں خود کو ان کی تقلید پر مجبور پاتا تھا۔ کاشن کہ میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ ہم کو تو بس ہمارے آباء و اجداد اور سرداروں کی اندھی تقلید ہی نے تباہی کے گڑھے میں گرایا ہے۔ تو میرے

بیٹے! بتاؤ کہ میں ان حالات میں کیوں نہ روؤں؟“

اور حکیم بن حزام کا اسلام کی راہ میں پیچھے رہ جانا جس طرح ہمارے اور خود ان کے لیے وجہ حیرت تھا، اسی طرح یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی حیران کن تھی کہ کوئی شخص جو حکیم بن حزام جیسی عقل و فہم سے آراستہ ہو، اسلام کی خوبیوں سے نابلد کیسے رہ گیا۔ آپ ان کے اور ان جیسے چند دوسرے لوگوں کے متعلق توقع رکھتے تھے کہ یہ لوگ اسلام قبول کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں گے۔ چنانچہ فتح مکہ سے ایک رات پہلے آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا۔

مکہ میں چار اشخاص ایسے ہیں جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ انہیں شرک سے دور اور اسلام سے قریب ہونا چاہیے تھا۔“ اور یہ پوچھنے پر کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا تھا۔

”وہ ہیں عتاب بن اسید، جُبیر بن مطعم، حکیم بن حزام اور سہیل بن عمرو“ اور خدا کے فضل سے یہ چاروں حضرات اسلام قبول کر کے اس کے دست و بازو بن گئے تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی عزت افزائی کے لیے اپنے منادی کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا۔

”جو شخص اس بات کی شہادت دے کہ خدائے وحدہ لا شریک کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ مامون ہے۔“

• جو شخص کعبہ کے پاس بیٹھ جائے اور اپنے ہتھیار اتار کر رکھ دے، وہ بھی مامون ہے۔“

• جو کوئی اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لے، وہ محفوظ ہے۔
• جو آدمی ابوسفیان بن حرب کے گھر میں داخل ہو جائے، اس کو

امان ہے۔

• اور جو آدمی حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہو جائے، اس کو بھی
امان ہے۔“

حکیم بن حزام کا مکان مکہ کے نشیبی حصے میں اور ابوسفیان کا مکان اس
کے بالائی حصے میں واقع تھا۔

حضرت حکیم بن حزام نے اسلام قبول کیا تو اس شان سے کہ وہ ان کے
دل و دماغ پر حاوی ہو گیا اور انہوں نے ایمان کو اپنایا تو اس انداز سے کہ وہ
ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور ان کے دل کی گہرائیوں میں جا گزیں
ہو گیا۔ اور انہوں نے اس بات کا عزم مصمم کر لیا کہ زمانہ جاہلیت میں جو موقف
بھی انہوں نے اپنائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں جو
اخراجات بھی انہوں نے کیے تھے، ان سب کی چند در چند تلافی کر کے
رہیں گے۔ اور واقعی انہوں نے اپنے اس عزم کو پورا کر کے دکھا دیا۔

• دارالندوہ — جس کی بڑی زبردست تاریخی اہمیت تھی، جس میں
جاہلیت کے زمانے میں قریش اپنی مشاورتی مجلسیں منعقد کرتے تھے اور جس
میں سرداران قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں کرنے
کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ ان کی ملکیت میں آیا تو انہوں نے چاہا کہ اس
سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ گویا وہ قابل نفرت اور گفناؤ نے ماضی کو طاقِ نسیاں
کے حوالے کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کو ایک لاکھ درہم میں فروخت کر دیا۔
اور جب ایک قریشی نوجوان نے ان سے کہا کہ چچا جان آپ نے قریش کی

قابلِ فخریادگار کو بیچ دیا تو انھوں نے اس کو جواب دیا۔

”بیٹے! تمہاری اس بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ فخر و مباہات کی ساری باتیں اب ختم ہو چکی ہیں۔ اب اگر کوئی چیز باقی رہ گئی ہے تو وہ تقویٰ ہے۔ میں نے اس کو صرف اس لیے فروخت کیا ہے کہ اس کی قیمت سے جنت میں ایک مکان خرید سکوں۔ تم سب لوگ گواہ رہنا کہ میں اس کی قیمت خدائے عزوجل کی راہ میں صدقہ کر رہا ہوں۔“

حضرت حکیم بن حزام اسلام لانے کے بعد جب پہلی بار سفر حج پر گئے تو ان کے ساتھ قربانی کی ایک سو اونٹنیاں تھیں جن کے اوپر قیمتی کپڑوں کی خوبصورت جھولیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور دوسرے حج میں وقوف عرفات کے موقع پر ان کے ساتھ ایک سو غلام تھے جن کی گردنوں میں چاندی کے پٹے پڑے تھے جن پر لکھا تھا عَتَقَاءُ لِلّٰہِ عَزَّوَجَلَّ عَنْ حَکِیْمِ بْنِ حَزَامٍ۔ اور میرے حج کے موقع پر قربانی کی ایک ہزار بکریاں لے گئے تھے۔ جنی ہاں، ایک ہزار بکریاں۔ اور منیٰ میں ان سب کی قربانی کر کے ان کا گوشت فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا تھا۔

غزوہ حنین کے موقع پر انھوں نے ایک دفعہ مالِ غنیمت میں سے مانگا تو آپ نے ان کو عنایت فرمایا۔ انھوں نے دو بارہ مانگا تو آپ نے پھر مرحمت فرمایا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک سو اونٹن دیکھے۔ اس وقت وہ اسلام میں نئے نئے داخل ہوتے تھے۔ پھر آپ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”حکیم! یہ مالِ نفس کے لیے بڑا پرکشش ہوتا ہے۔ جو شخص اسے قناعت کے ساتھ لیتا ہے اس کے لیے یہ بابرکت اور جو شخص حرص و طمع کے ساتھ لیتا

ہے، اس کے لیے نامبارک ثابت ہوتا ہے۔ اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے، حضرت حکیم بن حزام نے یہ بات سنی تو عرض کیا۔

”لے اللہ کے رسول! قسم ہے اس ہستی کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ آپ کے بعد نہ میں کسی سے کچھ مانگوں گا نہ زندگی بھر کسی سے کچھ لوں گا۔“

اور واقعی انہوں نے اپنی یہ قسم پوری کر دکھائی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو متعدد بار بلایا کہ اپنا وظیفہ بیت المال سے لے لیں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اور ان کے بعد جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو وہ بھی انہیں بلاتے رہے لیکن جب وہ کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہوئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر فرمایا۔

”مسلمانو! آپ سب لوگ اس بات کے گواہ رہیں کہ میں حکیم بن حزام کو بیت المال سے اپنا حصہ لینے کے لیے بلاتا ہوں مگر وہ اس سے انکار کرتے ہیں۔“

اور حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے پوری زندگی اس طرح گزار دی کہ انہوں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں لیا۔

حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ

”عباد بن بشر“ دعوتِ محمدیہ کی تاریخ میں ایک نہایت درخشاں اور تابندہ نام ہے۔ اگر آپ عبادت گزاروں کے درمیان تلاش کریں تو ان کو صاحبِ تقویٰ، پاکیزہ خصلت اور خدائے عزوجل کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر قرآن پڑھنے والا پائیں گے۔ اور اگر بہادروں اور شوراؤں میں ڈھونڈیں تو ان کو سرفروش، عامیٰ اسلام اور اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لیے معرکوں میں گھسنے والا دیکھیں گے۔ اور اگر گورنروں اور والیوں میں دیکھیں تو یہ مسلمانوں کے مال کے محافظ اور امین نظر آئیں گے۔ یہاں تک کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کے اور ان کے قبیلے کے دوسرے حضرات کے متعلق فرمایا تھا کہ بصرہ میں تین آدمی ایسے ہیں کہ فضل و شرف میں کوئی ان سے برتر نہیں ہے، تینوں کا تعلق بنی عبدالاشہل سے ہے۔ اور وہ ہیں سعد بن معاذ، اسیدِ خضیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہم۔

اس وقت جب اُتقِ یثرب پر آفتابِ اسلام کی شعاعیں ضو فگن ہوئی ہیں، حضرت عباد بن بشر کی نوجوانی اور عنقوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ ان کے رے سے عفت و طہارت کی تازگی و شادابی ہویا تھی اور ان کے رویے طریقِ کار سے پختہ عمر والوں کی سی سنجیدگی اور متانت نمایاں تھی، حالانکہ

اس وقت ان کی عمر بھی پچیس سال سے متجاوز نہیں تھی۔

جب نوجوان مکی داعی اسلام، حضرت مصعب بن عمیر سے ان کی ملاقات ہوئی تو ایمانی روابط، کریمانہ عادات و خصائل اور شریفانہ اخلاق و اطوار نے بہت جلد ان دونوں کے دلوں میں الفت و محبت اور یک جہتی و ہم آہنگی پیدا کر دی۔ اور جب انھوں نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اپنی بلند و پر خوش آواز اور دلکش و پرسوز لہجے میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے سنا تو کلام الہی کی محبت ان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں آتر گئی اور سویدائے قلب کی لامحدود وسعتوں پر چھا گئی۔ اور انھوں نے قرآن کریم کی تلاوت کو اپنا اور ٹھنکا بچھونا بنا لیا۔ رات ہو، دن ہو، سفر ہو، حضر ہو ہر وقت اور ہر جگہ اسے پڑھتے رہتے تھے، یہاں تک کہ صحابہ کرام کے درمیان وہ "امام" اور "صدیق قرآن" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ عائشہ صدیقہ رضیٰ عنہا میں جو مسجد نبوی سے متصل تھا۔ ہجرت میں مصروف تھے۔ آپ نے حضرت عباد بن بشر کی آواز سنی، جو اپنی نمناک اور لوح دار آواز میں قرآن کریم کی قرأت اس طرح کر رہے تھے جیسا جبریلؑ نے آپ کے قلب مبارک پر نازل کیا تھا۔ تو حضرت صدیقہؓ کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"عائشہ! یہ عباد بن بشر کی آواز ہے۔"

"ہاں، اے اللہ کے رسول! انھوں نے جواب دیا۔"

"اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ - خدایا! ان کی مغفرت فرما دے۔" آپ نے ان

کے لیے دعا فرمائی۔

حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ تمام غزوات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم نصاب رہے اور ہر ایک میں انھوں نے ایسے ایسے شاندار کارنامے

انجام دیے جو ایک حامل قرآن کے شایان شان تھے۔ انہیں میں سے ایک یہ ہے۔

غزوة ذات الرقاع سے فارغ ہونے کے بعد واپس لوٹتے ہوئے رات گزارنے کے لیے آپ نے مسلمانوں کے ساتھ ایک گھائی میں قیام فرمایا۔ اس غزوة کے دوران کسی مسلمان نے ایک مشرک عورت کو اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں گرفتار کر لیا تھا۔ واپس آ کر جب اس نے اپنی بیوی کو نہیں پایا تو لات و عزیٰ کی قسم کھاتے ہوئے کہا کہ میں محمدؐ اور ان کے اصحاب کا ضرور پیچھا کروں گا اور ان کا خون بہائے بغیر واپس نہیں لوٹوں گا۔

جب مسلمان اپنی سواریوں کو بٹھا کر ان کے کجاوے اتار چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”آج رات ہماری پاسبانی کون کرے گا؟“

”اے اللہ کے رسول! یہ خدمت ہم انجام دیں گے“ حضرت عباد بن بشر اور حضرت عمار بن یاسر نے کھڑے ہو کر کہا۔ ہاجرین جب مدینہ آئے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان مواخاة قائم کی تھی۔ جب یہ دونوں حضرات پہرہ پینے کے لیے گھائی کے دہانے پر پہنچے تو حضرت عباد بن بشر نے اپنے بھائی عمار بن یاسر سے پوچھا کہ آپ رات کے کس حصے میں آرام کرنا پسند کریں گے۔ نصف اول میں یا نصف آخر میں؟ تو حضرت عمار نے جواب دیا کہ میں نصف اول میں آرام کروں گا۔ اور یہ کہہ کر وہ ان کے قریب ہی لیٹ گئے۔

رات سنسان، پرسکون اور تاریک تھی۔ ہر طرف خاموشی کا پرہ تھا۔ آسمان پر ستارے اور زمین پر شجر و حجر سب اپنے رب کی تسبیح و تقدیس میں مشغول تھے۔

اس ستائے کے عالم میں حضرت عباد بن بشر کی طبیعت عبادت کی طرف مائل ہوئی اور ان کے دل میں تلاوتِ قرآن کا شوق پیدا ہوا۔ وہ قرآن کی شیرینی سے اُس وقت سب سے زیادہ لطف اندوز ہوتے تھے جب اُسے نماز میں تریل کے ساتھ پڑھ رہے ہوں۔ اس طرح وہ نماز اور تلاوت کے لطف کو یکجا کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ قبلہ رو ہو کر انھوں نے نماز کی نیت باندھ لی اور اپنی پرسوز، نمناک اور شیریں آواز میں سورۃ کہف کی تلاوت شروع کر دی۔

وہ اُس تابندہ نور خداوندی میں تیر رہے تھے اور سر سے پیر تک اس کی روشنی میں نہاتے ہوئے تھے۔ اسی دوران وہ بددینزی سے قدم اٹھاتا ہوا آہنچا۔ جب اُس نے دور ہی سے حضرت عباد بن بشرؓ کو گھائی ٹ کے دہانے میں کھڑا دیکھا تو سمجھ گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحابؓ گھائی ٹ کے اندر ہیں اور یہ ان کا پہریدار ہے۔ اُس نے اپنی کمان کی تانت چڑھائی، ترکش سے تیر نکالا اور چلے پر رکھ کر ان کی طرف چلا دیا جو ان کے جسم میں پیوست ہو گیا۔ حضرت عباد نے تیر کو اپنے بدن سے نکال کر پھینک دیا۔ اور اپنی تلاوت کے سلسلے کو اسی خوش و خروش کے ساتھ جاری رکھا اور نماز کے خستوع و خضوع میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ اُس آدمی نے دوسرا تیر مارا جو ان کے بدن میں تراوی ہو گیا۔ حضرت عباد نے پہلے کی طرح اس کو بھی نکال پھینکا۔ پھر اُس نے تیسرا تیر مارا، انھوں نے اس کو بھی اسی طرح نکال کر پھینک دیا جیسے پہلے دونوں کو نکالا تھا۔ اور وہ آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے اپنے ساتھی کے پاس پہنچے اور یہ کہتے ہوئے ان کو بیدار کیا۔

”اٹھیے، زخموں نے مجھے نڈھال کر دیا ہے۔“ جب اُس آدمی نے ایک کے بجائے دو آدمیوں کو دیکھا تو دھیرے سے کھسک گیا۔ حضرت عباد بن یاسر

کی توجہ ان کی طرف ہوئی تو ان کے تینوں زخموں سے تیزی کے ساتھ خون بہتا ہوا دیکھ کر بولے۔

”سبحان اللہ، آپ نے مجھے اسی وقت کیوں نہیں جگا دیا جب اُس نے پہلا تیر مارا تھا؟“

تو حضرت عباد بن بشرؓ نے جواب دیا۔ ”میں ایک سُورہ پڑھنے میں مصروف تھا اور اس کو اختتام تک پہنچانے بغیر درمیان میں منقطع کر دیتا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ خدا کی قسم اگر مجھے اس بارحہ کا اندیشہ نہ ہوتا کہ میں اُس پاسبانی کے مقصد کو ضائع کر دوں گا، جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیا تھا تو میں قرأت کے سلسلے کو منقطع نہ کرتا چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جاتی۔“

اور جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مرتدین کے خلاف جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا اور انھوں نے مسیلمہ کذاب کے فتنے کا سدباب کرنے، اس کے معاون و مددگار مرتدین کی قوت کو توڑنے اور انھیں دوبارہ دائرۂ اسلام میں واپس لانے کے لیے ایک زبردست فوراً تیار کی تو حضرت عباد بن بشرؓ اس کے ہراول میں شامل تھے۔ جنگ کے دوران، جس میں مسلمان ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں حاصل کر سکے تھے، حضرت عبادؓ نے دیکھا کہ ہاجرین و انصار، دونوں فریق جنگ کو ایک دوسرے پر ٹال رہے ہیں تو اس صورتِ حال نے ان کے سینے کو رنج و غم سے بھنر دیا۔ انھوں نے سنا کہ ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کو بزدلی اور کم ہمتی کے طعنے دے رہا ہے تو یہ باتیں ان کو سخت ناگوار گزریں اور ان کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ ان ہلاکت آفرین معرکوں میں مسلمانوں کی کامیابی کی اس کے سوا

دوسری کوئی شکل نہیں ہے کہ ہماجرین اور انصار دونوں فریق ایک دوسرے سے الگ ہو کر لڑیں تاکہ ہر گروہ اپنی ذمہ داری کا خود جواب دہ ہو اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں ڈٹ کر استقلال و پامردی کے ساتھ جہاد کا حق ادا کر رہے ہیں۔

آخری اور فیصلہ کن معرکے سے ایک رات پہلے حضرت عباد بن بشر نے ایک خواب دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ آسمان ان کے لیے شق ہو گیا۔ اور جب وہ اس میں داخل ہو گئے تو ان کے پیچھے اس کا دروازہ بند ہو گیا۔ صبح کو انھوں نے اس کا ذکر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے کیا اور پھر خود ہی کہا کہ ابوسعید! خدا کی قسم، یہ شہادت ہے۔

دن کو جب ازسرنو جنگ کا آغاز ہوا تو حضرت عباد بن بشر نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر با آواز بلند پکارنا شروع کیا۔

”اے گروہ انصار! تم دوسرے لوگوں سے الگ ہو جاؤ، تلواروں کی میانیں توڑ کر پھینک دو اور ہرگز اس بات کا موقع نہ دو کہ اسلام کو تمہاری جانب سے کوئی زک پہنچے۔“

اور وہ مسلسل یہ آواز لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے پاس تقریباً چار سو انصاری جاں باز جمع ہو گئے جن کے سربراہ حضرت ثابت بن قیس، حضرت براء بن مالک اور حضرت ابوذر جانہ صاحب سیف رسول اللہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔

حضرت عباد بن بشر اور ان کے یہ ساتھی اپنی تلواروں سے دشمن کی صفوں کو درہم برہم کرتے اور اپنے سینوں سے موت کو ان کی طرف دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ میلہ اور اس کے حامیوں کا زور ٹوٹ گیا اور وہ حدیقۃ الموت میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اور پھر وہیں، حدیقۃ الموت کی فصیلوں کے پاس حضرت عباد بن بشر شہید ہو کر گر پڑے اور اپنے خون میں نہا گئے۔ اس وقت ان کے بدن پر تلواروں، نیزوں اور تیروں کے اتنے زخم تھے کہ ان کو بڑی مشکل سے ان کی بعض علامتوں کی مدد سے پہچانا جاسکا۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

اس وقت ہم ہجرتِ نبویہ کے دوسرے سال میں ہیں۔ مدینۃ الرسول میں ہر طرف بڑی گہما گہمی ہے۔ مسلمان پورے زور و شور کے ساتھ جنگِ بدر کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ تیاریاں مکمل ہو جانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پہلے لشکر پر آخری نگاہیں ڈالتے ہیں جو رفتے زمین پر اللہ کے دین کو قائم کرنے اور ان کی زیرِ قیادت جہاد فی سبیل اللہ کے لیے حرکت میں آنے کو بالکل تیار کھڑا ہے۔ اور اسی موقع پر ایک کم سن بچہ جس کی عمر تیرہ سال سے بھی کم معلوم ہوتی ہے، جس کے چہرے پر زہانت و فطانت کا جو ہر نمایاں ہے اور جس کی پیشانی سے نجابت و حمیت کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ سامنے آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تلوار ہے جو لمبائی میں اس کے قد کے برابر یا اس سے کچھ نکلتی ہوئی ہے۔ وہ رسول اللہ کے قریب پہنچ کر کہتا ہے۔

”اے اللہ کے رسول! میں آپ پر قربان، مجھے اپنے ساتھ شریک ہونے اور اپنے جھنڈے تلے اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیے“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے اوپر منسرت آمیز نگاہ ڈالتے ہیں، تحسین آفریں انداز میں اس کے کندھے کو نرمی سے تھپتھپاتے ہوئے اس کی دل دہی نڑتے اور کم سنئی کے باعث اسے واپس کر دیتے ہیں۔

بچہ اپنی تلوار کو زمین پر گھسیٹتا ہوا تہایت رنجیدہ اور غم گین صورت بنائے
 واپس لوٹ گیا۔ اُسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ پہلے غزوہ میں رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت کے ثمرات سے محروم رہ گیا۔ اس کے پیچھے
 اس کی ماں نوار بنت مالک بھی واپس آگئی۔ اُسے بھی اپنے بچے کی محرومی کا
 غیر معمولی صدمہ تھا۔ اُسے اس بات کا بڑا ارمان تھا کہ وہ اپنے نختِ جگر کو
 لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کے جھنڈے کے نیچے جہاد کے لیے جاتا ہوا دیکھے۔
 اُسے پوری اُمید تھی کہ اس کا نور نظر بارگاہ رسالت میں وہ مقام بلند حاصل کر لینے
 میں کامیاب ہو جائے گا جو اس کا باپ اگر زندہ ہوتا تو حاصل کرتا۔

لیکن اس انصاری تو نہال نے جب یہ دیکھا کہ وہ اپنی کم عمری کی وجہ سے
 اس میدان میں رسول اللہ کا تقرب حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس
 نے اپنی ذہانت سے کام لے کر اپنے لیے ایک ایسے میدان کا انتخاب کر لیا جو اُسے
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرب بنا دے۔ جس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے
 عمر کی قید یا شرط نہ تھی۔ اور وہ میدان تھا علم اور حفظ کا میدان۔

جب اس نے اس نئے خیال کا ذکر اپنی ماں کے سامنے کیا تو وہ بہت
 خوش ہوئی اور اس کی حقیقت رسی پر باغ باغ ہو گئی۔ اُس نے اپنے قبیلے کے
 کچھ لوگوں سے بچے کی دل چسپی اور اس کی سوچ کا ذکر کیا تو وہ لوگ اس کو
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور آپ سے عرض کیا۔
 ”اے اللہ کے رسول! یہ ہمارا لڑکا زید بن ثابت ہے۔ اس کو کتاب اللہ
 کی سترہ سورتیں بالکل اسی طرح صحت کے ساتھ یاد ہیں جس طرح آپ کے قلب
 مبارک پر اتری ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لکھنے پڑھنے میں بھی کافی ہوشیار ہے۔
 ان چیزوں کے ذریعے یہ آپ کا قرب حاصل کرنا اور آپ کی خدمت میں رہنا

چاہتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس کے سن لیں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت سے اس کی حفظ کی ہوئی سورتوں میں سے کچھ سنیں۔ واقعی اس کی تلاوت نہایت خوبصورت اور ادائیگی بہت واضح تھی۔ اس کے ننھے ننھے ہونٹوں پر قرآن کریم کے الفاظ یوں جگمگا رہے تھے جیسے سطح آسمان پر ستارے جگمگاتے ہیں۔ پھر اس کی تلاوت کا انداز بتا رہا تھا کہ جو کچھ وہ تلاوت کر رہا ہے، اُس سے متاثر بھی ہو رہا ہے۔ اور مناسب مقامات پر اس کا وقف کرنا اس بات کی دلالت کر رہا تھا کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے اسے اچھی طرح سمجھ بھی رہا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس کے قبیلے والوں کے بیان سے بڑھ کر پایا تو آپ بہت خوش ہوئے۔ اور کتابت میں اس کی مہارت اور سختی آپ کے لیے مزید وجہ مسرت ثابت ہوئی۔

آپ نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا۔

”زید! تم میرے لیے یہودیوں کی کتابت (عبرانی) سیکھ لو، کیونکہ مجھے ان کے اُپر اعتماد نہیں ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ وہی لکھتے ہیں۔“

اور زید بن ثابتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں فوراً عبرانی سیکھنے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اور قلیل عرصے میں اس میں پوری مہارت پیدا کر لی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کو کچھ لکھوانا چاہتے یا ان کی طرف سے کوئی تحریر آتی تو حضرت زید بن ثابتؓ اس کو لکھنے یا پڑھنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سریانی زبان بھی سیکھ لی اور آپ کے ترجمان بن گئے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن ثابتؓ رضی اللہ عنہ کی دانائی

امانت داری، باریک بینی اور فہم و فراست سے پورے طور پر مطمئن ہو گئے تو آپ نے آسمانی پیغام کی امانت ان کے سپرد کرتے ہوئے ان کو کتابتِ وحی کے منصب پر فائز کر دیا۔ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ آپ کے قلبِ مبارک پر نازل ہوتا ان کو بلا کر لکھوا لیتے۔ اس طرح حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ وقتاً فوقتاً گھبراہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم قرآن حاصل کریں اور ان کی زبان مبارک سے تازہ بہ تازہ اس کے نازل ہونے والے ہر حصے کو اس کی شانِ نزول کے ساتھ اخذ کریں اور اس کی آیات کے ساتھ ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرتے رہیں اور ان کا نفس اس کی ہدایت کے انوار سے منور اور ان کی عقل اس کی شریعت کے اسرار سے روشن ہوتی چلی جائے۔

اور آخر کار یہ خوش قسمت نوجوان زید بن ثابت قرآن میں امتیازی خصوصیت کا حامل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرآنی علوم میں اُمتِ محمدیہ کا اولین مرجع بن گیا۔ چنانچہ وہ اس کمیٹی کا صدر تھا جس نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن کے جمع و ترتیب کا کارنامہ انجام دیا اور اس مجلس کا سربراہ تھا جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مصاحفِ قرآن کو یکجا کرنے کی ذمہ داری ادا کی تھی۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر قرآن کریم کا یہ خاص فضل ہی تھا کہ اُس نے ایسے ایسے پھیلے ہوئے مسائل میں اور نازک مواقع پر ان کے سامنے صحیح راہ واضح کر دی جن میں بڑے بڑے اربابِ عقل و فہم حیران و سرگرداں رہ جاتے تھے۔ چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے مسئلے پر مسلمانوں میں زبردست اختلافِ رائے پیدا ہو گیا،

جب ہماجرین نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت ہمارے درمیان رہے گی اور ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ بعض انصار نے کہا کہ "خلافت ہمارے درمیان رہے گی، ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ "خلافت ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک رہے گی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ تھا کہ جب بھی وہ تم میں سے کسی کو کسی ذمہ داری پر متعین کرتے تو ہم میں سے بھی کسی کو اس کے ساتھ لگا دیتے تھے" اور اس معاملے میں صورتِ حال اتنی سنگین ہو گئی تھی کہ قریب تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین سے قبل ہی مسلمانوں کے اندر زبردست فتنہ پیدا ہو جاتے۔ اس موقع پر ایک ایسے فیصلہ کن، برحق اور قرآنی ہدایت کے مطابق کلمے کی ضرورت تھی جو سر اٹھانے سے پہلے ہی اس فتنے کا قلع قمع کر دیتا۔ اور وہ کلمہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی زبان سے اُس وقت ادا ہوا جب انھوں نے اپنی قوم انصار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے گروہ انصار! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماجرین میں سے تھے اس لیے ان کا جانشین بھی انہیں کی طرح ہماجر ہونا چاہیے۔ اور ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے انصار تھے لہذا ہم ان کے بعد بھی حق بات میں ان کے جانشین کے انصار و اعوان رہیں گے۔"

پھر یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنا ہاتھ حضرت ابوبکر کی طرف بڑھا دیا۔
 "یہ ہیں تمہارے خلیفہ ان کی بیعت کر لو۔"

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قرآن کی فضیلت، اس پر تدبیر و تفقہ اور عرصہ دراز تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سے فیض یابی کے باعث تمام مسلمانوں کے لیے مشعل نور بنائے گئے تھے۔ خلفائے راشدین پچھدہ مسائل میں

ان سے مشورہ کرتے اور عام مسلمان اپنے مشکل معاملات میں ان سے فتویٰ پوچھتے تھے خصوصاً میراث میں تو سب لوگ انھیں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ کیونکہ اُس وقت مسلمانوں میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں تھا جو میراث کے مسائل کا ان سے بڑا عالم اور اس کی تقسیم کا ان سے زیادہ ماہر ہو۔ چنانچہ ایک بار حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جابریہ کے مقام پر مسلمانوں کے درمیان تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

”لوگو! جو شخص قرآن کے متعلق کچھ پوچھنا چاہے وہ زید بن ثابت کی طرف رجوع کرے، جس کو فقہ کے متعلق کچھ پوچھنا ہو وہ معاذ بن جبل کے پاس جائے اور جو مال چاہتا ہو وہ میرے پاس آئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا ذمہ دار اور تقسیم کنندہ بنایا ہے۔“

صحابہ کرام اور تابعین عظام میں سے وہ لوگ جو علم کے طلب گار اور اس کے جوہر تھے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ خوب اچھی طرح پہچانتے تھے۔ چنانچہ اُس علم کی وجہ سے جو ان کے سینے میں جاگزیں تھا، وہ لوگ ان سے غیر معمولی تعظیم و توقیر کے ساتھ پیش آتے تھے۔

وہ ہیں بحرِ علم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔ وہ دیکھتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، اپنے گھوڑے پر سوار ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آگے بڑھ کر وہ ان کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کی رکاب اور گھوڑے کی رکاب تھام لیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت زید بن عباس سے کہتے ہیں۔

”اے ابنِ عمر رسول اللہ! چھوڑ دیجئے،“ تو وہ جواب دیتے ہیں۔

”ہم کو اپنے علم کے ساتھ اسی طرح پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔“

تو حضرت زید بن عباس سے کہتے ہیں۔ ”ذرا اپنا ہاتھ تو مجھے دکھائیے۔“

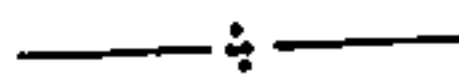
اور جب حضرت ابن عباسؓ اپنا ہاتھ نکالتے ہیں تو حضرت زیدؓ جھک کر یہ کہتے ہوئے اس کو چوم لیتے ہیں۔

”ہم کو اپنے نبیؐ کے اہل بیت کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے“ اور جب حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنے رب کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے تو مسلمان ان کی موت کی وجہ سے اس علم پر زار و قطار روئے جو ان کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس موقع پر کہا۔

”آج اس اُمت کا مُتَبَحِّرُ عالم انتقال کر گیا۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ابنِ عباسؓ کو ان کا جانشین بنا دے۔“

اور شاعرِ رسولؐ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ان کا اور اپنا ایک ساتھ مرثیہ کہتے ہوئے کہا۔

فَمَنْ لِّلْقَوَانِي بَعْدَ حَسَّانَ وَابْنِهِ
وَمَنْ لِّلْمَعَانِي بَعْدَ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ
نہ تو حسان اور اس کے بیٹے کے بعد
اشعار و قصائد کے لیے کوئی مرجع ہوگا،
نہ زید بن ثابت کے بعد قرآن کے معانی
و مطالب کے لیے کوئی مرجع رہ گیا ہے۔



حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ

حضرت ربیعہ ابن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔

اُس وقت — جب میری رُوح نورِ ایمان سے منور اور میری عقل معنیِ اسلام سے آشنا ہوئی تھی — میں ایک کم سن نوجوان تھا۔ جب پہلی بار میری آنکھیں دیدارِ رسولِ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ یاب پہنچیں تو آپ کی محبت میری رگ و پے میں سرایت کر گئی اور میرے پورے وجود پر جاوی ہو گئی۔ میں آپ کے اوپر اس طرح دل و جان سے فریفتہ ہو گیا کہ آپ کی محبت نے مجھے ہر چیز سے بے گانہ کر دیا۔ چنانچہ میں نے اپنے دل میں کہا۔

”ربیعہ! تمہارا بھلا ہوا، تم خود کو ہر کام سے فارغ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے وقف کیوں نہیں کر دیتے؟ ایسا کرو کہ اپنے آپ کو ان کی خدمت کے لیے پیش کر دو۔ اگر انھوں نے تمہاری خدمات کو قبول فرما لیا تو تم کو ان کی قربت و محبت کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کا موقع نصیب ہو جائے گا اور تم دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔“

پھر کسی تاخیر کے بغیر میں نے اس اُمید کے ساتھ خود کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیا کہ آپ مجھے اپنی خدمت کے لیے قبول فرمائیں گے۔ اور واقعی

آپ نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ بلکہ اپنی خدمت کا موقع دینے پر رضامند ہو گئے۔ اور اس روز سے میں سائے کی طرح آپ کے ساتھ رہنے لگا۔ میں ہر جگہ اور ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ آپ جب بھی اپنی نگاہوں سے میری طرف کوئی اشارہ فرماتے، میں فوراً تعمیل ارشاد کے لیے حاضر ہو جاتا۔ آپ نے جب بھی کسی چیز کی ضرورت محسوس کی، مجھے اس کی تکمیل میں کبھی کوتاہ یا سست نہیں پایا۔ میں دن بھر آپ کی خدمت میں لگا رہتا۔ جب دن ختم ہو جاتا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر اندرونِ خانہ تشریف لے جاتے تو میں بھی واپسی کا ارادہ کرتا۔ لیکن پھر میں اپنے دل میں سوچتا۔

”ربیعہ! کہاں جا رہے ہو؟ ممکن ہے رات میں کسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی حاجت پیش آجائے۔“

یہ سوچ کر میں وہیں آپ کے دروازے پر بیٹھ جاتا اور آپ کے گھر کی چوکھٹ چھوڑ کر کہیں جانا گوارا نہ کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راتیں کھڑے کھڑے نماز پڑھنے میں گزار دیتے تھے۔ بسا اوقات میں سنتا تھا کہ آپ سورہ فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ آپ اسے مسلسل اتنی دیر تک دہراتے رہتے کہ میں اکتا جاتا یا میرے اوپر نیند کا غلبہ ہو جاتا اور میں سو جاتا۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ آپ سمع اللہ لمن حمدہ کی تکرار سورہ فاتحہ سے بھی زیادہ دیر تک کرتے رہتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ کسی قسم کا احسان کر دیتا تو آپ اس سے بہتر طریقے سے اس کے احسان کا بدلہ چکا دیتے تھے۔ اپنی اسی عادت کے مطابق آپ میری خدمات کا صلہ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک روز مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”ربیعہ ابن کعب!“

”اے اللہ کے رسول! میں بسر و چشم حاضر خدمت ہوں“ میں نے عرض کیا۔
 ”مجھ سے کچھ مانگو، میں تمہاری مانگ پوری کروں گا۔“ رحمتِ مجسم نے
 فرمایا۔

میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”اللہ کے رسول! مجھے ہہلت دیجئے
 تاکہ میں سوچ لوں کہ مجھے آپ سے کیا مانگنا ہے پھر میں آپ کو بتا دوں گا۔“
 ”کوئی حرج نہیں، سوچ لو،“ آپ نے فرمایا۔

میں اس وقت ایک مفلس جوان تھا۔ نہ میرے پاس بیوی تھی نہ مال تھا نہ
 مکان۔ دوسرے غریب مسلمانوں کی طرح مسجد نبوی کا چوتراہی میرا مسکن و نادی
 تھا۔ لوگ ہمیں ”مہمانانِ اسلام“ کہہ کر پکارتے تھے۔ جب کوئی مسلمان
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صدقے کی کوئی چیز لاتا تو آپ وہ
 سب ہم لوگوں کے پاس بھیج دیتے۔ اور جب کوئی شخص آپ کی خدمت میں
 کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ اس میں سے کچھ اپنے پاس رکھ کر باقی ہم کو مرحمت
 فرما دیا کرتے تھے۔ اپنی اسی تنگ دستی اور پریشان حالی کی وجہ سے میرے دل
 نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیاوی ساز و سامان مانگ لوں تاکہ
 فقر و محتاجی سے نجات مل جائے اور دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی مال اور بیوی
 بچوں والا ہو جاؤں۔ لیکن میرے دل نے پھر کہا۔

”ربیعہ ابن کعب! تمہارا بڑا ہوا، یہ لایا تو زوال پذیر ہے، ایک دن
 فنا ہو جائے گی۔ اس میں جس رزق کی کفالت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے
 رکھی ہے، وہ لازماً تم کو ملے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب
 کے نزدیک ایسے بلند مرتبے پر فائز ہیں کہ آپ کی کوئی مانگ نامنظور نہیں کی جاسکتی
 اس لیے تم ان سے یہ درخواست کرو کہ وہ تمہارے لیے اخروی فائدے کی دعا فرمائیں!“

میں نے اس فیصلے پر اپنے دل میں نہایت اطمینان و استراحت کی کیفیت محسوس کی۔ پھر جب میں بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا۔

”ربیعہ! کیا کہتے ہو؟“

”اے اللہ کے رسول! میں جنت میں آپ کی رفاقت کا آرزو مند ہوں“

میں حرف آرزو زبان پر لایا ”آپ! اسی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں“

”تم کو یہ بات کس نے سبھائی؟“ آپ کا لہجہ تحسین آمیز تھا۔

”نہیں، خدا کی قسم یہ بات مجھے کسی اور نے نہیں بتائی ہے۔ بلکہ جس

وقت آپ نے فرمایا تھا کہ ”مجھ سے کچھ مانگو، میں تمہاری مانگ پوری کروں گا“

تو پہلے تو میرے جی میں آیا کہ میں آپ سے دنیاوی مال و متاع مانگ لوں پھر

من جانب اللہ مجھے دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کی نیک توفیق حاصل ہوگی اس

کے بعد میں نے آپ سے درخواست کی ہے کہ آپ میرے لیے جنت میں اپنی

رفاقت کی دعا فرمائیں“

پھر آپ نے ایک طویل خاموشی کے بعد فرمایا۔

”ربیعہ! کیا تم اس کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہتے؟“

”نہیں، اے اللہ کے رسول! جو چیز میں نے آپ سے مانگی ہے، دوسری

کسی چیز کو میں اس کے برابر نہیں سمجھتا“ میں نے عرض کیا۔

”تب کثرت سجد سے میری مدد کرو“ آپ نے میری درخواست منظور کرتے

ہوتے فرمایا۔

اس کے بعد میں پوری جاں نشانی کے ساتھ عبادت میں مصروف ہو گیا تاکہ

جس طرح دنیا میں آپ کی خدمت سے بہرہ ور ہوں اسی طرح آخرت میں بھی

آپ کی رفاقت سے محفوظ ہو سکوں۔ اس بات کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو بلا کر پوچھا۔

”ربیعہ! کیا تم شادی نہیں کرو گے؟“

”اے اللہ کے رسول! میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی چیز مجھے

آپ کی خدمت سے غافل کر دے۔ پھر میرے پاس بیوی کا ہر ادا کرنے اور اس کی ضروریات زندگی کی فراہمی کے لیے مال بھی تو نہیں ہے۔“ میں نے اپنی مجبوریاں آپ کے سامنے رکھ دیں لیکن آپ نے دوبارہ میری طرف دیکھے ہوئے فرمایا۔

”ربیعہ! کیا تم شادی نہیں کرو گے؟“

میں نے آپ کو پھر وہی جواب دیا جو پہلے دے چکا تھا۔ لیکن جب میں نے تنہائی میں اس پر غور کیا تو مجھے اپنے اس جواب پر سخت ندامت و پشیمانی ہوئی اور میں نے اپنے دل میں کہا۔

”ربیعہ! تمہارا بھلا ہو، خدا کی قسم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے دینی و دنیاوی مصالح کو تم سے زیادہ بہتر طریقے پر سمجھتے ہیں۔ اور تمہارے پاس جو کچھ ہے اس کو تم سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ بخدا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد کبھی شادی کی پیش کش کی تو میں اس کو ضرور قبول کروں گا۔“

اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد آپ نے مجھ سے پھر کہا۔

”ربیعہ! کیا تم شادی نہیں کرو گے؟“

”کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! لیکن میرے ساتھ کون شادی کرے گا جب کہ میں ایک تہی دست اور مفلس آدمی ہوں۔“

میرے اس جواب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
 ” فلاں کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 تمہیں حکم دیا ہے کہ اپنی فلاں لڑکی کا نکاح میرے ساتھ کر دو۔“

میں نے شرماتے ہوئے ان کے پاس جا کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 نے مجھے اس حکم کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ اپنی فلاں لڑکی کا
 نکاح میرے ساتھ کر دیں۔“

” فلاں لڑکی کے ساتھ؟“ انھوں نے پوچھا اور میرے مثبت جواب
 کے بعد انھوں نے کہا۔
 ” ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیغام کو خوش آمدید کہتے
 ہیں۔ بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد اپنے مقصد سے محروم واپس
 نہیں جائے گا۔“

اور پھر انھوں نے اپنی بیٹی کا نکاح میرے ساتھ کر دیا۔ اس کے بعد میں نے
 خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر بتایا کہ اے اللہ کے رسول! میں بہترین لوگوں کے
 پاس سے آیا ہوں۔ انھوں نے میری بات کی تصدیق کی، مجھے خوش آمدید کہا اور
 اپنی لڑکی کا عقد میرے ساتھ کر دیا۔ اب میں ان کو ہر کی رقم کہاں سے ادا کروں؟
 آپ نے بربیدہ ابن خصبہ کو جو میرے قبیلے، بنی اسلم کے ایک
 رئیس تھے۔ بلا کر فرمایا کہ ربیعہ کے لیے ایک نواۃ کے بقدر سونے کا انتظام
 کر دو۔ اور حسبِ حکم انھوں نے سونے کی مطلوبہ مقدار میرے لیے فراہم کر دی
 تو آپ نے اس کو میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کو لے کر ان کے
 پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ یہ تمہاری بیٹی کا ہر ہے۔ چنانچہ میں نے اسے لے
 جا کر ان کے حوالے کر دیا جس کو انھوں نے قبول کر لیا اور اپنی رضا مندی کا

اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کثیر طیب (کافی ہے اور عمدہ ہے)۔
 میں نے واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں نے ان سے زیادہ
 شریف لوگ نہیں دیکھے۔ میں نے جو کچھ ان کو دیا، قلیل ہونے کے باوجود نہ صرف
 یہ کہ انہوں نے برضا و رغبت اس کو قبول کر لیا بلکہ اظہارِ پسندیدگی کے طور پر یہ
 بھی کہا کہ کثیر طیب۔ اے اللہ کے رسول! اب مجھے ولیمہ کے لیے رقم کہاں
 سے ملے گی؟

آپ نے پھر بریدہ ابن حصیبؓ کو بلا کر کہا کہ ربیعہ کے لیے ایک مینڈھے کی
 قیمت اکٹھا کر دو۔ چنانچہ انہوں نے رقم فراہم کر کے میرے لیے ایک موٹا تازہ
 مینڈھا خرید دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ
 عائشہؓ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ جو جو ان کے پاس ہیں وہ تم کو دے دیں۔
 اور جب میں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا تو انہوں نے
 ایک ٹوکڑے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اُسے اٹھا لو۔ اُس میں سات صاع جو
 ہیں۔ خدا کی قسم ہمارے پاس اس کے علاوہ کھانے کی دوسری کوئی چیز نہیں ہے۔
 میں وہ مینڈھا اور جو اپنی بیوی کے گھر والوں کے پاس لے گیا۔ انہوں نے
 کہا کہ جو سے تو ہم روٹیاں تیار کر دیں گے البتہ مینڈھا تم واپس لے جاؤ اور
 اپنے ساتھیوں سے کہو کہ اس کا گوشت تیار کر دیں۔ میں مینڈھے کو لے آیا اور
 میں نے اور میرے قبیلے کے کچھ لوگوں نے مل کر اس کو ذبح کیا، اس کی کھاں
 اتاری اور اسے پکا کر تیار کر دیا۔ اس طرح ہمارے پاس ولیمہ کے لیے روٹی
 اور گوشت کا انتظام ہو گیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنے ولیمہ
 پر بلایا اور آپ نے میری دعوت قبول فرمائی۔

بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

کی زمین سے متصل مجھے ایک زمین بھی عنایت فرمادی۔ یوں مجھے دنیا بھی حاصل ہوگئی اور اس کی طلب بھی پیدا ہوگئی یہاں تک کہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھجور کے ایک درخت کے بارے میں اختلاف کر بیٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ میری زمین میں ہے اور ان کا کہنا تھا کہ میری زمین میں ہے۔ آخر کار ہم دونوں کے درمیان بات بڑھ گئی اور انھوں نے مجھے ایک ناگوار بات کہہ دی۔ نکلنے کو تو وہ بات اچانک ان کے منہ سے نکل گئی مگر فوراً ہی ان کو احساس ہو گیا۔ اور اس پر اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا کہ ربیعہ! جواب میں تم مجھ کو وہی جملہ کہہ کر اپنا بدلہ چکا لو۔ لیکن میں نے کہا کہ بخدا میں آپ سے بدلہ لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم مجھ سے بدلہ نہیں لو گے تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تمہاری شکایت بھر دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ بارگاہ رسالت کی طرف روانہ ہو گئے۔ پیچھے پیچھے میں بھی چلا۔ اور میرے قبیلے والے یہ کہتے ہوئے میرے ساتھ شامل ہو گئے کہ انھوں نے پہل بھی کی، تم کو برا بھلا بھی کہا پھر خود ہی تمہاری شکایت کرنے بھی جا رہے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

”ارے تم لوگوں کا برا ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ کون ہیں؟ یہ صدیق ہیں، مسلمانوں کی بزرگ ترین ہستی۔ تم لوگ واپس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تم لوگوں کو دیکھ لیں اور ان کی خفگی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خفا ہو جائیں اور ان دونوں کی ناراضی اللہ تعالیٰ کے غضب کا سبب بن جائے اور ربیعہ ہلاک ہو جائے۔“ تب جا کر وہ لوگ واپس ہوئے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رسالت میں پہنچ کر من و عن وہ واقعہ بیان کر دیا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف سُر اٹھا

کر پوچھا۔

”ربیعہ! تمہارا اور صدیق کا کیا معاملہ ہے؟“

میں نے عرض کیا۔ ”اے اللہ کے رسول! یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کو

وہی بات کہہ دوں جو انہوں نے مجھے کہی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔“

”ہاں، تم نے ٹھیک کیا۔ تم ان کو ہرگز وہ بات نہ کہنا جو انہوں نے تم

کو کہی تھی۔ بلکہ تم یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ ابو بکر کو معاف فرمائے۔“ آپ نے

میرے طرزِ عمل کو سراہا۔

تو میں نے کہا کہ ”ابو بکرؓ! اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔“

اُس کے بعد حضرت ابو بکرؓ یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے۔

”ربیعہ! اللہ تعالیٰ تم کو میری طرف سے بہترین جزا دے۔۔۔ ربیعہ!

اللہ تعالیٰ تم کو میری طرف سے بہترین۔۔۔“

اور اس وقت اُن کی آنکھوں سے بے ستا شا آنسو بہ رہے تھے۔“



حضرت ابوالعاص بن زبیع رضی اللہ عنہ

ابوالعاص بن زبیع قبیلہ قریش کی شاخ بنی عبد شمس کے چشم و چراغ تھے۔ وہ بھرپور جوانی کے حامل اور ایک شاندار و دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ دنیاوی مال و دولت اور خاندانی عز و شرف کے لحاظ سے بھی معاشرے میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ اپنی عظمت و خودداری اور مروت و وفاداری جیسی ذاتی خوبیوں اور اپنے آباؤ اجداد کے قابل فخر موروثی و خاندانی کارناموں کے باعث عربی خصوصیات کی حامل ایک مثالی شخصیت بن گئے تھے۔

ابوالعاص کو تجارت کا شوق قریش سے وراثت میں ملا تھا۔ جس کے تجارتی قافلے سال میں دو بار، سردیوں میں یمن اور گرمیوں میں شام کے چکر لگایا کرتے پڑتے۔ مکہ اور شام کے درمیان ان کے تجارتی کاروانوں کی آمد و رفت ہر وقت جاری رہتی تھی۔ ان کا ہر قافلہ ایک سو اونٹوں اور دو سو آدمیوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ ان کی کاروباری مہارت اور صداقت و دیانت کی وجہ سے قریش کے لوگ اپنے اموال تجارت بھی ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔

ان کی خالہ اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجہ محترمہ خدیجہ بنت خویلد ان کو وہی مقام دیتی تھیں جو ایک بیٹے کا اس کی ماں کے نزدیک ہوتا ہے۔ وہ ان کو اپنے دل کی پھنائیوں میں جگہ دیتیں اور ان کے دل کی طرح

ان کے گھر کی وسعتیں بھی خوشی اور محبت کے ساتھ ہر وقت ان کو خوش آمدید کہنے کو تیار رہتی تھیں۔ اور حدیجہ ہی کی طرح محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ابوالعاص کے ساتھ بے انتہا محبت رکھتے تھے۔

زمانے کے ماہ و سال محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اہل و عیال پر نہایت تیز رفتاری اور پھرتی کے ساتھ گزر گئے اور دیکھتے دیکھتے جب ان کی سب سے بڑی بیٹی زینب جوانی کی سرحد میں داخل ہو گئی، اور ایک خوشبودار اور خوش رنگ کلی کی طرح کھل گئی تو بڑے بڑے سرداران قریش کے بیٹوں کے دلوں میں اس کے ساتھ شادی کی تمنا سر اٹھانے لگی۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا، جب کہ وہ قریش کی بیٹیوں میں حسب و نسب کے اعتبار سے شریف ترین، والدین کے لحاظ سے معزز ترین اور ذاتی اخلاق و کردار کی رُو سے پاکیزہ ترین بیٹی تھی۔ لیکن ان کے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس کے خالہ زاد بھائی اور مکے کے سب سے بہترین نوجوان، ابوالعاص ابن زینع کے سامنے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔

ابوالعاص ابن زینع کے ساتھ زینب بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نکاح کو ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ مکے کی وادیاں نور خداوندی سے جگمگا اٹھیں اور اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت اور دین حق دے کر منصب نبوت پر فائز کرتے ہوئے حکم دیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤ۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں عورتوں میں سب سے پہلے ان کی بیوی حضرت حدیجہ بنت خویلد اور صاحب زادیاں، حضرت زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضوان اللہ علیہن ان کے اوپر ایمان لائیں۔ حالانکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔ البتہ ان کے داماد ابوالعاص نے اپنے آباء اجداد کے دین کو ترک کرنا پسند نہ کیا اور اپنی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ

بے پناہ محبت اور مخلصانہ تعلق کے باوجود ان کے دین کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔
جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کے درمیان نزاع کا فی
شدت اختیار کر گئی تو قریش نے آپس میں کہا۔

”تمہارا بڑا ہو، تم لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کے ساتھ اپنے
بیٹیوں کے نکاح کر کے ان کے غموں کو اپنے اوپر لا دیا ہے۔ اگر تم انھیں ان کے
پاس واپس بھیج دو تو ان کی توجہ تمہاری طرف سے ہٹ کر اپنی لڑکیوں کی طرف
مبذول ہو جائے گی۔“

انھوں نے اس رائے کو بہت پسند کیا اور ابوالعاص کے یہاں جا کر ان سے
کہا کہ تم اپنی بیوی کو چھوڑ دو اور اسے اس کے باپ کے گھر بھیج دو۔ ہم قریش کی
ہترین عورتوں میں سے جس سے چاہو گے تمہاری شادی کر دیں گے۔ مگر ابوالعاص
نے ان کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے کہا کہ خدا کی قسم میں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑوں گا
اور اس کے بدلے میں دنیا کی کسی عورت کو قبول نہیں کروں گا۔

البتہ آپ کی دو صاحب زادیوں — حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ
عنہما — کو طلاق دے کر آپ کے یہاں بھیج دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو ان کی واپسی سے خوشی ہوئی۔ آپ چاہتے تھے کہ کاش ابوالعاص بھی وہی کرتے
جو ان کے دونوں ساتھیوں نے کیا، لیکن آپ کے پاس اتنی قوت نہیں تھی کہ
وہ ان کو اس پر مجبور کر سکتے۔ اور ابھی مومنات کے ساتھ مشرکین کے نکاح
کی حرمت کا حکم بھی نہیں آیا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے اور وہاں
آپ کے قدم مضبوطی سے جم گئے اور قریش آپ سے بدر میں قتال کرنے کے لیے
نکلے تو ابوالعاص کو مجبور کیا گیا کہ وہ بھی ان کا ساتھ دیں، حالانکہ وہ اس جنگ

میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے کہ ان کو مسلمانوں سے لڑنے یا انھیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے سے نہ کوئی دل چسپی تھی نہ وہ اس کی کوئی خواہش رکھتے تھے۔ لیکن اپنی قوم کے اندر جو اونچا مقام ان کو حاصل تھا اس نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اس کا ساتھ دیں۔ اس جنگ کا خاتمہ قریش کی ایسی شکستِ فاش پر ہوا جس نے شرک کو قعرِ مذلت میں دھکیل دیا اور اس کے سرغٹوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ چنانچہ ان میں سے کچھ مارے گئے، کچھ گرفتار ہوئے اور کچھ نے بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں۔ حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص بن زینع اسیرانِ جنگ میں شامل تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کی رہائی کے لیے ان کے اوپر فدیہ عائد کیا۔ فدیے کی یہ رقم قیدیوں کے معاشرتی مقام و مرتبہ اور ان کی مالی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک ہزار سے چار ہزار درہم تک مقرر کی گئی تھی۔ اس کے بعد مکہ اور مدینہ کے درمیان صبح سے شام تک قاصدوں کی آمد و رفت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیے کی رقم لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی اپنے شوہر ابوالعاص کا فدیہ اپنے قاصد کے ذریعے بھیجا۔ اس میں انھوں نے وہ ہار بھی بھیجا تھا جو ان کی والدہ مرحومہ ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا نے ان کی رخصتی کے وقت دیا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہار کو دیکھا تو وفادارِ رفیقہ حیات کی یاد نے تڑپا دیا اور نختِ جگر کی مجبوریوں نے بے حال کر دیا۔ اور قلبِ مبارک رنج و ملال سے بھر گیا جس کے آثار صاف طور پر چہرے سے نمایاں تھے۔ اس موقع پر آپ نے صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا۔

”زینب نے یہ مال ابوالعاص کے فدیے کے واسطے بھیجا ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو اس کے اسیر کو رہا کر دو اور اس کا مال اُسے واپس کر دو“ اور صحابہؓ نے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے آگے تسلیم خم کر دیا۔ اور ابوالعاص کسی فدیہ کے بغیر رہا کر دیے گئے۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہائی سے پہلے ان کے اُدپر یہ شرط ضرور عائد کی کہ وہ بلا تاخیر ان کی بیٹی حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں گے۔

چنانچہ مکہ پہنچتے ہی ابوالعاص اپنے وعدے کی تکمیل میں لگ گئے۔ انھوں نے حضرت زینبؓ کو سفر کی تیاری کا حکم دیتے ہوئے بتایا کہ ان کے والد کے قاصد مکہ سے کچھ فاصلے پر ان کے منتظر ہیں۔ پھر انھوں نے ان کے لیے زادِ سفر اور سواری کا انتظام کرنے کے بعد اپنے بھائی عمرو بن زینع کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ حضرت زینبؓ کے ساتھ جائیں اور انھیں ان لوگوں کے سپرد کر دیں جو ان کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔

عمرو ابن زینع نے کمان اور ترکش کو کندھے پر ڈالا، حضرت زینبؓ کو ان کے محل میں بٹھایا اور ان کو لے کر دن دہاڑے قریش کی آنکھوں کے سامنے مکہ سے روانہ ہو گئے۔ اس پر ان لوگوں میں زبردست ہیجان برپا ہو گیا، ان کے تعاقب میں چل پڑے اور تھوڑی دُور جاتے جاتے ان کو پکڑ لیا اور حضرت زینبؓ کو بُری طرح خوف زدہ کیا۔ اس وقت عمرو نے کمان کے چلے کو چڑھایا اور ترکش سے تیروں کو نکال کر اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”خدا کی قسم جو شخص بھی ان کے قریب جانے کی کوشش کرے گا میں اس کے سینے میں تیر پیوست کر دوں گا۔“ وہ بڑے زبردست تیر انداز تھے، ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا تھا۔ اس وقت ابوسفیان بھی موقع پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے عمرو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بھتیجے! ٹھہرو، تیر نہ چلانا، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں“ اور جب وہ رک گئے تو ابوسفیان نے کہا۔

تم نے یہ اچھا نہیں کیا کہ زینب کو علی الاعلان سب کے سامنے لیے جا رہے ہو جب کہ عرب کے لوگ اس بھاری مصیبت سے واقف ہو چکے ہیں جو میدان بدر میں اس کے باپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہمارے اوپر نازل ہو چکی ہے۔ اب اگر تم اس کو اس طرح کھلے عام لے کر نکل جاؤ گے تو عرب قبائل ہم کو بزدلی، کمزوری اور بے غیرتی کا طعنہ دیں گے۔ اگر میری مانو تو اس وقت اس کو واپس لے جاؤ اور چند روز اس کے شوہر کے گھر رکھو جب لوگ آپس میں یہ بات کر چکیں کہ ”ہم نے اس کو واپس لوٹا دیا۔“ تو تم چپکے سے اس کو اس کے باپ کے پاس بھیج دینا کیونکہ ہمیں اس کو روکنے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔“

عمر نے ابوسفیان کی بات مان لی اور حضرت زینبؓ کو لے کر واپس مکہ چلے آئے۔ پھر چند روز کے بعد ایک رات ان کو مکے سے نکال کر لے گئے اور اپنے بھائی کی ہدایت کے مطابق ان کے والد کے قاصدوں کے سپرد کر دیا۔ یسوی سے جدائی کے بعد ابوالعاص ایک مدت تک مکے میں قیام پذیر رہے یہاں تک کہ فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے وہ ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں شام گئے۔ جب وہ اپنے قافلے کے ساتھ جس میں سامان تجارت سے لدے تھے ایک سو اونٹ اور ایک سوستر سے زیادہ آدمی تھے، مکہ واپس آتے ہوئے مدینہ کے قریب سے گزرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فوجی دستے نے حملہ کر کے اونٹوں پر قبضہ کر لیا اور آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ لیکن ابوالعاص ان کے ہاتھ سے بچ نکلے، وہ لوگ ان کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ جب رات نے ہر چیز کو اپنے سیاہ دامن میں چھپا لیا تو ابوالعاص نے مکہ کے بجائے مدینہ منورہ کا رخ کیا اور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر

ڈرتے ڈرتے اور خطرات کو ہر طرف سے بھانپتے ہوئے اس میں داخل ہو گئے اور سراغ لگاتے ہوئے حضرت زینب کے پاس پہنچے اور ان سے پناہ طلب کی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر کے لیے نکلے اور محراب میں کھڑے ہو کر تکبیر تحریمہ کہی اور ساتھ ہی تمام لوگوں نے بھی تکبیر کہہ کر نماز کی نیت باندھ لی تو عورتوں کی صف سے ایک آواز بلند ہوئی۔

”لوگو! میں زینب بنت محمد ہوں۔ میں نے ابوالعاص ابن ربیع کو پناہ دی ہے۔ لہذا آپ سب لوگ بھی ان کو پناہ دیں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے پوچھا جو کچھ میں نے سنا ہے کیا تم لوگوں نے بھی اسے سنا؟ تو لوگوں نے کہا کہ ”ہاں، اسے اللہ کے رسول! وہ آواز ہم نے بھی سنی ہے۔“ تو آپ نے فرمایا۔

”قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس سے متعلق مجھے پہلے سے کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ مسلمانوں کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر آپ گھر لوٹ گئے اور صاحب زادی سے فرمایا کہ ”بیٹی! ابوالعاص کی اچھی طرح خاطر تواضع کرنا مگر یہ جان لو کہ تم اس کے لیے حلال نہیں ہو۔“ پھر آپ نے اس دستے کے آدمیوں کو بلا کر، جس نے ابوالعاص کے سامان تجارت پر قبضہ کیا تھا اور ان کے آدمیوں کو گرفتار کیا تھا۔ فرمایا کہ ہمارے نزدیک اس شخص کا کیا مقام و مرتبہ ہے، اس کو تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔ تم نے اس کا جو مال لیا ہے اگر احسان کرتے ہوئے اسے واپس کر دو تو یہ میرے نزدیک نہایت پسندیدہ بات ہوگی۔ اور اگر تم اسے واپس نہ کرنا چاہو تو بہر حال وہ اللہ کا مال ہے جو اس نے غنیمت کے طور پر تم کو دیا ہے اور تم اس کے زیادہ مقدار ہو۔“ صحابہ کرام نے ایک زبان ہو کر کہا کہ

اے اللہ کے رسول! ہم ان کا مال ان کو واپس کر دیں گے۔ اور جب ابوالعاص اپنا مال لینے کے لیے ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا۔

”ابوالعاص! آپ قریش کے ایک معزز اور شریف فرد ہونے کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم اور ان کے داماد بھی ہیں۔ تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ مسلمان ہو جائیں اور ہم لوگ اس سارے مال سے آپ کے حق میں دست بردار ہو جائیں تاکہ آپ اہل مکہ کے ان اموال سے بھی استفادہ کریں اور یہیں مدینے میں رہ جائیں“

لیکن ابوالعاص نے ان کی اس پیشکش کو رد کرتے ہوئے کہا کہ ”بہت بری ہے یہ بات جس کی طرف تم لوگ مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اپنے نئے دین کی ابتدا غداری اور بے وفائی سے کروں۔“

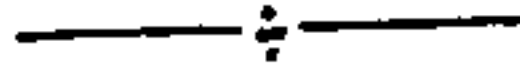
اس کے بعد ابوالعاص سارا مال لے کر مکہ چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے تمام حقداروں کے حقوق ادا کرنے کے بعد کہا کہ قریش کے لوگو! کیا تم میں سے کسی کا مال میرے ذمے باقی رہ گیا ہے جو ابھی تک اس کو نہیں ملا؟“

”نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے بہترین جزا دے۔ ہم نے آپ کو حق ادا کرنے والا اور شریف پایا۔“ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

”اچھا، تو جب میں تم سب لوگوں کے حقوق ادا کر چکا ہوں تو تم میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ خدا کی قسم اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ تم میرے اوپر اپنے مال کھا جانے کا الزام لگاؤ گے تو میں وہیں مدینے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مسلمان ہو گیا ہوتا۔ اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم سب لوگوں کے حقوق ادا کر دیے، میں اپنے اسلام کا اعلان کرتا ہوں۔“

اس کے بعد وہ مکہ سے روانہ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور ان کے پہلے نکاح کو باقی رکھتے ہوئے ان کی بیوی انھیں واپس لوٹا دی۔ اور آپ اکثر ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔

”حَدَّثَنِي نَصَدَقَتِي، وَعَدَرَنِي
فَوَفَّأَنِي“
”انھوں نے مجھ سے بات کی تو سچ بولے
اور وعدہ کیا تو اسے پورا کیا۔“



حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ

میدانِ اُحد میں محمد بن عبداللہ (فداہِ ابی و امی) سے مقابلے کے لیے قریش بہت بڑی جمیعت کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے۔ اس فوج میں جہاں ان کے بڑے بڑے سردار شامل تھے وہیں اس میں ان کے غلام بھی شریک تھے۔ اس وقت ان کے سینے بغض و کینہ سے بھرے ہوئے تھے۔ اور جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جانے والے اپنے مقتولین کے انتقام کی آگ ان کی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کر رہی تھی۔ اس مہم میں مردوں کے دوش بدوش قریش کے بڑے گھرانوں کی بہت سی شریف زادیاں اور معزز خواتین بھی شریک ہو گئی تھیں تاکہ وہ مردوں کو قتال پر براہِ بیخستگی کریں۔ بہادروں کے دلوں میں غیرت و حمیت اور عصبیت کی آگ بھڑکائیں اور اگر کہیں ان کے اندر کمزوری اور پست ہمتی دیکھیں تو ان کی ہمت بندھائیں اور انھیں میدانِ کارزار میں ثابت قدم رکھیں۔

فوج کے ہمراہ جانے والی ان خواتین میں ابوسفیان کی زوجہ ہند بنت عتبہ، عمرو بن عاص کی بیوی زینب بنت جحش اور سلافہ بنت سعد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سلافہ بنت سعد کے ساتھ اس کا شوہر طلحہ اور اس کے تینوں بیٹے مسافع، جلاس اور کلاب بھی تھے۔

کوہِ اُحد کے پاس جب دونوں فوجیں باہم متصادم ہوئیں اور جنگ کی آگ

بھڑک اٹھی تو ہند بنت عتبہ اور اس کے ساتھ کی عورتیں اٹھیں اور صفوں کے پیچھے جا کھڑی ہوئیں۔ وہ اپنے ہاتھوں میں دت تھامے انھیں بجا بجا کر گارہی تھیں۔
 اِنْ تَقْبِلُوا نَعَانِقُ - وَنَفْرِشُ التَّمَارِقُ
 اَوْ تَدْبُرُوا نَفَارِقُ - فِرَاقَ غَيْرِ وَامِقُ
 اگر تم دشمن سے جنگ کے لیے آگے بڑھو گے
 تو ہم تمہیں گلے لگائیں گی اور تمہارے لیے
 آرام دہ بستر بچھائیں گی۔ لیکن اگر تم نے
 پیٹھ پھیر لی تو ہم نفرت و حقارت کے ساتھ تمہیں چھوڑ دیں گی۔

ان کا یہ ترانہ قریشی بہادروں کے سینوں میں غیرت و حمیت کے شعلہ جوالہ کو ہوادے رہا تھا۔ اور ان کے شوہروں پر چاؤ کر رہا تھا۔

پھر جنگ کا ہنگامہ فرود ہوا اور اس میں قریش کو مسلمانوں پر فتح حاصل ہوئی تو قریشی عورتیں جو نشہِ فتح و کامرانی میں چور تھیں — اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ میدانِ جنگ میں زیر لب گنگنائی ہوئی مسلمان شہداء کی لاشوں کو بڑے انہماک کے ساتھ تلاش کرتی اور انھیں بڑی طرح مسخ کرتی پھر ہی تھیں۔ انھوں نے ان کے پیٹ چاک کر ڈالے، آنکھیں پھوڑ دیں، کان کاٹ لیے اور ناکیں تراش لیں۔ اور ان میں سے ایک عورت کی آتشِ غیظ و غضب اس کے بعد بھی سرد نہ ہوئی تو اس نے، ان کے ہونے اعضاء سے ہار اور پازیب بنا کر انھیں اپنے گلے اور پاؤں کی زینت بنا لیا۔ اور یہ سب کچھ اس نے اپنے باپ، بھائی اور چچا کے انتقام میں کیا جو جنگ بدر میں قتل کیے گئے تھے۔ مگر سلاۃ بنت سعد کی شان اس کے ساتھ کی ان خواتین سے بالکل مختلف تھی۔ وہ نہایت اضطراب و بے چینی کی کیفیت میں مبتلا تھی اور انتہائی بے قراری کے ساتھ اپنے شوہر یا تینوں لڑکوں میں سے کسی ایک کی آمد کی منتظر تھی تاکہ اس کے ذریعہ دوسروں کی خیریت معلوم کر سکے اور پھر وہ بھی دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر جشنِ فتح منائے۔ لیکن اس کے

انتظار کی یہ گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی واپس نہ آیا۔ آخر کار وہ میدان جنگ میں گھس گئی۔ وہ مقتولین کے چہروں کو بغور دیکھتی پھر رہی تھی، اچانک اس کی نگاہ اپنے شوہر کے جسد بے روح پر پڑی جو اپنے خون میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔ وہ کسی خوف زدہ شیرنی کی طرح پورے میدان میں تیزی سے ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ وہ اپنے بیٹوں، مسافح، کلاب اور جلاس کی تلاش میں ہر سمت اپنی نظریں دوڑاتی رہی اور آخر کار انھیں دیکھ ہی لیا۔ وہ کوہ احد کی تلی میں زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے مسافح اور کلاب تو اپنا سفر حیات ختم کر چکے تھے البتہ جلاس کو اس نے اس حال میں پایا کہ اس کی زندگی کی آخری سانس ابھی باقی تھیں، سلاذہ اپنے بیٹے کے اوپر جھک گئی جو سکرات موت سے نبرد آزما تھا۔ اس نے جلاس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے منہ اور پیشانی سے خون صاف کرنے لگی۔ اس غم انگیز منظر کی ہولناکی سے آنسو اس کی آنکھوں سے خشک ہو چکے تھے۔ وہ جلاس کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہوئی بولی۔

”میرے لال! کس نے تجھے پچھاڑا ہے؟“

جلاس خواب دینا چاہتا تھا لیکن عالم نزع کی خزاہٹ اس کے آرٹے آگئی اور وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ سلاذہ نے بار بار اور اصرار کے ساتھ پوچھا تو اس نے ہنسنے لگا اور کہا ”مجھے عاصم بن ثابت نے پچھاڑا ہے۔ اور.... اور میرے بھائی مسافح کو بھی۔ اور...“ اور جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی اس نے آخری ہنسی لی اور اس کا جسم بے جان ہو گیا۔ سلاذہ بنت سعد اس صورت حال کو دیکھ کر دیوانی ہو گئی۔ وہ باواز بلند چیخ چیخ کر رونے لگی اور اس نے لات و عزی کی قسم کھا کر کہا۔

”جب تک قریش اس کے لیے عاصم بن ثابت سے انتقام نہ لے لیں اور اس کو شراب پینے کے لیے عاصم کی کھوپڑی نہ دے دیں، نہ اس کی بے قراری کو قرار نصیب ہوگا، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو خشک ہوں گے۔ پھر اس نے نذر مانی کہ

”جو شخص عاصم بن ثابت کو زندہ گرفتار کر کے لائے گا یا قتل کر کے اس کا سر پیش کرے گا وہ اسے مالا مال کر دے گی۔“

اس کی یہ نذر قریش میں مشہور ہو گئی اور مکہ کے ہر حیا لے اور قسمت آزمانو جوان کے دل میں یہ آرزو کروٹیں لینے لگی کہ کاش وہ عاصم بن ثابت کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا یا اس کا سر سلاخ کے سامنے پیش کر کے اس کے اعلان کردہ انعام کا مستحق قرار پاتا۔

جنگ اُحد کے خاتمہ کے بعد مسلمان مدینہ واپس لوٹ آئے۔ وہ جنگ اور اس میں پیش آنے والے واقعات کا آپس میں ذکر کرتے، ان بہادروں کے لیے اظہار ہمدردی و غم گساری کرتے جو جنگ میں جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ اور ان لوگوں کے حق میں تعریفی کلمات کہتے جنہوں نے غیر معمولی جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کیا اور شمشیر زنی کے جوہر دکھائے۔ وہ خاص طور سے حضرت عاصم ابن ثابت رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرتے اور اس بات پر اظہار حیرت کرتے کہ ”ان کے لیے کس طرح یہ ممکن ہوا کہ انہوں نے ایک ہی گھر کے تین حقیقی بھائیوں کو خاک و خون میں لٹایا اور ان کے علاوہ بھی کسی ایک کو موت کے گھاٹ اتارا۔“

یہ سن کر انہیں میں سے کسی نے کہا:-

اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ کیا آپ لوگوں کو یہ بات یاد نہیں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر سے کچھ پہلے ہم لوگوں سے دریافت فرمایا تھا کہ ”تم لوگ قتال کس طرح کرو گے؟ تو اس وقت عاصم بن ثابت نے کہا ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا:

”جب دشمن ہم سے سوا ہاتھ کے فاصلے پر ہوگا تو ہم تیر اندازی سے کام لیں گے اور جب وہ قریب آجائیں گے اور ہمارے نیزوں کی پہنچ کے دائرے میں

ہوں گے تو نیزہ بازی ہوگی حتیٰ کہ نیزے ٹوٹ جائیں گے، اور جب نیزے ٹوٹ جائیں گے تو ہم انھیں پھینک کر اپنی تلواریں بے نیام کر لیں گے اور پھر شمشیر زنی کے ہاتھ دکھائیں گے۔“ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

”هَكَذَا الْحَرْبُ... مَنْ قَاتَلَ فِيهَا يَمُوتُ...“

یہ ہے جنگ کا صحیح طریقہ۔ جس کو قتال فلیقاتل کما یقاتل عاصم بن ثابت۔“ کرنا ہو وہ عاصم بن ثابت کی طرح قتال کرے۔

جنگ اُحد کے کچھ دنوں بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص مہم پر بھیجنے کے لیے چھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو طلب فرمایا اور حضرت عاصم بن ثابت کو ان کا امیر مقرر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں پاک نفس انسانوں کی یہ مختصر سی جماعت روانہ ہو گئی۔ وہ اپنے اس سفر کے دوران مکہ کے قریب ایک راستے سے گزر رہے تھے کہ قبیلہ بنو ہذیل کے کچھ لوگوں کو ان کی خبر ہو گئی۔ خبر ملتے ہی وہ تیزی کے ساتھ ان کی طرف دوڑ پڑے اور انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی تلواریں سونت لیں اور محاصرین سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بنو ہذیل نے کہا کہ ”تم لوگ ہم سے مقابلہ نہیں کر سکو گے اور نہ ہم سے لڑ کر اپنی جانیں ہی بچا سکو گے تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم اپنے ہتھیار رکھ دو۔ واللہ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، ہم اپنے اس عہد پر خدا کو گواہ بناتے ہیں۔“

صحاب رسول نے یہ سن کر ایک دوسرے کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا تب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”خدا کی قسم میں تو کسی مشرک کے عہد و پیمان پر اعتماد کر کے خود کو اس کے

حوالے نہیں کر سکتا پھر انہوں نے دل ہی دل میں سلفہ بنت سعد کی نذر کو یاد کیا اور یہ کہتے ہوئے تلوار سونت لی۔

”اللهم انى احسنى لدينك وادافع عنه فاحم لحى وعظمى ولا تنظر بى من اعداء الله....“

”خدا یا! میں تیرے دین کی حمایت میں کھڑا ہوں اور اس کی طرف سے مدافعت کر رہا ہوں۔ خدا یا! میرے گوشت اور

ہڈی کو دشمنان خدا سے محفوظ رکھنا اور ان پر کسی کو قابو نہ دینا۔“

پھر وہ بنو ہذیل پر ٹوٹ پڑے۔ اس حملے میں ان کے دو ساتھیوں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ لوگ دشمن سے برابر لڑتے رہے اور ایک ایک کر کے تینوں شہید ہو گئے۔ ان کے باقی ساتھیوں نے اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے کر دیا لیکن انہوں نے اپنے عہد و پیمان کو پورا نہ کیا اور ان کے ساتھ بدترین قسم کی غداری اور بد عہدی کے ساتھ پیش آئے۔

بنو ہذیل والوں کو پہلے یہ بات معلوم نہ تھی کہ ان کے ہاتھوں قتل ہونے والوں میں سے ایک عاصم بن ثابت بھی ہیں۔ بعد میں جب ان کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس کے بدلے وہ ایک بڑا انعام حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ سلفہ بنت سعد نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر وہ عاصم بن ثابت پر قابو پا جائے گی تو اس کے کاسہ سر میں شراب پیے گی اور اس نے عاصم کو زندہ یا مردہ کسی حالت میں اپنے سامنے پیش کرنے والے کو منہ مانگا انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔

حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چند گھنٹوں کے اندر اندر قریش کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ کیونکہ ہذیل کا قبیلہ مکہ کے قریب ہی آباد تھا۔ یہ خبر ملتے ہی سرداران قریش نے قاتلین عاصم کے پاس ان کا سر لانے

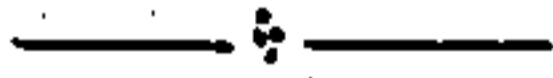
کے لیے ایک قاصد بھیجا تاکہ سلاذ بنت سعد کی آتش انتقام کو فرو کر سکیں اس کی نذر پوری کر سکیں اور اس کے تینوں بیٹوں کا غم کچھ ہلکا کر سکیں جن کو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا، انھوں نے چلتے ہوئے قاصد کو ایک بڑی رقم دیتے ہوئے اسے اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ بے دریغ مال خرچ کر کے ہر قیمت پر بنو ہذیل سے عاصم بن ثابت کا سر حاصل کر لے۔

بنو ہذیل جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کا سر جسم سے جدا کرنے کے لیے ان کی لاش کے پاس پہنچے تو یکایک وہ شہد کی مکھیوں اور بھڑوں کے ایک جھنڈ کا سامنا کر رہے تھے جو ہر طرف سے اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔ یہ لوگ جب بھی لاش کے قریب آنے کی کوشش کرتے وہ مکھیاں اور بھڑیں اڑ کر ان کے چہروں، آنکھوں اور جسم کے مختلف حصوں پر ڈنک مارتیں اور انھیں وہاں سے دور بھاگ جانے پر مجبور کر دیتیں۔ کئی بار کی پیہم کوشش کے باوجود جب وہ لوگ اس لاش کے قریب پہنچنے سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے آپس میں کہا کہ فی الحال اسے یونہی چھوڑ دو اور رات کا اندھیرا پھیل جانے دو۔ رات کی تاریکی میں یہ بھڑیں خود ہی اس کو چھوڑ کر چلی جائیں۔ اور اس وقت ہم باسانی اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔ چنانچہ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھ کر شب کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

دن ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور رات کی آمد میں ابھی دیر تھی کہ دیکھتے دیکھتے آسمان پر گھنگھور گھٹاؤں کی دبیز چادر تن گئی، فضا گہری تاریکی میں ڈوب گئی اور ماحول بجلی کی زور دار اور پیہم گرج سے لرزنے لگا۔ اور پھر موسلا دھار بارش کا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہو گیا جیسے آسمان کے بند ٹوٹ گئے ہوں، نالوں میں پانی تیزی کے ساتھ بہنے لگا، وادیاں اور گھاٹیاں سب جل تھل

ہو گئیں اور پانی کا ریل اسکیل عزم کی طرح زمین پر پڑی ہوئی ہر چیز کو اپنے ساتھ
بہائے لیے چلا گیا۔

صبح کو بنو ہذیل حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی لاش کو ہر طرف ڈھونڈتے
پھر رہے تھے مگر انھیں اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ سیلاب کی موجیں اسے
دور بہت دور نہ جانے کہاں بہا کر لے گئیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت
عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کی دعا کو مشرف قبولیت سے نوازا اور ان کے جسد
اطہر کو مسخ ہونے سے بچالیا اور ان کے سر مبارک کو اس بات سے محفوظ رکھا کہ
ان کی کھوپڑی میں شراب پی جائے، اور اس نے مشرکوں کو مسلمانوں پر غالب
آنے کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔



حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا

یہ کون انتہائی صائب الرائے، سنجیدہ و باوقار اور معزز خاتون ہیں جو ہزاروں مردوں پر بھاری ہیں؟ یہ کون شیردل صحابیہ ہیں جنہوں نے اسلام میں سب سے پہلے کسی مشرک کو قتل کیا؟ یہ کون دوراندریش خاتون ہیں جن کے ہاتھوں اسن اولین شہسوار کی نشوونما ہوئی جس نے اللہ کی راہ میں اپنی تلوار کو بے نیام کیا؟ یہ ہیارسول اللہ ص کی پھوپھی، حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا۔

مجدوشرف نے ہر طرف سے ان کا احاطہ کر رکھا تھا۔ ان کے والد تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد محترم، قریش کے لیڈر اور اس کے ہر دل عزیز سردار عبدالمطلب بن ہاشم، ان کی والدہ تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ام ہالہ بنت وہب اور ان کے پہلے شوہر تھے ابوسفیان بن حرب کے بھائی، حارث بن حرب، جن کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے دوسرے شوہر تھے دور جاہلیت میں رب خواتین کی سردار اور پہلی ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد کے بھائی عوام بن خویلد اور ان کے بیٹے تھے خواری رسول، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ۔ اس کے بعد شرف ایمان کے علاوہ مجدوشرف کا اور کون سا درجہ باقی رہ جاتا ہے جس کے حصول کی تمنا کسی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔

ان کے شوہر عوام بن خویلد کی وفات کے وقت ان کے صاحب زادے

”زبیر“ ایک کم سن بچے تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد زبیر کی پرورش و پرداخت کی ساری ذمہ داری ان کی ماں حضرت صفیہؓ کے اوپر آن پڑی۔ اور انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت میں ان خطوط کو اپنے سامنے رکھا جن پر آگے چل کر ان کے اندر سخت کوشی، ہفاکشی اور شہ زوری و شہسواری کی صلاحیتوں کا ارتقا ہو۔ چنانچہ دوسرے بچکانہ کھیلوں کے بجائے وہ ان کو تیر اندازی اور کمانوں کی مرمت کا کھیل کھلایا کرتی تھیں۔ وہ ان کی تربیت کے معاملے میں اپنا رویہ نہایت سخت رکھتیں اور اس سلسلے میں کسی قسم کی نرمی کو راہ دینے کی روادار نہ تھیں۔ وہ برابر ان کو خوف ناک اور پرخطر جگہوں میں داخل کرتیں اور جب ان کے اندر کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھجک محسوس کرتیں تو بڑی سخت مار مارتی تھیں یہاں تک کہ ایک دفعہ زبیر کے ایک چچانے اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے حضرت صفیہؓ سے کہا کہ بچوں کو اس طرح بے دردی کے ساتھ نہیں مارا جاتا۔ تم تو بچے کو اس طرح مارتی ہو جس سے ماں کی ممتا اور پیار کے بجائے غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے اس احتجاج کو رد کرتے ہوئے کہا۔

مَنْ قَالَ قَدْ اَعْضَبْتُهُ فَقَدْ
كَذَبَ وَرَأْسًا اَضْرِبُهُ لِكَيْ يَلْبِثَ
وَيَمُتَّزِمَ الْجَيْشَ وَ يَارْتِي
بِالسَّلْبِ

جس نے کہا کہ میں اس کے اوپر اپنے غصے
کا اظہار کرتی ہوں، اس نے غلط کہا۔ میں
تو اس کو صرف اس لیے مارتی ہوں کہ یہ
چالاک اور ہوشیار ہو جائے۔ اور لشکر کو

شکست دے کر ماں غنیمت کے ساتھ واپس آتے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دین حق و ہدایت دے کر مبعوث فرمایا، ان کو لوگوں کے لیے بشر و نذیر بنا کر بھیجا اور ان کو اپنے اعزہ و اقربا سے اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز کرنے کا حکم دیا تو آپ نے نبی عبدالمطلب کے

سارے مردوں، عورتوں، بڑوں اور چھوٹوں کو جمع کر کے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

”یا فاطمۃ بنت محمدؐ، یا صفیۃ بنت عبدالمطلب، یا بنی عبدالمطلب! میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تمہارے کسی کام میں کوئی نقص نہ آئے۔“

پھر آپ نے ان کو ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کی دعوت دی تو کچھ لوگوں نے اس نورِ خداوندی کو قبول کر لیا اور کچھ لوگوں نے اس سے اعراض کیا حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا تصدیق کرنے والے اہل ایمان کے پہلے گروہ میں شامل تھیں۔ اور اس وقت انہوں نے مجددِ شرف کو ہر طرف سے سمیٹ لیا۔ ان کو نبی شرافت کے ساتھ اسلام کا اعزاز بھی حاصل ہو گیا۔

حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا اور ان کے نوجوان صاحبزادے حضرت زبیر بن عوام نہکت و نور کے اس قافلے میں شریک ہو گئے اور ان تمام شدائد و مصائب کا سامنا کیا جو کفار قریش کے ہاتھوں السابقون الاولون کو برداشت کرنے پڑے تھے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو ہجرت مدینہ کی اجازت دی تو دودمان ہاشم کی اس معزز خاتون نے مکہ کی اپنی تمام خوبصورت یادوں اور خاندانی و موروثی شرافتوں اور قابلِ فخر یادگاروں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور خدا و رسول کے لیے ہجرت کی نیت سے صرف اپنے دین کو لے کر مدینہ کی جانب روانہ ہو گئیں۔

اس وقت حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے جہاد کے مختلف میدانوں میں ایسے ایسے عظیم الشان

کارنامے انجام دیے جن کا ذکر اسلامی تاریخ ہمیشہ حیرت کے ساتھ کرتی رہے گی اور ان کی تعریف میں ہمارے مورخین برابر طب اللسان رہیں گے۔ ہمارے لیے یہاں ان میں سے صرف دو کارناموں کا ذکر کافی ہے۔ ان میں سے پہلے کا تعلق غزوہ اُحد اور دوسرے کا تعلق جنگِ خندق سے ہے۔

غزوہ اُحد کے موقع پر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا مسلمان خواتین کی ایک ٹولی میں شامل ہو کر مجاہدین کے لشکر کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلیں اس موقع پر وہ پیاسوں کو پانی پلانے کے علاوہ تیروں کی درستی اور کمانون کی اصلاح و مرمت کی خدمت بھی انجام دے رہی تھیں اس کے علاوہ ان کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ وہ تمام جنگی کارروائیوں کا بحشم خود مشاہدہ کر سکیں اور اس میں تعجب کی کوئی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ خود ان کے بھتیجے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بھائی حضرت حمزہ ابن عبد المطلب اور بیٹے حضرت زبیر بن عوام حواری رسولؐ بھی اس جنگ میں شریک تھے۔ اور ان تمام باتوں کے بڑھ کر اور ہر چیز سے پہلے اس معرکے سے اس اسلام کا مستقبل وابستہ تھا جس کو انھوں نے بہ رضا و رغبت قبول کیا تھا۔

جب انھوں نے دیکھا کہ ایک قلیل تعداد کے علاوہ سارے مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میدان جنگ میں تنہا چھوڑ کر منتشر ہو گئے اور قریب تھا کہ مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ کر آپ کی زندگی کی شمع کو گل کر دیں تو انھوں نے اپنا مشکیزہ زمین پر پھینک دیا اور اس بھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹ پڑیں جس کے بچوں پر حملہ کر دیا گیا ہو۔ انھوں نے ایک بھاگتے ہوئے مسلمان کے ہاتھ سے اس کا نیزہ چھینا اور دشمن کی صفوں کو چیرتی، نیزے سے حملہ کرتی اور گرج کر یہ کہتی ہوئی آگے بڑھیں۔

”وَيَحْكُمُ بِإِنْهَارِ مَتَمٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ“
 ”تمہارا برا ہو، کیا تم لوگ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ
 کر بھاگے جا رہے ہو؟“

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آگے بڑھتے دیکھا تو آپ کو اس بات
 کا اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان کی نگاہیں اپنے بھائی حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب رضی
 اللہ عنہ کی لاش پر نہ پڑ جائیں جو زمین پر پڑی ہوئی تھی اور مشرکین نے مثلہ کر کے اس کی شکل بڑی
 طرح بگاڑ دی تھی۔ اس لیے ان کے بیٹے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی
 طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

”زبیر! اپنی ماں کو روکو، ان کو ادھر نہ آنے دو۔“ تو انھوں نے آگے بڑھ
 کر ان کو روکتے ہوئے کہا۔

”امی! پیچھے ہٹیں، ادھر نہ آئیں۔“ مگر انھوں نے ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔
 ”پرے ہٹ جا۔“ تو حضرت زبیر نے کہا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ آپ واپس لوٹ جائیں۔“
 ”مگر کیوں؟ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ میرے بھائی کی لاش کا مثلہ
 کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تو خدا کی راہ میں ہوا ہے۔“ انھوں نے صبر و استقامت کا
 مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”ان کا
 راستہ چھوڑ دو۔“ اور وہ ان کے راستے سے ہٹ گئے۔

جنگ کے خاتمے پر جب انھوں نے اپنے بھائی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ
 کی لاش پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ ان کا پیٹ چاک کر کے ان کا کلیجہ نکال لیا گیا
 ہے، کان اور ناک کاٹ لیے گئے ہیں اور چہرہ مسخ کر دیا گیا ہے تو ان کے لیے
 مغفرت کی دعا کرتے ہوئے فرمایا۔

”یہ سب اللہ کی راہ میں ہے، میں اس کے فیصلے پر راضی ہوں۔ خدا

کی قسم میں صبر کروں گی اور اسی سے اجر کی امید رکھوں گی۔

یہ تھا حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کا وہ رول جو انھوں نے غزوہ احد میں ادا کیا۔ اور جو کردار انھوں نے جنگ خندق کے موقع پر پیش کیا تھا اس کی داستان بھی نہایت جرات آفریں اور حیرت انگیز ہے جس کا تانا بانا ذہانت و ہوش مندی اور شجاعت و دور اندیشی نے مل کر تیار کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ کسی غزوے کا ارادہ فرماتے تو اس اندیشے سے کہ کہیں کوئی غداران کے محافظوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر غداری پر آمادہ نہ ہو جائے، عورتوں اور بچوں کو کسی محفوظ قلعے میں رکھ دیتے تھے۔ چنانچہ حسب معمول غزوہ خندق کے موقع پر بھی آپ نے اپنی ازواج، اپنی پھوپھی اور کچھ دوسری مسلمان خواتین کو ان کی حفاظت کے پیش نظر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ایک قلعے میں۔ جو ان کے آبا و اجداد سے وراثت میں ان کو ملا تھا اور مدینے کے قلعوں میں سب سے محفوظ اور دشمن کی پہنچ سے بہت دور تھا۔ بھیج دیا۔

اس اثناء میں کہ مسلمان، قریش اور اس کے حلیف قبائل کے مقابلے میں خندق کے اطراف پہرہ دینے اور دشمن کے ساتھ جنگی مصروفیات کی وجہ سے عورتوں اور بچوں کی حفاظت سے غافل ہو گئے تھے، حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب نے رات کے پچھلے پہر کی تاریکی میں ایک انسانی وجود کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے اس کی طرف اپنے کان لگائے اور اسے فور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی یہودی ہے جو قلعے کی طرف آرہا ہے۔ وہ قلعے کے حالات معلوم کرنے اور اس کے اندر موجود لوگوں کی ٹوہ لینے کے لیے اس کے گرد چکر لگانے لگا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا فوراً سمجھ گئیں کہ یہ اپنی قوم کا جاہلوس ہے اور

یہ معلوم کرنے آیا ہے کہ آیا قلعے میں صرف عورتیں اور بچے ہی ہیں یا ان کی حفاظت کے لیے کچھ مرد بھی موجود ہیں۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد انھوں نے اپنے دل میں کہا۔

”بنو قریظہ کے یہودی یقیناً اس عہد کو توڑ کر، جو ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تھا، مسلمانوں کے خلاف قریش اور ان کے حلیفوں کی مدد پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ اور ہمارے، اور ان غداروں کے درمیان ایک بھی مسلمان نہیں ہے جو ان کے مقابلے میں ہماری مدافعت کر سکے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی اہل ایمان دشمن کے سامنے سینہ سپر ہیں۔ ایسی صورت میں اگر یہ اللہ کا دشمن ہماری صحیح صورت حالی اپنی قوم کے پاس پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تو یہودی مسلمان عورتوں کو گرفتار کر لیں گے اور بچوں کو غلام بنا لیں گے اور یہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑی مصیبت ہوگی۔“

اس وقت انھوں نے اپنے دوپٹے کو اچھی طرح سر پر پیٹا، کپڑوں کو کمرے کس کر باندھا، کندھے پر خمیے کا ایک ستون رکھا اور قلعے کے دروازے کی طرف اتر گئیں۔ پھر نہایت آہستگی اور پوری احتیاط کے ساتھ اسے کھولا اور ہوشیاری کے ساتھ دروازے کے شکاف سے اس کا انتظار کرنے لگیں۔ جب وہ ایسی پوزیشن میں آ گیا جہاں ان کے لیے اس پر قابو پالینے کا بہتہ یقین ہو گیا تو انھوں نے پوری ہوشیاری کے ساتھ اس کے اوپر حملہ کیا اور اس کے سر پر ستون سے ایک بھر پور وار کر کے اسے زمین بوس کر دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے مسلسل کئی ضربیں لگا کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔ پھر خنجر نکال کر اس کے سر کو تن سے جدا کیا اور اس کو بلندی سے نیچے پھینک دیا جو قلعے کے دامن میں لڑھکتا ہوا ان یہودیوں کے سامنے جا کر رک گیا جو نیچے اس کا انتظار کر رہے

تھے۔ جب انھوں نے اپنے ساتھی کے کٹے ہوئے سر کو دیکھا تو ایک نے دوسرے سے کہا۔

”ہم جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، عورتوں اور بچوں کو ان کے محافظوں کے بغیر چھوڑنے والے نہیں ہیں۔“
پھر وہ واپس لوٹ گئے۔

اللہ تعالیٰ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب سے راضی ہو۔ انھوں نے مسلمان عورتوں کے لیے انوکھی مثالیں قائم کی ہیں۔ انھوں نے اکلوتے بیٹے کی بہترین تربیت کی، اپنے حقیقی بھائی کی موت کا صدمہ بڑی خندہ پیشانی اور صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کیا اور شدائد و آلام نے بار بار ان کی آزمائش کی مگر ہر بار انھیں ایک دوراندیش، عقل مند اور بہادر عورت پایا۔ پھر تاریخ نے اپنے بہترین صفحات میں ان کے متعلق لکھا۔

”ان صَفِيَّةَ بِنْتَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ
كَانَتْ اَوَّلَ اِمْرَاةٍ قَتَلَتْ مُشْرِكًا
فِي الْاِسْلَامِ.“

”حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ
عنها اسلام کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے
ایک مشرک کو قتل کیا۔“

حضرت عتبہ بن غزو ان رضی اللہ عنہ

امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نماز عشاء سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں تشریف لائے۔ وہ تھوڑی دیر آرام کر لینا چاہتے تھے تاکہ رات کو گشت کرنے کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔ لیکن نیند اس وقت خلیفہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کیونکہ قاصدان کے پاس یہ خبر لے کر آیا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے سے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کرنے والی ایرانی فوج پر اسلامی لشکر جب بھی کاری اور فیصلہ کن ضرب لگانا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ادھر ادھر سے کمک پہنچ جاتی ہے جس سے اس کی کھوئی ہوئی قوت بحال ہو جاتی ہے اور وہ اذسرِ نوقتل شروع کر دیتی ہے۔ خلیفہ کو یہ بات بھی بتائی گئی کہ شہر ابلہ کا شمار ان اہم ترین مراکز میں ہوتا ہے جہاں سے ایرانیوں کے ہزیمت خوردہ لشکر کو مالی اور افرادی قوت فراہم کی جاتی ہے۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابلہ کی فتح اور ایرانی فوج کو ملنے والی مدد کے سلسلے کو منقطع کرنے کے لیے ایک فوج بھیجا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت ان کے پاس لڑنے کے قابل آدمیوں کی سخت کمی تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت مختلف علاقوں

میں جہاد کے لیے جا چکی تھی۔ اس وجہ سے ان کے پاس مدینے میں قابل جنگ مسلمانوں کی بہت ہی قلیل تعداد باقی رہ گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے ایسی حکمت عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جس کے لیے وہ معروف تھے۔ یعنی ”قائد لشکر کی قوت کے ذریعہ قلتِ فوج کی تلافی کرنا“ چنانچہ انھوں نے اپنے ترکش کے تمام تیروں کو اپنے سامنے بکھیر دیا اور ایک ایک کر کے ہر ایک کو آزمانے لگے۔ آخر کار تھوڑی دیر کے بعد پیکار آٹھی۔

”میں اُس کو پا گیا۔ ہاں میں نے اُسے پایا۔“

پھر وہ زیر لب یہ کہتے ہوئے اپنے بستر کی طرف چلے گئے۔

”وہ ایسا مرد مجاہد ہے جس کی شجاعت و بسالت اور جرأت و مردانگی کے گواہ بدر و احد اور خندق و یمامہ کے میدان ہائے کارزار ہیں۔ نہ اس کی تلوار کا وار کبھی چوکا نہ اس کے تیر کا نشانہ کبھی جھٹا ہوا۔ پھر یہ کہ اس نے دو ہجرتیں کیں اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں میں وہ ساتواں شخص ہے۔“

صبح کو انھوں نے حضرت عتبہؓ ابن غزوہ ان کو بلا بھیجا۔ جب حضرت عتبہؓ بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے تو امیر المؤمنین نے ایک مختصر سی فوج کی قیادت ان کے سپرد فرمائی جس کی تعداد تین سو سے کچھ زیادہ تھی اور وعدہ فرمایا کہ وہ بعد میں مزید کچھ آدمی ان کی مدد کے لیے بھیجتے رہیں گے۔

جب اس چھوٹے سے لشکر نے روانگی کا قصد کیا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے اس کے قائد حضرت عتبہؓ ابن غزوہ ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

”عتبہ! میں تم کو سرزمینِ ابلہ کی طرف روانہ کر رہا ہوں۔ ابلہ دشمن کے محفوظ ترین شہروں میں سے ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کی فتح میں تمہیں اپنی نصرت سے نوازے گا۔ جب تم وہاں پہنچنا تو پہلے اس کے باشندوں کو خدا کے

دین کی طرف دعوت دینا۔ ان میں سے جو بھی تمہاری دعوت پر لبیک کہے اسے قبول کر لینا اور جو اسے قبول کرنے سے انکار کرے اس سے ذلت و رسوائی کے ساتھ جزیہ وصول کرنا۔ لیکن اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوں تو ان سے قتال کرنا۔ اور اس میں کسی قسم کی رعایت اور نرمی سے کام نہ لینا۔ حضرت عمرؓ نے نصیحت کے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

”عتبہ! تم اپنی قائدانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اور اس بات سے ہمیشہ ہوشیار رہنا کہ کہیں تمہارا نفس تم کو کبر و غرور میں مبتلا کر کے تمہاری آخرت کو تباہ نہ کر دے۔ تمہیں اس بات کا ہمیشہ احساس رہنا چاہیے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے سرفراز ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ذلت کو عزت اور تمہاری کمزوری کو طاقت میں بدل دیا۔ یہاں تک کہ تم ایک با اختیار امیر اور ایک قابل اطاعت قائد بن گئے کہ جب تم کوئی بات کہتے ہو تو وہ بغور مسمیٰ جاتی ہے اور کوئی حکم دیتے ہو تو اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ بشرطیکہ تم کو غرور اور فریب نفس میں مبتلا کر کے جہنم میں نہ جھونک دے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو اس سے محفوظ رکھے۔“

حضرت عتبہؓ اپنی مختصر فوج کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ اور بعض دوسرے مجاہدین کی بیویاں اور بہنیں بھی تھیں جن کی تعداد پانچ تھی۔ ان لوگوں نے ایک ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں زکریا کے بہت زیادہ پودے تھے۔ یہ جگہ شہر ابلہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اُس وقت ان لوگوں کے پاس کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ جب یہ لوگ بھوک سے بے تاب ہو گئے تو حضرت عتبہؓ نے چند آدمیوں سے کہا کہ وہ اُس سرزمین میں کوئی ایسی چیز تلاش کریں جس کو ہم کھا سکیں۔ تو وہ لوگ اٹھے اور خوراک کی تلاش میں نکل پڑے۔ اس تلاش و جستجو اور

حصولِ غذا کی کہانی ان میں سے ایک مجاہد نے یوں بیان کی ہے۔

”دریں اثناء کہ ہم لوگ کسی قابلِ خوراک چیز کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ ایک جھاڑی میں گھس گئے۔ اس جھاڑی میں ہم کو دو بورے ملے۔ ان میں سے ایک بورے میں کھجوریں تھیں اور دوسرے بورے میں سفید سفید چھوٹے چھوٹے دانے تھے جو زرد رنگ کے چھلکوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ہم ان دونوں بوروں کو کھینچتے ہوئے لشکر کے قریب لائے، ہمارے ایک فوجی نے جب اس بورے کو دیکھا جس میں دانے تھے تو بولا کہ یہ کوئی زہریلی چیز ہے جس کو دشمنوں نے ہمارے لیے رکھا ہے۔ اس کے قریب نہ جانا۔ ہم لوگ اس کو چھوڑ کر کھجور پر ٹوٹ پڑے اور اس کو کھانے میں مشغول ہو گئے۔ ابھی ہم کھجوروں کو کھا ہی رہے تھے کہ ایک گھوڑا اپنی رسی تڑا کر اس بورے کے پاس پہنچ گیا اور اس میں سے کھانے لگا۔ ہم نے چاہا کہ مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر دیں تاکہ اس کا گوشت ہمارے کھانے کے کام آجائے۔ مگر اس گھوڑے کے مالک نے کہا کہ اسے چھوڑ دو۔ میں رات میں اس کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ اگر مجھے اس کے مرنے کا اندیشہ ہوا تو اسے ذبح کر دوں گا۔ صبح کو ہم نے دیکھا کہ گھوڑا بالکل ٹھیک ٹھاک اور تندرست ہے۔ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔“

میری بہن نے مجھ سے کہا کہ بھائی جان! میں نے ابا کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر زہریلی چیز کو آگ پر رکھ کر پکا دیا جائے تو وہ نقصان نہیں پہنچاتی۔ پھر اس نے تھوڑے سے دانے لیے اور انھیں ایک دیگی میں رکھ کر اس کے نیچے آگ جلادی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ پیکار اٹھی۔ ”ادھر آؤ“ دیکھو کس طرح اس کا رنگ سرخ ہوا۔ پھر اس کا چھلکا پھٹا اور اس میں سے سفید دانہ نکل آیا۔“ پھر جب کھانے کے لیے ہم نے اس کو ایک طشت میں رکھا تو عتبہؓ نے ہم سے کہا کہ اللہ کا نام لے کر کھاؤ۔ ہم نے اس کو کھایا۔ وہ نہایت لذیذ اور مزیدار تھا۔ پھر بعد میں ہم کو معلوم ہوا کہ اس دانے کا

نام دھان ہے۔

اہل جس کو فتح کرنے کے لیے حضرت عقبہؓ اپنی فوج کے ساتھ آئے تھے، ایک مضبوط اور مستحکم شہر تھا جو دریائے دجلہ کے کنارے آباد تھا۔ اہل فارس نے اس کو اپنے اسلحوں کی ذخیرہ گاہ بنا رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے دشمنوں کی نگرانی کے لیے اس کی فصیلوں پر برجیاں بنا رکھی تھیں، جہاں سے وہ حملہ آوروں پر دور ہی سے نظر رکھ سکتے تھے۔ لیکن مقابلین کی قلت تعداد اور سامانِ حرب کی کمی کے باوجود یہ سائے انتظامات حضرت عقبہؓ کو ان کے اوپر حملہ کرنے سے نہ روک سکے۔ اُس وقت حضرت عقبہؓ کے پاس لڑنے والوں کی تعداد چھ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ اور ان میں چند عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان کے پاس تلواروں اور نیزوں کے علاوہ دوسرے ہتھیار بھی نہیں تھے۔ اُس لیے اس کی تلانی کے لیے ان کو اپنی ذہانت اور فوجی سوچ بوجھ کا استعمال ناگزیر تھا۔

انھوں نے کچھ جھنڈے بنائے اور انھیں نیزوں پر لگا کر عورتوں کے حوالے کیا۔ اور ان کو حکم دیا کہ وہ ان جھنڈوں کو لے کر فوج کے پیچھے پیچھے چلیں۔ اور ان کو اس بات کی ہدایت کی کہ جب ہم لوگ شہر کے قریب پہنچ جائیں تو وہ ہمارے پیچھے خوب گرد و غبار اٹھائیں۔ اتنی کہ اس سے پوری فضا ڈھک جائے۔ پھر جب یہ لوگ شہر کے قریب پہنچے تو ایرانی دروازہ کھول کر شہر سے باہر نکلے اور انھیں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ لیکن جب انھوں نے ان جھنڈوں کو ان کے پیچھے حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور فضا کو گرد و غبار سے اٹھا ہوا پایا تو باہم ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ فوج کا ہرادل دست ہے۔ اس کے پیچھے ایک لشکر جبار ہے جو گرد و غبار اٹاتا چلا آ رہا ہے۔ اور ہم لوگ تعداد میں بہت کم ہیں۔ ان کے دلوں میں بزدلی سرایت کر گئی اور ان کے اوپر خوف و ہراس مسلط ہو گیا۔ پھر تو وہ اپنے ہلکے پھلکے

اور بیش قیمت سامان سمیٹ کر ان کشتیوں کی طرف تیزی سے لپکے جو دریائے دجلہ کے ساحل پر کھڑی تھیں۔ اور ان پر سوار ہو کر انھوں نے راہ فرار اختیار کر لی۔ اور حضرت عتبہؓ کسی جنگ و جدال کے بغیر ابلہ پر قابض ہو گئے اور انھیں اپنا ایک آدمی بھی ضائع نہیں کرنا پڑا۔ پھر اُس کے ارد گرد کے شہروں اور آبادیوں کو فتح کر لیا۔ اس موقع پر بے شمار وبے اندازہ مال غنیمت ان کے ہاتھ آیا۔ ان فوجیوں میں سے ایک شخص جب مدینے واپس آیا اور لوگوں نے اس سے دریافت کیا کہ ابلہ میں مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ تو اُس نے کہا کہ تم کس کے متعلق پوچھ رہے ہو؟ خدا کی قسم میں ان کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ لوگ سونے اور چاندی کے وزن کرنے کے بجائے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ یہ سن کر لوگوں نے اپنی سواریوں کے رخ ابلہ کی طرف کر دیے۔

اُس وقت حضرت عتبہ ابن غزوٰان نے محسوس کیا کہ اگر ان کے فوجی ان مفتوحہ علاقوں میں سکونت پذیر ہو گئے تو یہ آرام طلبی اور تن آسانی کے عادی ہو جائیں گے اور یہاں کے باشندوں کے طور اختیار کر کے رُوح جہاد سے یکسر عاری ہو جائیں گے اور ان کے اندر حرب و ضرب اور قتال و جہاد کے جذبات کمزور پڑ جائیں گے۔ اس لیے انھوں نے خط لکھ کر امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطابؓ سے شہر بصرہ کی تعمیر کی اجازت طلب کی۔ اور جس جگہ پر وہ اس شہر کو بسانا چاہتے تھے اس کے بارے میں مفصل معلومات خلیفہؓ کو فراہم کیں تو خلیفہ نے ان کو اس کی اجازت مرحمت فرمادی۔ حضرت عتبہؓ نے نئے شہر کی پلاننگ کی اور سب سے پہلے اس کی عظیم الشان مسجد کی تعمیر کی۔ اور اس میں کوئی حیرت و تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اور ان کے ساتھی راہ خدا میں جہاد کرنے کے لیے مسجد ہی کے واسطے تو نکلے تھے۔ اور اسی مسجد ہی کی وجہ سے تو ان کو اور ان کے ساتھیوں کو دشمنانِ خدا پر فتح و

کامرانی حاصل ہوئی تھی۔

پھر لوگ زمین کے پلاٹوں کے حصول اور مکانات کی تعمیر میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔ لیکن خود حضرت عتبہؓ نے اپنے واسطے کوئی مکان نہیں بنوایا۔ وہ مستقل طور پر کبلوں سے بنے ہوئے ایک نیچے میں سکونت پذیر رہے۔ کیونکہ وہ اپنے دل میں پہلے ہی سے کوئی بات طے کر چکے تھے.....

حضرت عتبہؓ نے دیکھا کہ بصرہ میں مسلمانوں کو وہ عیش و آرام اور دنیاوی ساز و سامان حاصل ہو گیا جس کی وجہ سے آدمی از خود رفته ہو جاتا ہے۔ اور اپنی اصل حیثیت اور حقیقی ذمہ داریوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ ان کے ساتھی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہی لوگ جو کچھ دنوں پہلے چاول سے زیادہ لذیذ تر کسی کھانے سے ناواقف تھے۔ اب نفیس ترین ایرانی کھانے، فالودہ اور لوزینہ وغیرہ مزے لے لے کر کھاتے تھے۔ ایسی حالت میں حضرت عتبہؓ کو دنیاوی عیش و آرام کے مقابلے میں اپنے دین کی حفاظت اور دنیا کے فوری اور عارضی فوائد کے بالمقابل آخرت میں حاصل ہونے والے دائمی اور لازوال منافع کو طلب کرنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ انھوں نے لوگوں کو بصرہ کی جامع مسجد میں جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر فرمائی۔

”لوگو! یہ دنیا اپنے سفر کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ اور تم اسے چھوڑ کر ایک ایسے گھر کی طرف منتقل ہونے والے ہو جو لازوال اور ابدی ہے۔ تو تم اپنے بہترین اعمال کو ساتھ لے کر اس میں منتقل ہونے کی فکر کرو۔ میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف سات آدمی ایمان لاتے تھے۔ اس وقت درختوں کی پتیوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہم کو کھانے کے لیے بیسترنہ تھی۔ ان پتیوں کو کھانے کی وجہ سے ہماری

باچھیں زخمی ہو گئی تھیں۔ ایک دن مجھے کہیں سے ایک چادر مل گئی۔ اُسے میں نے اپنے اور سعد بن ابی وقاصؓ کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کر دی۔ آدھی چادر میں نے اور پھر آدھی سعدؓ نے۔ اور آج ہماری یہ حالت ہے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی شہر کا امیر اور حاکم نہ ہو۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں اپنے آپ کو عظیم سمجھوں لیکن خدا کے یہاں صنیر و حقیر بن جاؤں۔“

اس کے بعد حضرت عتبہؓ نے ان میں سے ایک شخص کو اپنا قائم مقام بنایا اور ان سے رخصت ہو کر مدینہ کا رخ کیا۔ اور بارگاہِ خلافت میں پہنچ کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں گورنری سے اپنا استعفار پیش کر دیا۔ مگر حضرت عمرؓ نے ان کا استعفار نامنظور فرماتے ہوئے انھیں اپنی ذمہ داری سنبھالنے کی تاکید کی۔ حضرت عتبہؓ استعفار کی منظوری کے لیے اصرار کرتے رہے، لیکن خلیفہؓ نے ان کی ایک نہ سنی اور انھیں بصرہ واپس جانے کا حکم دیا۔ آخر کار بادل نا خواستہ وہ اس کے لیے تیار ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے۔

”خدا یا! مجھے اب وہاں واپس نہ لے جا۔ خدا یا!.....“

اور ان کی یہ دعا بارگاہِ خداوندی میں شرفِ قبولیت سے ہم کنار ہوئی۔ ابھی وہ مدینہ سے زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اچانک ان کی اونٹنی کا پاؤں پھسلا، حضرت عتبہؓ نیچے گرے اور زندگی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ

نعیم بن مسعود ایک ایسے بیدار مغز، تیز فہم، ذہین و فطین اور چست و چالاک شخص تھے جن کی راہ میں نہ تو کوئی پیچیدہ مسئلہ حائل ہو سکتا تھا نہ ہی وہ کسی مشکل معاملے کو حل کرنے میں ناکام ہو سکتے تھے۔ صحرا کا یہ سپوت اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی غیر معمولی صلاحیتوں — صحت فراست، سرعتِ ذہن اور تیزیِ عقل — کے باعث ایک بے مثال شخصیت کا حامل تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ بڑا رنگین مزاج، رنگ رلیوں کا دلدادہ اور گانے بجانے کا شوقین بھی تھا۔ ان دلچسپیوں اور خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ اکثر و بیشتر شرب کے یہودیوں کے یہاں جاتا رہتا تھا۔ چنانچہ جب بھی اس کا دل کسی مغنیہ کے لیے بے چین ہوتا یا اس کے کان پر بٹو و رباب کے تاروں سے نکلنے والے دلکش اور مسحور کن نغموں کے لیے بے قرار ہوتے تو وہ نجد سے — جہاں اس کا قبیلہ آباد تھا — سیدھا مدینے پہنچتا اور وہاں یہودیوں پر دل کھول کر مال و دولت لٹاتا تاکہ وہ اس کی دلچسپیوں اور عیاشیوں کا بھرپور انتظام کریں۔ اسی وجہ سے نعیم بن مسعود اکثر شرب آتا جاتا رہتا اور یہودیوں، خصوصاً یہودی بنی قریظہ کے ساتھ اس کے بڑے گہرے اور مضبوط روابط تھے۔

جب اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو اپنے کرم سے نازل فرمایا تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور مکے کی وادیاں

آفتاب اسلام کی تابانیوں سے جگمگا اٹھیں، نعیم بن مسعود خواہشات کی باگ اپنے نفس کے ہاتھ میں ڈھیلی چھوڑ کر پیہم ان کی پیروی میں منہک تھا اور اس نے اس نئے دین سے صرف اس اندیشے کے تحت سختی کے ساتھ اعراض کیا کہ کہیں یہ دین اس کی لذت کوشیوں اور رنگ رلیوں پر قدغن لگا کر اس کی زندگی کا سارا مزہ کر کرنا نہ کر دے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد اسلام کے بدترین دشمنوں کی صف میں شامل ہو کر اس نے اپنی تلوار اس کے مقابلے کے لیے بے نیام کر لی۔

لیکن غرہ احزاب کے موقع پر نعیم بن مسعود نے دعوتِ اسلامی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور اس باب میں انھوں نے اپنے ہاتھ سے وہ داستان رقم کی جو جنگی چالوں پر مشتمل داستانوں میں سب سے زیادہ حیرت آفریں اور تعجب انگیز داستان ہے۔ ایک ایسی داستان جس کے محکم اجزاء اور اس کے عاقل و دانا، میر و کا تذکرہ مورخ کا قلم ہمیشہ حیرت و استعجاب کے ساتھ کرتا رہے گا۔

نعیم بن مسعود کی اس نرالی داستان سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہمیں تھوڑا سا تیجھے کی طرف لوٹنا ہوگا۔ غرہ احزاب سے کچھ عرصہ پہلے یثرب کے یہودیوں کی ایک ٹولی جس کا تعلق بنو نضیر سے تھا، حرکت میں آئی اور اس کے لیڈروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے اور ان کے دین پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے مختلف قبیلوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ قریش مکہ کے پاس پہنچے اور ان کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر ابھارا اور ان سے اس بات کا مضبوط عہد و پیمانہ کیا کہ جب تم لوگ فوج لے کر مدینہ پہنچو گے تو ہم بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ پھر ان کو چھوڑ کر وہ لوگ نجد میں بنو

غطفان کے پاس گئے اور انھیں بھی اسلام اور اس کے نبی کے خلاف خوب خوب بھڑکایا۔ اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی دعوت دی اور وہ ساری باتیں تفصیل سے ان کو بتائیں جو قریش اور ان کے درمیان طے ہوئی تھیں پھر ان کے ساتھ بھی انہیں شرائط پر معاہدہ کیا اور طے شدہ وقت سے آگاہ کر کے واپس چلے آئے۔

ادھر قریش ایک لشکر جرار کے ساتھ جس میں ان کے پیدل اور گھڑ سوار دستے شامل تھے، اپنے سپہ سالار ابوسفیان بن حرب کی قیادت میں اور ادھر غطفان پورے جنگی ساز و سامان اور جمعیت کثیر کے ساتھ اپنے قائد عیینہ ابن حصن غطفانی کی سرکردگی میں مدینہ کی طرف چل پڑے۔ ہماری اس داستان کا ہیرو نعیم ابن مسعود بھی اپنے قبیلے بنو غطفان کے ہزاروں دستے میں شامل تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی روانگی کی خبر ملی تو آپ نے صحابہ کرام کو جمع کر اس معاملے میں ان کی رائیں طلب کیں۔ آخر باہمی مشورے سے یہ بات طے ہوئی کہ مدینہ کے ارد گرد ایک خندق کھودی جاتے تاکہ وہ خندق اس لشکر کے سامنے حائل ہو جائے اور ہم اس کے حملے سے اپنا تحفظ کر سکیں جس سے کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کی ہمارے پاس طاقت نہیں ہے۔

جب مکہ اور نجد سے پیش قدمی کرنے والے یہ دونوں لشکر مدینہ کی سطح مرتفع کے قریب پہنچے تو بنو نضیر کے یہودی زعماء مدینہ میں بنو قریظہ کے یہودی سرداروں کے پاس پہنچے اور ان کے اوپر اس سلسلے میں کافی دباؤ ڈالا کہ وہ اس جنگ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مکہ اور نجد سے آنے والی فوجوں کا ساتھ دیں۔ مگر بنو قریظہ کے سرداروں نے ان سے کہا کہ یہ چیز جس کی طرف تم ہم کو دعوت دے رہے ہو، اگرچہ ہماری مطلوبہ اور پسندیدہ چیز ہے لیکن تم کو معلوم ہے کہ ہمارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان اس شرط پر ایک معاہدہ

ہو چکا ہے کہ ہم آپس میں صلح و آشتی کے ساتھ رہیں گے تاکہ دونوں فریق مدینہ میں امن و اطمینان کے ساتھ رہ سکیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ ابھی اس معاہدے کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی ہے۔ یہیں اس بات کا سخت اندیشہ ہے اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس جنگ میں فتحیاب ہوئے تو معاہدے کی خلاف ورزی کے جرم میں وہ ہم پر سخت گرفت کریں گے اور ہمیں مدینے سے نیست و نابود کر کے دم لیں گے۔ لیکن بنو نضیر کے سردار ان کو برابر نقض عہد پر ابھارتے، اس کو مزین کر کے ان کے سامنے پیش کرتے اور ان کو سبز باغ دکھاتے رہے کہ اب کی بار محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زبردست تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

آخر کار بنو قریظہ کے یہودی ان کے سامنے ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوئے اپنے معاہدے کو توڑ دیا اور صلحنامے کی دستاویز کو پھاڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش و غطفان کی متحدہ فوج کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں کے اوپر اس کا ایسا اثر ہوا جیسے ان کے اوپر بھلی گر پڑی ہو۔

دشمن کی فوجوں نے ہر طرف سے مدینہ کا محاصرہ کر کے خوراک اور ضروریات زندگی کی رسد منقطع کر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دشمن کے دونوں جھروں کے درمیان پھنس گئے ہیں۔ کیوں کہ ایک طرف قریش اور غطفان کے لشکر مدینہ کے باہر مسلمانوں کے سامنے خیمہ زن تھے اور دوسری طرف اندرون شہر بنو قریظہ کے یہودی مسلمانوں کے پیچھے گھات لگاتے ان کے اوپر حملہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ پھر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کا مرض تھا، اپنے سینوں میں پوشیدہ خباثوں کا اظہار کرنے پر تمل گئے۔

تھے۔ وہ کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا وعدہ کر رہے تھے اور آج ہماری بے کسی اور مجبوری کی یہ حالت ہے کہ ہم اپنی جان کے خوف سے رفع حاجت کے لیے بیت النخل تک جانے کی سکت نہیں رکھتے۔ پھر ان کی ٹولیاں یکے بعد دیگرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر کھسکنے لگیں۔ پہانہ یہ تھا کہ ہمیں بنو قریظہ کی طرف سے اس بات کا ڈر ہے کہ جب لڑائی شروع ہو جائے گی تو وہ اچانک ہماری عورتوں، بچوں اور گھروں پر حملہ کر دیں گے۔ یہاں تک کہ چند سو مخلص مسلمانوں کے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی نہیں بچا تھا۔ محاصرے کی راتوں میں سے ایک رات کو جس کا سلسلہ تقریباً بیس دن سے جاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی بارگاہ میں انتہائی گریہ و زاری کے ساتھ بار بار یہ دعا کر رہے تھے۔

”اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ عَهْدَكَ“ ”دایا! میں تجھے تیرا عہد اور تیرا وعدہ یاد دلا رہا ہوں۔۔۔۔۔ دایا! میں تجھے تیرا عہد عہدَكَ وَوَعْدَكَ“ اور تیرا وعدہ یاد دلا رہا ہوں۔“

اس رات نعیم بن مسعود بے خوابی کی وجہ سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ان کی پلکیں جھپکنے کا نام نہیں لیتی تھیں جیسے ان میں کیلیں جڑی گئی ہوں۔ وہ آنکھیں کھولے صاف ستھرے آسمان کی سطح پر تیرتے ہوئے ستاروں کو ایک ٹک دیکھے چلے جا رہے تھے۔ وہ بڑی دیر تک بجز تفکر میں غوطہ زن رہے۔ اچانک انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا دل ان سے سوال کر رہا ہے۔

”نعیم! تمہارا بڑا ہوا آخر وہ کون سی چیز ہے جو تم کو اس ”مرد صالح“ کے مقابلے میں اپنی تلوار بے نیام کرنے پر اکسا رہی ہے؟ جو اپنے متبعین کو عدل و احسان

اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتا ہے ؟ اور کیا چیز ہے جو تم کو اس بات پر اکسارہی ہے کہ اپنا نیزہ اس کے ان ساتھیوں کے خون سے رنگین کرو جنہوں نے اس کی لائی ہوئی ہدایت اور حق کی پیروی اختیار کی ہے ؟“

نعیم بن مسعود اور ان کے دل کے مابین ہونے والی اس گفتگو کو اس دورانِ شانہ عزم نے منقطع کیا جس کو رو بہ عمل لانے کے لیے وہ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ وہ رات کی تاریکی میں اپنے قبیلے کے کیمپ سے دبے پاؤں نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے چل پڑے۔ جب آپ نے ان کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو فرمایا۔

”نعیم بن مسعود؟“

”اس وقت کس ضرورت سے آئے ہو؟“ آپ نے دریافت فرمایا۔

”اس وقت اس لیے حاضر خدمت ہوا ہوں کہ اس بات کی گواہی دوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور جو دین آپ لائے ہیں وہ برحق ہے“ سلسلہ کلام کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”اے اللہ کے رسول! میں اسلام قبول کر چکا ہوں مگر میرے قبیلے کے لوگ ابھی اس بات سے بے خبر ہیں۔ تو آپ مجھے جو حکم دینا چاہیں، دیں۔ میں اس کی تعمیل کروں گا۔“

”تم ہمارے اندر وہ واحد شخص ہو، جو اس کام کو کر سکتا ہے۔ تم اپنے قبیلے والوں کے پاس جاؤ اور ہو سکے تو ان کو اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ ہمارے خلاف جنگ سے ہاتھ کھینچ لیں اور قریش سے کنارہ کش ہو جائیں۔ جنگ میں چھکے سے کام لینا اس کا ایک زبردست حربہ ہے۔“ آپ نے فرمایا۔

”ہاں، اے اللہ کے رسول انشاء اللہ آپ عنقریب ایسی بات دیکھیں گے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔“ انھوں نے جواب دیا۔

حضرت نعیمؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سے روانہ ہو کر اسی وقت بنو قریظہ کے پاس پہنچے۔ وہ پہلے سے ان کے دوست اور ہم نشین تھے۔ اور ان سے کہا۔

”بنو قریظہ! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہارا کتنا سچا دوست اور مخلص خیر خواہ ہوں؟“

”ہاں، تمہاری دوستی اور خیر خواہی ہر شبہ سے بالاتر ہے۔“ انھوں نے جواب دیا۔

”اس جنگ میں قریش اور غطفان کا معاملہ تمہارے معاملے سے سراسر مختلف ہے۔“ حضرت نعیمؓ نے کہا۔

”وہ کیسے؟“ بنو قریظہ نے پوچھا۔

”وہ ایسے۔“ انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”کہ یہ شہر تمہارا شہر ہے۔

تمہارے بال بچے اور تمہارے اموال اسی شہر میں ہیں۔ تمہارے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اسے چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جاؤ۔ رہا قریش اور غطفان کا معاملہ تو ان کے اموال، ان کے بچے اور ان کی عورتیں دوسرے شہر میں ہیں۔ وہ یہاں

محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے آئے اور انہوں نے تم کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے توڑ ڈالنے اور ان کے خلاف اپنی مدد کی دعوت

دی، جس کو تم قبول کر چکے ہو۔ اب اگر وہ اس جنگ میں کامیاب ہوتے ہیں تو سے غنیمت سمجھیں گے، لیکن اگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب کرنے میں

ناکام ہوئے تو تم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنے علاقے کی طرف واپس چلے جائیں گے۔ پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے بدترین انتقام لیں گے۔ اور تم خوب جانتے ہو کہ تنہا ان کا مقابلہ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔“

بنو قریظہ نے یہ سُن کر کہا: ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن اس معاملے میں

تمہاری کیا رائے ہے؟“

”میری رائے اس کے بارے میں یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے اشراف اور سربراہوں کی ایک معتد بہ تعداد بطور یرغمال تمہارے پاس نہیں رکھ دیتے، تم ان کے ساتھ جنگ میں شرکت کرنے سے انکار کر دو۔ اس طرح تم ان کو اس بات پر مجبور کر سکو گے کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر آخر دم تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کریں۔ پھر یا تو تمہیں غلبہ و کامرانی نصیب ہو جائے یا تمہارا اور ان کا آخری آدمی تک میدان جنگ میں کام آجاتے۔“ حضرت نعیم نے ان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تمہارا یہ مشورہ واقعی نہایت خیر خواہانہ ہے۔“ بنو قریظہ نے کہا۔

وہاں سے اپنا کام ختم کر کے حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ قریش کے سپہ سالار ابوسفیان بن حرب کے پاس پہنچے اور اس سے اور اس کے ساتھیوں سے کہا۔

”اے گروہ قریش! یہ بات تمہارے اوپر مخفی نہیں ہے کہ مجھے تم سے کتنی گہری محبت ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کیسی سخت عداوت ہے۔ مجھے ایک بڑی اہم بات معلوم ہوئی ہے اور تمہاری خیر خواہی کا تقاضا سمجھ کر میں یہ بات تمہارے گوش گزار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس بات کو راز رکھو، کسی کے سامنے ظاہر نہ کرو۔“ جب قریش نے رازداری کا

دعدہ کر لیا تو انھوں نے کہا۔

”بنو قریظہ کے یہودی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ دشمنی مول لے کر اب بہت پختہ رہے ہیں۔ اس کی تلافی کے لیے انھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہاں یہ کہلا بھیجا ہے کہ ”ہم اپنے کیے پر سخت نادم ہیں۔ اور آپ کے ساتھ صلح نامے کی تجدید کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ ہم قریش اور غطفان سے ان کے سرداروں کی ایک کثیر تعداد بطور یرغمال لے کر آپ کے حوالے کر دیں کہ آپ ان کی گردنیں مار دیں۔ پھر جنگ میں ہم ان کے بجائے آپ کا ساتھ دیں اور آپ ان کے اُد پر آخری اور فیصلہ کن وار کر سکیں۔“ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی اس پیشکش کو قبول کر لیا ہے۔ تو اگر یہودی تم سے یرغمال کے طور پر کچھ آدمیوں کا مطالبہ کریں تو تم ایک آدمی بھی ان کے حوالے نہ کرنا ”تم ہمارے بہترین حلیف ہو، اللہ تعالیٰ تم کو بہترین جزا دے۔“ ابوسفیان نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ ابوسفیان کے یہاں سے نکل کر اپنے قبیلے بنو غطفان کے پاس پہنچے اور ان سے بھی وہی ساری باتیں کہیں جو ابوسفیان کے کہہ چکے تھے اور اس خطرے سے انھیں بھی چوکنار رہنے کی تاکید کی جس سے ابوسفیان کو آگاہ کر چکے تھے۔

ابوسفیان نے بنو قریظہ کو آزمانے کے لیے ان کے پاس اپنے بیٹے کو بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ میرے والد نے تم کو سلام کہا ہے اور تمہارے پاس یہ پیغام بھیجا ہے کہ ”ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب کے خلاف اس محاصرے کی طوالت سے تنگ آچکے ہیں اور جلد از جلد ان کے ساتھ جنگ شروع کر کے اس قضیے کو نمٹا دینے کا حتمی فیصلہ کر چکے ہیں اس لیے تم بھی کل ان کے خلاف اپنی

کارروائیوں کا آغاز کر دو۔“ تو انہوں نے جواب دیا کہ ”کل تو سینچر کا دن ہے۔ اس روز ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم اس وقت تک تمہارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے جب تک تم اپنے اور بنو غطفان کے ستر سربر آوردہ اشخاص کو یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے نہیں کر دیتے۔ اس لیے کہ ہم کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ جب جنگ شدت اختیار کر جائے گی تو تم ہمیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلے میں تنہا چھوڑ کر اپنے علاقے کی طرف بھاگ جاؤ گے اور تم جلتے ہو کہ ہم تنہا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

جب ابوسفیان کے رط کے نے واپس جا کر اپنے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو اس نے بنو قریظہ سے سنی تھیں تو سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

”بڑے ملعون ہیں یہ بندروں اور خنزیریوں کی اولاد۔ خدا کی قسم اگر یہ ہم سے یرغمال کے طور پر ایک بکری بھی مانگیں تو ہم انہیں نہیں دے سکتے۔“

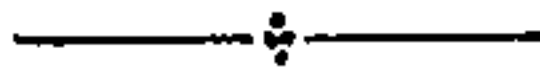
حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے منصوبے کے مطابق متحدہ جماعتوں کی صفوں کو پراگندہ کرنے اور ان کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں پورے طور پر کامیاب ہو گئے۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے قریش اور ان کے حلیفوں کے اوپر تیز اور سرکش آندھی کے جھکڑ بھیج دیے جن کی زد میں آکر ان کے خیمے اکھڑ گئے، دیگیں الٹ گئیں اور چوٹے بچھ گئے۔ تیز ہوائیں ان کے چہروں پر طمانچے لگاتی اور آنکھوں میں مٹی ڈال رہی تھیں۔ اب سولائے اس کے کہ وہ یہاں سے کوچ کر جائیں اس مصیبت سے نجات کی کوئی دوسری راہ انہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ چنانچہ راتوں رات وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جب صبح کو مسلمانوں نے دیکھا کہ ان دشمنانِ خدا کے وجود سے پورا میدان صاف ہو چکا ہے اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے ہیں تو خوشی سے چلا اٹھے۔

”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَصَرَ عَبْدَهُ وَ
 اعَزَّ جُنْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ
 وَحُدَّهُ“

”شکر ہے اس خدا کا جس نے اپنے بندے
 کی مدد فرمائی، اپنے شکر کی مدد کی اور،
 متحدہ فوجوں کا منہ پھیر دیا۔“

اس روز کے بعد سے حضرت نعیم بن مسعودؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
 انتہائی قابل اعتماد لوگوں کی صف میں اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ آپ نے ان
 کو والی بھی بنایا اور فوجی دستوں کی قیادت بھی ان کے سپرد کی۔
 فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان شکر مجاہدین کے مختلف دستوں کو یکے بعد
 دیگرے اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے قبیلہ
 غطفان کے علم بردار کو دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا۔
 ”یہ کون ہے؟“

”یہ نعیم بن مسعود ہیں،“ اس کے ساتھیوں نے بتایا۔
 ”اس نے جنگ احزاب کے موقع پر ہمارے ساتھ بہت برا سلوک کیا
 تھا۔ خدا کی قسم یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے کڑا دشمن تھا اور یہ دیکھو
 آج یہ اپنے قبیلے کا جھنڈا اٹھاتے ان کے آگے آگے چل رہا ہے اور ان کی ماتحتی
 میں ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے جا رہا ہے۔“ ابوسفیان نے کہا۔



حضرت خُباب بن اَرت رضی اللہ عنہ

ام انمار خزاہیہ ایک روز مکے میں واقع بردہ فردشوں کے بازار میں پہنچی۔ وہ ایک غلام زیدنا چاہتی تھی تاکہ اس سے خدمت لے اور اس کی کمائی سے فائدہ حاصل کرے۔ وہ فروخت کے لیے آئے ہوئے ایک ایک غلام کے چہرے کو بغور دیکھتی پھر رہی تھی۔ آخر اس کی نگاہ انتخاب ایک لڑکے پر جا کر ٹک گئی جو ابھی سن پورغ کو نہیں پہنچا تھا۔ اس لڑکے کی جسمانی صحت اور اس کے چہرے سے ظاہر ہونے والے ذہانت و فطانت کے آثار نے ام انمار کو اس کی خریداری پر آمادہ کیا۔ اس نے قیمت ادا کر کے اسے خرید لیا۔ گھر جاتے ہوئے ام انمار نے راستے میں اس سے پوچھا۔

”بچے! تمہارا کیا نام ہے؟“

”خُباب“

”اور تمہارے والد کا؟“

”ارت“

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”سُجَد کا“

”تب تو تم عربی النسل ہو۔“

”ہاں، اور میرا تعلق بنو نمیم سے ہے۔“

”تم ان بردہ فروشوں کے ہاتھ کیسے لگ گئے؟“

”ایک قبیلے کے لوگوں نے ہماری بستی پر اچانک چھا پہ مار کر ہمارے جانوروں کو چھین لیا، عورتوں کو گرفتار کر لیا اور بچوں کو پکڑ لیا، پکڑے جانے والے بچوں میں میں بھی تھا۔ پھر میں یکے بعد دیگرے مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا یہاں مکہ پہنچ گیا اور اب آپ کے ہاتھ میں ہوں۔“

ام انمار نے اپنے اس غلام کو مکے کے ایک آہن گر کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اس سے اسلحہ سازی کا ہنر سیکھے اس نے بہت جلد اس فن میں مہارت حاصل کر لی اور اس میں طاق ہو گیا اور جب اس کے بازو خوب قوی ہو گئے اور وہ جسمانی طور پر کافی مضبوط ہو گیا تو ام انمار نے ایک دکان کرائے پر لی اور اسلحہ سازی کے لیے ضروری اوزار اور سامان خرید کر غلام کے حوالے کیا اور اس کی مہارت فن کے ذریعے خوب مالی فوائد حاصل کرنے لگی۔ چند ہی دنوں میں خباب کی فنی مہارت کی شہرت مکے کی پوری آبادی میں پھیل گئی، اور لوگ کثرت سے ان کے پاس تلواریں خریدنے کے لیے آنے لگے، کیونکہ وہ ایک بہترین کاریگر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت دیانت دار اور صادق القول شخص تھا۔

خباب اپنی کم سنی اور نوجوانی کے باوجود نہایت صاحب فہم و فراست اور زیور عقل و دانش سے پورے طور پر آراستہ تھے، جب وہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر تنہائی میں ہوتے تو اکثر اس جاہلی معاشرہ کے متعلق سوچا کرتے جو اٹری سے چلی ہوئی فساد اور بگاڑ کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔ اور یہ دیکھ دیکھ کر کہ اہل عرب کی زندگی پر شدید قسم کی جہالت اور اندھی گمراہی مسلط ہے

جس کا ایک شکار وہ خود بھی ہیں۔ سخت گھبراہٹ میں مبتلا ہو جایا کرتے تھے اور بے ساختہ پکارا مٹھتے کہ ”ایک نہ ایک دن اس تاریک رات کا خاتمہ ہو کر رہے گا“ اور دل ہی دل میں اپنے لیے درازی عمر کی تمنا کرتے تاکہ اپنی آنکھوں سے جہالت و گمراہی کی اس تاریکی کو چھٹے اور علم و ہدایت کی روشنی کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھ لیں۔ اور جناب کو اس کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ان کی آرزو بہت جلد پوری ہو گئی۔ ان کے علم میں یہ بات آگئی کہ نور ہدایت کی شعاعیں بنی ہاشم کے ایک فرد محمد بن عبداللہ فدواہ ابی وامی، کے منہ سے نکل کر گرد و پیش کے شیر و تار ماحول کو منور کرنا شروع کر چکی ہیں۔ وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ ان کا پیغام سنا اور اس پیغام کے نور سے ان کا مکمل وجود از سر تا پایا جگمگا اٹھایا انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس بات کی شہادت دی کہ ”میرے واحد کے سوا کوئی دوسرا لائق پرستش و عبادت نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں“ اور اس طرح وہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے چھٹے شخص بن گئے۔ اور کہا جاتا ہے کہ حضرت جناب رضی اللہ عنہ پر ایک ایسا وقت بھی گزرا کہ وہ اسلام کا چھٹا حصہ تھے۔

حضرت جناب نے اپنے اسلام کو کسی سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے ام ایمنہ کو ان کے مسلمان ہونے کی خبر بہت جلد معلوم ہو گئی، اس خبر کو سننے ہی اس کے غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے اپنے بھائی سباع بن عبد العزیٰ کو ساتھ لیا۔ قبیلہ بنو خزاعہ کے کچھ اور نوجوان بھی اس کے ہمراہ ہو گئے۔ یہ سب لوگ حضرت جناب کے یہاں پہنچے۔ اس وقت وہ اپنے کام میں مشغول تھے۔ سباع نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”جناب تمہارے متعلق ہم کو ایک ایسی خبر ملی ہے جس پر یقین کرنا ہمارے لیے آسان نہیں ہے۔“

”کون سی خبر؟“ انھوں نے پوچھا۔

”یہ بات ہر طرف مشہور ہو رہی ہے کہ تم بے دین ہو گئے ہو، اور اپنے آباد اجداد کے دین کو ترک کر کے بنی ہاشم کے اس ”لوندے“ کی پیروی کرنے لگے ہو۔“ سباع نے غصے سے تیز ہوتے ہوئے کہا۔

”میں بے دین نہیں ہوا ہوں۔ میں تو اس الہ واحد پر ایمان لایا ہوں جس کا کوئی شریک و ہمہ نہیں اور میں نے تمہارے بتوں کی پرستش چھوڑ دی ہے اور اس بات کی گواہی دی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صدائے تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔“ حضرت خبابؓ نے نہایت پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

حضرت خبابؓ کے یہ الفاظ جیسے ہی سباع اور اس کے ساتھیوں کے کانوں میں پڑے۔ وہ یکایک ان پر پل پڑے اور ان کے اوپر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ اور جس کے ہاتھ میں جو چیز آگئی اسی سے مارنے لگا، چاہے وہ ہتھوڑا ہو یا لوہے کا ٹکڑا۔ وہ ان کو مارتے رہے یہاں تک کہ وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئے، اور ان کے جسم سے خون بہنے لگا۔

حضرت خبابؓ اور ام انمار کے مابین پیش آنے والے اس واقعے کی خبر پوسے مکے میں جنگل کی آگ کی طرح بڑی سرعت کے ساتھ پھیل گئی اور لوگ ان کی اس غیر معمولی جرات پر دنگ ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ اس سے پہلے انھوں نے پیروان محمدؐ میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں سنا تھا، کہ اس نے قبول اسلام کے بعد لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اس طرح صراحت اور چیلنج کے ساتھ اپنے اسلام کا اعلان کیا ہو۔ سردارانِ قریش ان کی اس غیر معمولی جرات اقدام پر سخت برہم ہوئے، کبھی ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ام انمار کے اس غلام کی طرح کا کوئی غلام جس کا نہ کوئی خاندان ہو، جو اس کی حمایت پر کمر بستہ

ہو اور نہ اس کا کوئی طرف دار ہو جو اس کو حفاظت اور پناہ فراہم کرے؛ اس حد تک جرات کا مظاہرہ کرے گا کہ اس کے قابو سے باہر ہو کر بر ملا اس کے معبودوں کی توہین کرے اور اس کے آبا و اجداد کے دین کو سفاہت و گمراہی قرار دے۔ اس واقعے نے قریش کو اس بات کا یقین دلایا کہ یہ ان کی زندگی کا بدترین دن ہے، اور ان کا یہ یقین کچھ غلط بھی نہ تھا۔ کیونکہ اس کے بعد ہی حضرت خبابؓ کی اس جرات سے ان کے ساتھیوں کے اندر بھی اس بات کا حوصلہ پیدا ہو گیا کہ وہ کھل کر اپنے اسلام کا اعلان کریں۔ چنانچہ انھوں نے یکے بعد دیگرے کلمہ حق کا علی الاعلان اظہار کرنا شروع کر دیا۔

ایک روز ابوسفیان بن حرب، ولید بن مغیرہ، ابو جہل بن ہشام اور دوسرے بہت سے شیوخ قریش بیت اللہ کے پاس ایک مجلس میں یکجا تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور ان کا پیغام ان کا موضوع گفتگو تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت روز بروز بڑھتی اور پھلتی جا رہی ہے اور ان کی مقبولیت میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے طے کیا کہ مرض کے ٹھہرنے سے پہلے ہی اس کا استیصال ناگزیر ہے اور وہ متفقہ طور پر اس بات کا فیصلہ کر کے اس مجلس سے اٹھے کہ ہر شخص اپنے قبیلے کے ان افراد کو جنہوں نے محمدؐ کی پیروی اختیار کی ہے، ایسی دردناک اور عبرت انگیز سزا دے کہ یا تو وہ اپنے اس نئے دین کو ترک کر کے پرانے دین کی طرف پلٹ آئیں یا موت ان کی زندگی کا چراغ گل کر دے۔

اس فیصلے کی رو سے حضرت خبابؓ کو ستانے کی ذمہ داری سابع بن عبدالعزیٰ اور اس کے قبیلے بنو خزاعہ پر عائد ہوئی۔ چنانچہ عین دوپہر میں جب دھوپ کی تہاڑ اپنے شباب پر ہوتی ہے۔ اور زمین پر سورج کی تیز اور گرم کرنوں سے تپ کر تواتر

جاتی ہے، یہ لوگ حضرت خبابؓ کو مکے سے باہر سنگلاخ میدان میں نکال کر لے جاتے، ان کے جسم سے کپڑے اُتار کر انھیں لوہے کی زرہ پہنا دیتے اور تیز چلچلاتی دھوپ میں جلتی ہوئی ریت پر کھڑا کر دیتے۔ مزید برآں ان پر پانی بھی بند کر دیتے، یہاں تک کہ جب ان کی تکلیف اپنی انتہا کو پہنچ جاتی تو ان سے پوچھتے:-
”محمدؐ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟“

”وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ ہدایت اور دین حق کے ساتھ تشریف لاتے ہیں تاکہ ہم لوگوں کو کفر و شرک کی ظلمت سے نکال کر ایمان و ہدایت کی روشنی میں داخل کریں،“ حضرت خبابؓ ان کو جواب دیتے۔ یہ سنتے ہی وہ لوگ بے تحاشا ان کو لاتوں اور مکوں سے مارنے لگتے اور پھر پوچھتے:-
”اور لات و عزی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“

”دوبت ہیں جو کسی کی بات سننے اور اس کا جواب دینے سے قاصر ہیں، نہ کسی کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں نہ اس کو کوئی فائدہ دے سکتے....“
اتنا سننے ہی وہ آس پاس پڑے ہوئے گرم گرم پتھر اٹھا لاتے اور ان پتھروں کو ان کی پیٹھ سے چپکا دیتے۔ اور انھیں چپکائے رہتے یہاں تک کہ ان کے کندھے سے چربی پگھل کر بہنے لگتی۔

اور اُم انمار حضرت خبابؓ کے لیے اپنے بھائی سباع سے کچھ کم سنگ دل نہ تھی۔ ایک روز اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خبابؓ کی دکان کی طرف سے گزرتے اور ان سے بات کرتے دیکھ لیا وہ غصے سے دیوانی ہو گئی۔ اب وہ روزانہ ان کے یہاں آتی اور بھٹی میں سے دہکتا ہوا لوہا ان کے سر پر رکھ دیتی۔ ان کا سر جلنے لگتا اور وہ بیہوش ہو کر گر جاتے اور افاقہ ہونے پر اس کے اور اس کے بھائی کے حق میں بددعا کرتے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو ہجرت مدینہ کی اجازت مرحمت فرمائی تو حضرت خبابؓ نے بھی اس کی تیاری کر لی۔ لیکن انہوں نے مکہ کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اللہ تعالیٰ نے ام انمار کے حق میں ان کی بددعا کو قبول نہیں کر لیا۔ وہ شدید قسم کے درد سر میں مبتلا ہو گئی۔ ایسے درد میں جس کی تکلیف ناقابل برداشت تھی اور جس کی مثال کبھی سننے میں نہیں آئی تھی۔ وہ شدت درد کے مارے کتے کی طرح چیختی تھی۔ اس کے لڑکے مختلف جگہوں پر اس کا علاج کرتے پھرے، مگر کہیں افاقے کی کوئی صورت نہیں نظر آئی۔ ان سے بتایا کہ اس درد سے نجات کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ اس کے سر کو برابر آگ سے داغا جاتا ہے۔ اطباء کی ہدایت کے مطابق اس کے سر کو گرم لوہے سے داغا جانے لگا۔ اس سے اس کو اتنی شدید قسم کی تکلیف ہوتی کہ وہ اپنے درد سر کی تکلیف کو بھول جاتی۔

مدینہ میں انصار کی یہاں نوازی اور ان کے لطف و کرم سے حضرت خبابؓ نے اس سکون و راحت کا مزہ چکھا جس سے وہ مدت دراز تک محروم رہے۔ یہاں آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب و دیدار سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ اور اب ان کے سکون کو پر اگندہ اور ان کے اطمینان کو منتشر کرنے والی کوئی چیز نہ تھی، وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معرکہ بدر میں شریک ہوئے اور ان کے زیر علم انہوں نے مشرکین کے ساتھ قتال میں حصہ لیا۔ نیز انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جنگ احد میں بھی شرکت کی اور وہاں ام انمار کے بھائی سباع بن عبد العزیٰ کو شیر خدا حضرت حمزہ ابن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میدان جنگ میں زمین پر پھینکا ہوا اور خون میں لت پت دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ حضرت خبابؓ نے طویل عمر پائی۔ انہوں نے چاروں خلفاء راشدین کا مبارک اور مثالی زمانہ دیکھا اور ان کے زیر سایہ عزت و شہرت کی زندگی گزاری۔ ایک

دن وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ان کے پاس پہنچے تو خلیفہؓ نے ان کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا برتاؤ کیا۔ ان کو اونچی جگہ پر بٹھایا اور ان سے فرمایا :

”بلاں کے سوا اس جگہ پر بیٹھنے کا مستحق تم سے زیادہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔“ پھر ان سے مشرکین کے ہاتھوں جھیلی ہوئی سب سے زیادہ دردناک اور تکلیف دہ اذیت کے بارے میں دریافت کیا۔ پہلے تو وہ جواب دینے سے ہچکچائے مگر حضرت عمرؓ کے شدید اصرار پر انہوں نے اپنی پیٹھ سے چادر سرکادی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے دیکھ کر چونک اٹھے اور بولے، یہ کیسے ہوا؟ تو حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ”ایک دن مشرکین نے آگ جلا کر انگارے تیار کیے، پھر انہوں نے میرے جسم سے کپڑے اتار دیے اور مجھے ان انگاروں پر لٹا کر گھسیٹتے رہے یہاں تک کہ میری پیٹھ کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو گیا اور جسم سے نکلی ہوئی چربی نے ان انگاروں کو سرد کر دیا۔“

حضرت خبابؓ نے پہلے افلاس اور تنگدستی کی زندگی گزاری تھی لیکن اپنی عمر کے آخری نصف حصے میں وہ کافی مالدار ہو گئے تھے۔ وہ اس قدر سیم و زر اور مال و دولت کے مالک تھے کہ شاید اس کا تصور انہوں نے خواب و خیال میں بھی نہ کیا ہوگا۔ لیکن انہوں نے اس مال میں اس طرح تصرف کیا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ انہوں نے اپنی دولت گھر کے ایک حصے میں رکھ دی تھی جس کو تمام حاجتمند اور سارے فقراء و مساکین جانتے تھے۔ انہوں نے نہ تو اس مال کی حفاظت و نگرانی کا کوئی نظم رکھا نہ اس پر تالا لگایا۔ ضرور تمند اس میں سے جتنا چاہتے لے جاتے، اس کے باوجود وہ ہمیشہ اس اندیشے میں مبتلا اور اس بات سے خوفزدہ رہتے کہ ان سے اس مال کا حساب لیا جائے گا اور اس کے سبب سے ان کو عذاب دیا جائے گا۔

ان کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ ہم لوگ خوابؓ کے مرض الموت میں ان کی عیادت کے لیے گئے، تو انھوں نے کہا کہ اس جگہ اسی ہزار درہم ہیں۔ اور خدا کی قسم نہ تو میں نے اس پر کبھی کوئی روک ٹوک کی نہ کبھی کسی کو اس میں سے لینے سے منع کیا، اتنا کہہ کر وہ رونے لگے۔ جب ہم نے ان سے رونے کا سبب دریافت کیا تو بولے کہ ”میرے بہت سے ساتھی اس طرح دنیا سے گزر گئے کہ انھوں نے اپنے اعمال کا کوئی دنیاوی فائدہ نہیں حاصل کیا۔ لیکن میں زندہ رہا اور اس قدر دولت و جائیداد میرے ہاتھ آئی کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ میرے اعمال کا اجر نہ ہو۔“

جب حضرت خوابؓ کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ اپنے رب رحیم و کریم کے جوار رحمت میں پہنچ گئے تو امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان کی قبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

”رَحِمَ اللهُ خَبَابًا - فَقَدْ اسَلَّمَ دَاعِبًا
 وَهَاجَرَ طَالِعًا وَعَاشَ مُجَاهِدًا
 وَلَنْ يُضِيْعَ اللهُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ
 عَمَلًا -“

”اللہ تعالیٰ خوابؓ پر رحم فرمائے۔ انھوں نے بہ رضا و رغبت اسلام قبول کیا، اپنی خوشی سے ہجرت کی اور ایک مجاہد کی زندگی گزاری۔ اور اللہ تعالیٰ اچھا عمل کرنے والے کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

حضرت ربیع بن زیاد حارثی رضی اللہ عنہ

ایک طرف تو شہر رسول مدینہ منورہ، خلیفہ اول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مقابل پر ملاں پر اپنے مسلسل بہتے ہوئے اشکہائے غم کو پونچھنے میں مصروف تھا۔ دوسری طرف مختلف علاقوں کے وفود ان کے جانشین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر سخط و رضا ہر حال میں بیعتِ خلافت کرنے کے لیے پے درپے مدینہ پہنچ رہے تھے۔

ایک صبح کو اہل بحرین کا وفد بعض دوسرے قبائل کے وفد کے ساتھ بارگاہِ خلافت میں بیعت کے لیے حاضر ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ارکانِ وفد کے ساتھ گفتگو کے بیچ مشتاق رہتے تھے۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے ان کی گفتگو میں انہیں کوئی عمدہ نصیحت کوئی مفید مشورہ، کوئی فکر انگیز گوشہ یا اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب اور عام مسلمانوں کے خیر و فلاح اور ہمدردی کی کوئی بات مل جائے۔ چنانچہ انھوں نے حاضرین میں سے متعدد لوگوں کو گفتگو کے لیے اپنے پاس بلایا۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی کوئی خاص اور اہم بات نہیں کہی۔ تب وہ ایک ایسے شخص کی طرف متوجہ ہوئے جس کے چہرے بشرے سے وہ پہلے ہی اندازہ کر چکے تھے کہ اس سے ضرور کوئی مفید اور قیمتی بات مل سکے گی۔ اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اس سے گفتگو کا آغاز کرنے کی فرمائش کی۔ خلیفہ رضی اللہ عنہ کی اجازت پا کر اس شخص نے

پہلے ہدلے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر اپنی گفتگو ان الفاظ سے شروع کی۔

”امیر المؤمنین! امت کے معاملات کی ذمہ داری سپرد کر کے خدا سے عز و جل نے آپ کو ایک زبردست آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ تو آپ خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہمیشہ اُس سے ڈرتے رہیے۔ اور یہ جان لیجئے کہ اگر دریا فرات کے کنارے بھی کوئی ایک بکری ضائع ہوگئی تو قیامت کے دن اس کے متعلق آپ سے باز پرس کی جائے گی۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس شخص کی یہ بات سن کر رو پڑے۔ ان کی آواز بلند ہوگئی اور پھر اس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد سے اب تک کسی نے مجھ سے ایسی سچی بات نہیں کہی جیسی کہ تم نے کہی ہے۔“

”تم کون ہو؟“

”میں ربیع بن زیاد حارثی ہوں۔“ اُس شخص نے جواب دیا۔

”ہاں بڑے بن زیاد کے بھائی؟“ خلیفہ نے دریافت کیا۔

”جی ہاں“ حضرت ربیع نے کہا۔

اس کے بعد جب مجلس برخاست ہوئی تو خلیفہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ اور ان سے تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ

”ربیع بن زیاد کے حالات کی پوری تفتیش کرو۔ اگر یہ اپنی اس بات میں مخلص اور بے لوث ہیں جو انھوں نے مجھ سے کہی ہے تو یہ بڑی خوبیوں کے مالک اور بڑے کام کے آدمی ہیں اور امور خلافت کی ادائیگی کے سلسلے میں ہمیں ان سے بہت زیادہ تعاون و امداد کی توقع ہے تم کوئی ذمہ داری ان کے سپرد کر کے

ان کے حالات سے مجھے برابر آگاہ کرتے رہنا۔“

اس کے چند ہی دنوں کے بعد حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کی ایما پر صوبہ ابواز میں واقع شہر ”مناذر“ کی فتح کے لیے ایک فوج ترتیب دی اور اس میں حضرت ربیعؓ اور ان کے بھائی ہاجرؓ کو بھی شامل کر لیا۔ حضرت ابو موسیٰؓ فوج لے کر روانہ ہوئے اور آگے بڑھ کر انھوں نے مناذر کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے کے دوران اُس کے باشندوں کے ساتھ متعدد ایسی زبردست معرکہ آرائیاں ہوئیں جن کی نظیر جنگوں کی تاریخ میں شاید ونا در ہی پیش آئی ہوگی۔ ان لڑائیوں میں ایک طرف تو مشرکین نے بے مثال اور غیر معمولی جرات و مردانگی اور ناقابل تصور استقلال و ثبات قدمی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دوسری طرف بے اندازہ اور کثیر تعداد میں مسلمان سپاہی شہید ہوئے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور مسلمان روزہ رکھ کر جنگ میں شریک تھے حضرت ربیعؓ کے بھائی حضرت ہاجرؓ بن زیاد نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی طرف سے کثیر تعداد میں سپاہی قتل ہو چکے ہیں تو انھوں نے خدا کی رضا کی طلب میں اپنی جان نثار کر دینے کی قسم کھائی۔ پھر انھوں نے اپنے جسم پر حنوط ملا، کفن پہنا اور اپنے بھائی کو وصیت کی..... یہ دیکھ کر حضرت ربیع بن زیادؓ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا۔

”ہاجرؓ حالتِ صوم ہی میں اپنی جان راہِ خدا میں نثار کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اور مسلمانوں کے اوپر جنگ اور روزے کی دوہری سختیاں جمع ہو گئی ہیں، جن کی وجہ سے ان کے عزائم کمزور پڑ گئے ہیں اور ان کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی وہ روزہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ تو آپ اس سلسلہ میں سوچ سمجھ کر کوئی مناسب قدم اٹھانے کا فیصلہ کیجئے۔“

یہ سن کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے فوج سے پکار کر کہا۔ ”مسلمانو! میں ہر روزہ دار کو قسم دلاتا ہوں کہ یا تو وہ روزہ چھوڑ دے یا جنگ سے الگ ہو جائے۔“

پھر انھوں نے خود لوٹے سے (جوان کے پاس تھا) پانی پی کر اپنا روزہ انقطاعاً کر لیا تاکہ دوسرے لوگ بھی ان کو پانی پیتے دیکھ کر اپنے روزے چھوڑ دیں۔ جب حضرت مہاجر نے ان کا یہ اعلان سنا تو انھوں نے ایک گھونٹ پانی پی کر کہا۔ ”خدا کی قسم میں نے پیاس کے مارے پانی نہیں پیا ہے بلکہ اپنے امیر کی قسم پوری کی ہے۔“

پھر انھوں نے اپنی تلوار بے نیام کی اور بے خوف و خطر دشمن پر پل پڑے اور اس کی صفوں کو چیرتے اور آدمیوں کو پھپھارتے چلے گئے۔ جب وہ دشمن کی فوج میں کافی اندر تک گھس گئے تو انھوں نے ہر طرف سے ان کو گھیر لیا اور آگے پیچھے ہر طرف سے ان کے اوپر تلواروں کی بارش کر دی، جس سے وہ زخمی ہو کر گر پڑے۔ پھر دشمن نے ان کا سرتن سے جدا کیا اور اُسے لے جا کر میدان جنگ میں ایک اونچے ٹیلے پر گاڑ دیا۔ حضرت ربیع بن زیادؓ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کتنے سعادت مند اور قابل فخر ہیں آپ اور کتنا عمدہ ٹھکانا ہے آپ کا خدا کی قسم اگر اللہ نے چاہا تو میں آپ کا اور تمام مسلمان شہدار کا انتقام لے کے رہوں گا۔“

جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اپنے بھائی کے غم میں حضرت ربیع بن زیادؓ کی اس بے قراری اور ان کے اضطراب کی کیفیت کو دیکھا اور دشمن کے خلاف ان کے سینے میں بھرتی ہوئی آتش غیظ و غضب کا انھیں احساس ہوا تو وہ فوج کی قیادت سے دست بردار ہو گئے اور اس کی کمان حضرت ربیع

بن زیاد کو سونپ کر خود "سوس" فتح کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔
 حضرت ربیعؓ اپنی فوج کو لے کر مشرکین پر آندھی اور سیلاب بن کر ٹوٹ
 پڑے۔ دشمن ان کے حملے کی تاب نہ لاسکا، اس کی صفیں درہم برہم ہو گئیں اور اس
 کی قوت مقاومت جواب دے گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو "مناذر" پر زبردست
 فتح عنایت فرمائی۔ انھوں نے لڑنے والوں کو قتل کر دیا اور عورتوں، بچوں کو
 گرفتار کر کے بوندی غلام بنا لیا۔ اس جنگ میں بے شمار مال غنیمت بھی ان کے ہاتھ آیا۔
 معرکہ "مناذر" کے بعد حضرت ربیعؓ کا ستارہ اقبال پوری آب و تاب
 کے ساتھ جگمگا اٹھا۔ اور ہر طرف ان کا شہرہ پھیل گیا۔ وہ ان نامور قائدین میں
 شمار ہونے لگے جن کے ناموں کے ساتھ عظیم الشان کارنامے وابستہ ہیں۔ چنانچہ
 جب مسلمانوں نے سیستان فتح کرنے کا ارادہ کیا تو اس فوج کی قیادت انھیں کے
 سپرد کی گئی۔ سب کو اس بات کی توقع تھی کہ فتح و کامرانی ان کے ہم رکاب ہوگی۔
 حضرت ربیع بن زیادؓ غازیان فی سبیل اللہ کا لشکر لیے ہوتے سیستان
 کی طرف روانہ ہوتے۔ دوران سفر انھیں دو سو چھپس میل لمبے اس دشوار گزار اور
 پرنخطر صحرا کو عبور کرنا پڑا جس کو پار کرنے سے صحرا کے باسی، وحشی درندے بھی
 عاجز تھے۔ اس خوفناک اور بھیانک صحرا کو عبور کرنے کے بعد حدود سجستان
 پر سب سے پہلا شہر جو ان کے سامنے آیا وہ "رستاق زائق" تھا۔ اس کی
 آبادی عالی شان محلات و قصور پر مشتمل تھی۔ پورا شہر چاروں طرف سے بلند
 اور مضبوط مستحکم فصیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس میں غلوں، پھلوں اور مال و
 دولت کی بے حد فراوانی تھی۔

ذہین اور دانا قائد حضرت ربیع بن زیاد رضی اللہ عنہ نے وہاں پہنچنے سے
 پہلے ہی رستاق زائق میں اپنے جاسوس پھیلا دیے تھے ان جاسوسوں کے

ذریعے ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ لوگ اپنی عید "ہرجان" کے موقع پر عنقریب ایک محفل میں جمع ہونے والے ہیں۔ حضرت ربیعؓ اس مناسب موقع کے منتظر رہے اور آخر کار عید "ہرجان" کی رات میں اچانک بے خبری کی حالت میں حملہ کر کے انھیں تلواروں کی دھاہ پر رکھ لیا اور بزور شمشیر "رستاق زائق" پر قابض ہو گئے۔ اس موقع پر ان میں سے بیس ہزار آدمیوں کو گرفتار کر کے انھیں لونڈی، غلام بنالیا۔ اور ان کے بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ قیدیوں میں کسی زمیندار کا ایک غلام بھی تھا۔ مسلمانوں نے اس کو اس حال میں گرفتار کیا تھا کہ اس نے اپنے آقا کے پاس لے جانے کے لیے تین لاکھ کی خیر رقم جمع کر رکھی تھی۔ حضرت ربیعؓ نے اس سے پوچھا کہ،

"اتنا سارا مال تم نے کہاں سے جمع کیا؟"

"اپنے آقا کے صرف ایک گاؤں سے۔" غلام نے جواب دیا۔

"صرف ایک گاؤں سے اتنی ساری آمدنی ہوتی ہے؟" حضرت ربیعؓ نے

دوبارہ سوال کیا۔

"ہاں" غلام نے جواب میں کہا۔

"وہ کس طرح؟" حضرت ربیعؓ نے پھر دریافت کیا۔

"ہماری کلہاڑیوں، ہماری درانیتوں اور ہماری محنتوں کی بدولت" غلام نے جواباً عرض کیا۔ جب جنگ ختم ہو گئی اور زمیندار اپنا اور اپنے اہل و عیال کا فدیہ ادا کرنے کے لیے حضرت ربیعؓ کی خدمت میں باریاب ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ "اگر تم مسلمانوں کے لیے کسی بڑی رقم کی پیشکش کرو تو میں تمہارا فدیہ قبول کر سکتا ہوں۔"

اس نے پوچھا "آپ کتنی رقم چاہتے ہیں؟"

”میں یہ نیزہ زمین میں گاڑ دیتا ہوں۔ تم اس کو سونے چاندی سے ڈھک دو۔“
حضرت ربیعؓ نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔
”آپ کی یہ شرط مجھے منظور ہے۔“ زمیندار نے اپنی رضا مندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے اپنے خزانے سے سونے، چاندی کے ڈھیر نکالے اور اس نیزے پر ڈالتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ چھپ گیا۔

حضرت ربیع بن زیاد اپنی فوج کے ساتھ سرزمین بھستان میں کافی دور تک اندر گھسنے چلے گئے اور ہر جگہ فتح و کامرانی نے ان کا استقبال کیا۔ دشمن کے قلعے ان کے گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے اس طرح گرتے چلے گئے جیسے بادِ خزاں کے جھونکوں سے درختوں کے سوکھے پتے گرتے ہیں۔ اور قبل اس کے کہ ان کے سامنے تلواریں بے نیام ہوں، شہروں اور دیہاتوں کے باشندوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ جلد از جلد اپنے لیے امان حاصل کر لیں۔ اس طرح حضرت ربیعؓ علاقوں پر علاقے فتح کرتے اور کامرانی و کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے بھستان کے پایہ تخت ”زرنگ“ تک جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ دشمن ان سے مقابلہ کرنے کے لیے پورے ساز و سامان کے ساتھ تیار اور زبردست جمعیت فراہم کر کے پیش قدمی کرتے پر آمادہ ہے اور اس بات کا عزم بالجزم کر رکھا ہے کہ انہیں اس بڑے شہر سے مار بھگائے گا اور ان کی فوج کو بھستان سے واپس جانے پر مجبور کر دے گا، خواہ اس کے لیے اس کو کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ پھر ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان ایسی خوں ریز اور ہلاکت آفریں معرکہ آرائی ہوئی جس نے فریقین کو پس کر رکھ دیا۔ اس جنگ میں جانبین میں سے کسی نے بھی اپنے آدمیوں کی قربانی دینے میں کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لیا۔

لیکن پھر جنگ کا پانسہ پلٹا اور جب مسلمانوں کی فتح کے ابتدائی آثار ظاہر ہوئے تو ایرانی سپہ سالار "پرویز" نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ جب تک اس کے پاس طاقت بچی ہوئی ہے، حضرت ربیعؓ کے ساتھ صلح کی کوشش شروع کر دے، ممکن ہے کہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے لیے بہتر شرائط پر صلح کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اپنا ایک قاصد حضرت ربیعؓ بن زیاد کے پاس بھیجا اور ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس سے ملاقات کے لیے کسی مناسب جگہ اور وقت کا تعین فرمادیں تاکہ وہ ان سے صلح کی بات چیت کر سکے۔ حضرت ربیعؓ نے اس کی یہ بات منظور فرمائی۔ قاصد کے واپس جانے کے بعد انھوں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ "پرویز" کے استقبال کے لیے ایک موزوں جگہ کا انتخاب کریں۔ اور ان سے یہ بھی کہا کہ ان کی نشست گاہ کے چاروں طرف ایرانی مقتولین کی لاشوں کے ڈھیر لگادیں اور اس کی گزرگاہ کے دونوں جانب اس کے فوجیوں کی لاشیں غیر مرتب طور پر بکھیر دیں۔

حضرت ربیعؓ نہایت بارعجب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا قلباً، سر پر، رنگ گندمی اور ڈیل ڈیل ایسا زبردست تھا کہ دیکھنے والا ان سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جب "پرویز" صلح کی گفتگو کرنے کے لیے ان کے پاس پہنچا تو مرعوبیت کی وجہ سے محقر ہقر کا بیٹے لگا اور لاشوں کے اس منظر کو دیکھ کر خوف ہراس کے مارے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے اوپر اس طرح خون مسلط ہو گیا کہ وہ حضرت ربیعؓ کے قریب آنے اور آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ دُور ہی کھڑے ہو کر ہنکلاتے ہوئے اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے خوشامداندہ انداز میں ان سے بات کی اور اس شرط پر صلح کی خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کو ایک ہزار غلام پیش کرے گا جن میں سے ہر ایک کے سر پر ایک

سنہرا جام ہوگا۔ حضرت ربیع نے اس کی یہ پیشکش قبول فرما کر اس کے ساتھ صلح کر لی۔ اور دوسرے دن وہ اس شان سے شہر میں داخل ہوئے کہ غلاموں کی جماعت ان کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھی اور پوری نضا مسلمانوں کی تہلیل و تکبیر کے فلک بوس نعروں سے گونج رہی تھی۔

حضرت ربیع بن زیاد رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک شمشیر برہنہ تھے جس سے وہ دشمنانِ خدا پر حملہ آور ہوتے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے بہت سے علاقے فتح کیے اور مختلف صوبوں کی گورنری کے فرائض انجام دیے، یہاں تک کہ جب بنو امیہ کی حکومت کا دور آیا تو حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے انھیں خراسان کا گورنر بنا دیا۔ حالانکہ وہ دل سے اس فہم داری کو انجام دینے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کی کراہت و ناپسندیدگی میں اس بات نے مزید اضافہ کر دیا کہ بنو امیہ کی حکومت کے ایک نہایت اہم اور ذمہ دار رکن "زیاد بن ابیہ" نے جب ان کو لکھا کہ

"امیر المومنین حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کا حکم ہے کہ جنگ میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت میں سے سونے اور چاندی کو مرکزی بیت المال کے لیے مخصوص کر دو۔ اور ان کے علاوہ باقی چیزیں مجاہدین میں تقسیم کرو۔"

تو انھوں نے اس کے جواب میں تحریر کیا کہ،
 "تم نے امیر المومنین کی طرف سے جو بات لکھی ہے۔ کتاب اللہ کا حکم اس کے خلاف ہے۔" پھر انھوں نے فوج میں اعلان کر دیا کہ سب لوگ اگر مالِ غنیمت میں سے اپنے اپنے حصے لے جائیں، اس کے بعد انھوں نے خمس دارالخلافہ "دمشق" بھجوادیا۔

اس خطا کے موصول ہونے کے اگلے دن جمعہ تھا۔ حضرت ربیع نے

سفید کپڑے پہنے، نماز جمعہ کے لیے مسجد تشریف لائے جمعہ کا خطبہ دیا اور خطبہ کے بعد فرمایا کہ

”لوگو! اب میں زندگی سے بے زار ہو چکا ہوں۔ میں ایک دُعا کرتا ہوں۔ آپ سب لوگ میری اس دعا پر آمین کہیں؛ پھر انہوں نے دعا کی ”ہدایا! اگر تو میرے حق میں کسی خیر کا ارادہ رکھتا ہے تو مجھے جلد از جلد اپنے پاس بلا لے“ حاضرین مجلس نے آمین کہی، اور اُس روز کا سورج ابھی آسمان میں غروب نہیں ہوا تھا کہ جرات و شجاعت اور عزم و حوصلہ کا یہ نیر تاباں سرزمین خراسان میں رُخ پوش ہو چکا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ

تخصیص بن سلام مدینے کے ایک بڑے یہودی عالم، ادیان و مملکت میں اختلاف کے باوجود تمام باشندگانِ مدینہ کے نزدیک قابلِ احترام لوگوں میں اپنی پرہیزگاری اور صالحیت کی وجہ سے معروف اور اپنی راست روی اور راست گوئی کے سبب اچھی شہرت کے حامل تھے۔ وہ ایک خاموش طبع شخص تھے اور نہایت پرسکون، مطمئن اور سنجیدہ زندگی گزارتے تھے۔ ان کی زندگی نیکیوں میں سسگرم اور لوگوں کی نفع رسانی کے لیے وقف تھی۔ انہوں نے اپنے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصہ کلیسا میں وعظ و نصیحت اور عبادت کے لیے، ایک حصہ اپنے باغ میں درختوں کی کاٹ چھانٹ اور ان کی پیوندکاری کے لیے اور ایک حصہ توراہ کے مطالعہ اور تفقہ فی الدین کے لیے۔ وہ جب بھی توراہ کا مطالعہ کرتے بیٹھے تو ان مقامات پر رک کر دیر تک غور و فکر کرتے جہاں مکے میں مبعوث ہونے والے اس نبی کی بشارت ہوتی جو انبیاء سابقین کے پیغامات کی تکمیل اور ان کے سلسلے کو ختم کرنے والا تھا۔ وہ اس آنے والے نبی کے اوصاف اور اس کی علامات کی چھان بین کرتے اور اس بات پر خوشی سے مجھوم اٹھتے کہ وہ اپنے شہر سے ہجرت کر کے یثرب کو اپنا مستقر بنائے گا۔ وہ توراہ میں جب بھی ان خبروں

کو پڑھتے یا ان کا خیال دل میں گزرتا تو یہی دعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ انھیں عمر کی اتنی مہلت عطا فرمائے کہ وہ اس نبی مُنْتَظَر کے ظہور کا مشاہدہ کر سکیں، اس کی ملاقات کی سعادت سے بہرہ ور ہو سکیں اور اس پر ایمان لانے والوں کے پہلے زُمرے میں شامل ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے حُصَيْن بن سلام کی اس دعا کو شرفِ قبولیت سے نوازتے ہوئے ان کی عمر کو نبی رحمت کی بعثت تک دراز کر دیا اور ان کے مقدر میں یہ بات لکھ دی گئی کہ وہ اس کی ملاقات اور صحبت سے بہرہ مند ہوں اور اس حق پر ایمان لائیں جو اس پر نازل کیا گیا تھا۔ ہم یہ بات حُصَيْن بن سلام ہی پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنے ایمان لانے کا قصہ خود ہی بیان کریں کیونکہ وہی اس کو زیادہ بہتر اندازہ میں پیش کر سکتے ہیں۔

”جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی خبر سنی تو ان کے نام و نسب، ان کی صفات اور ان کے زمانہ ظہور اور مقام بعثت کا موازنہ ان باتوں سے کیا جو ہماری کتاب توراہ میں ان کے متعلق درج تھیں۔ نتیجہً مجھے ان کی نبوت کا یقین ہو گیا اور ان کی دعوت کی صداقت میرے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ کہنے کے بجائے میں نے اپنی زبان کو سختی کے ساتھ بند رکھا، یہاں تک کہ وہ دن آ گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب آپ نے میثرب پہنچ کر قبا میں قیام فرمایا تو وہاں سے ایک آدمی ہماری طرف آیا جو آپ کی تشریف آوری کا اعلان کر رہا تھا۔ اس وقت میں کھجور کے ایک درخت پر چڑھا ہوا کچھ کام کر رہا تھا۔ اور میری پھوپھی خالدہ بنتِ حارث اس کے نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے یہ خبر سُننے ہی زور زور سے اللہ اکبر... اللہ اکبر

کی صدا بلند کی۔ پھوپھی نے میری تکبیر کی آواز سن کر کہا۔
 ”اللہ تجھے نامراد کرے، اگر تو موسیٰ ابن عمران کی آمد کی خبر سنتا تو
 اس سے زیادہ کچھ نہ کرتا۔“

میں نے ان سے کہا۔ ”پھوپھی جان! خدا کی قسم یہ موسیٰ ابن عمران کے
 بھائی اور انھیں کے دین پر ہیں، یہ بھی وہی دین لے کر آئے ہیں جس کو وہ
 لاتے تھے۔“

انھوں نے کہا۔ ”کیا یہ وہی نبی ہیں جن کے بارے میں تم ہمیں بتایا کرتے
 تھے کہ وہ اپنے سے پہلے انبیاء کی تصدیق اور اپنے رب کے پیغامات کی تکمیل
 کرنے کے لیے مبعوث ہوں گے؟“

”ہاں“ میں نے جواب دیا۔

”تب ٹھیک ہے“ انھوں نے کہا۔

پھر میں کسی تاخیر کے بغیر اسی دم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چل
 پڑا۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد آپ کے دروازے پر جمع
 ہے۔ میں اس ہجوم میں شامل ہو کر آپ کے قریب پہنچا تو سب سے پہلی بات
 جو میں نے آپ کی زبان مبارک سے سنی وہ یہ تھی۔

”اَيُّهَا النَّاسُ! اِنْشُوا السَّلَامَ، وَ
 اطْعِمُوا الطَّعَامَ، صَلُّوا بِاللَّيْلِ وَ
 النَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ
 بِسَلَامٍ۔“

”لوگو! سلام کو عام کرو، بھوکوں کو
 کھلانا کھلاؤ، رات کو نماز پڑھو جب
 کہ لوگ سو رہے ہوں، سلامتی کے
 ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔“

میں نے آپ کے چہرے پر تجسس بھری نظر ڈالی اور دیر تک اسے
 دیکھتا رہا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کا چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے۔ پھر

جب میں نے قریب جا کر کلمہ توحید و رسالت کی گواہی دی تو آپ نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا۔

”تمہارا کیا نام ہے؟“

”تحصین بن سلام“ میں نے جواب دیا۔

”نہیں، بلکہ تم عبد اللہ بن سلام ہو“ آپ نے فرمایا۔

میں نے کہا ”ہاں، عبد اللہ بن سلام، قسم اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، میں پسند نہیں کرتا کہ آج کے بعد اس کے سوا میرا کوئی دوسرا نام رہے۔“

پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے واپس جا کر گھر میں اپنے بیوی بچوں اور دیگر افرادِ خانہ کو اسلام کی دعوت دی اور سب نے اسے قبول کر لیا۔ ان کے ساتھ میری بھوپھی بھی دائرۃ اسلام میں داخل ہو گئیں جو اس وقت کافی ضعیف العمر تھیں۔ پھر میں نے سب کو تاکید کر دی کہ جب تک میں اجازت نہ دوں، میرے اور اپنے قبول اسلام کی خبر کو یہودیوں سے پوشیدہ رکھنا۔ اس کے بعد میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس پہنچ کر ان سے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول! یہ یہودی بڑے بہتان طراز اور باطل پرست لوگ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کے سرداروں اور رئیسوں کو اپنے پاس بلا لیں اور مجھے اپنے کسی حجرے میں چھپادیں اور ان سے دریافت فرمائیں کہ ان کے نزدیک میرا کیا مقام و مرتبہ ہے۔ پھر قبل اس کے کہ ان کو میرے مسلمان ہونے کی خبر معلوم ہو، انھیں اسلام کی دعوت دیں۔ کیونکہ اگر ان کو اس بات کا علم ہو گیا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں تو وہ میرے اوپر طرح طرح کے

عیب لگائیں گے، ہر قسم کی کوتاہیوں کو میری طرف منسوب کریں گے اور الزام تراشی سے کام لیں گے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجہ کو ایک حجرے میں چھپانے کے بعد ان کو اپنے پاس بلوایا اور انہیں اسلام قبول کرنے پر ابھارا، ایمان کی رغبت دلائی اور ان تمام باتوں کی یاد دہانی کرائی جن کو وہ اپنی کتابوں کے ذریعے جانتے تھے۔ لیکن انہوں نے آپ کی بات مان کر نہ دی بلکہ اللٹا حق کے معاملے میں باطل طریقے سے آپ کے ساتھ جھگڑنے لگے۔ میں حجرے میں بیٹھا ان کی وہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قبول اسلام سے مایوس ہو گئے تو آپ نے ان سے پوچھا۔

”حصین بن سلام کا تمہارے یہاں کیا مقام و مرتبہ ہے؟“

وہ بولے۔ ”وہ ہمارے سردار، پیشوا اور عالم ہیں۔ وہ ہمارے سردار، پیشوا اور عالم کے بیٹے ہیں۔“

”اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو تمہارا کیا خیال ہے، تم بھی اس کو قبول کر لو گے؟“ آپ نے ان سے دریافت فرمایا۔

”حاشا دکلا۔ بھلا وہ کیوں اسلام قبول کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس بات سے پناہ میں رکھے کہ وہ اسلام کو اختیار کریں!“ انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

ان کی یہ بات سن کر میں حجرے سے باہر نکلا اور ان سے کہا۔

”اے گروہ یہود! اللہ سے ڈرو اور اس حق کو تسلیم کر لو جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لاتے ہیں۔ خدا کی قسم تم خوب جانتے ہو کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ تم ان کے نام اور ان کے اوصاف کو توراہ میں لکھا ہوا پاتے

ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، میں ان کے اوپر ایمان لاتا ہوں، ان کی تصدیق کرتا ہوں اور ان کو خوب اچھی طرح سے پہچانتا ہوں۔“

مگر انھوں نے کہا۔ ”تم نے جھوٹ کہا۔ خدا کی قسم تم ہم میں سب سے زیادہ بُرے، سب سے بُرے آدمی کے بیٹے اور سب سے زیادہ جاہل شخص کے لڑکے ہو۔“ انھوں نے کوئی ایسا عیب نہیں چھوڑا جس کا الزام میرے اوپر نہ لگایا ہو۔ تب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا۔

”میں نے آپ سے عرض نہیں کیا تھا کہ یہ یہودی بُرے بہتان پرداز، باطل پرست اور غدار و فاجر لوگ ہیں۔“

حضرت عبداللہ بن سلام اسلام کی طرف اس طرح متوجہ ہونے جیسے کوئی تشذب بڑی بے تابی کے ساتھ چشمہ آب کی طرف لپکتا ہے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کو اپنے اوپر اس طرح لازم کر لیا کہ کبھی اس سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ قرآن کے ایسے گرویدہ ہو گئے کہ ان کی زبان ہر وقت اس کی آیاتِ بینات کی تلاوت سے تر رہتی تھی۔ اور انھوں نے اپنے آپ کو جنت میں لے جانے والے اعمال کے واسطے یوں وقف کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنت کی بشارت دیدی۔ ایک ایسی بشارت جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں مشہور ہو گئی۔ اس بشارت کے پس منظر میں ایک قصہ ہے جس کو قیس بن عبادہ وغیرہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

”ایک دفعہ میں مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے اندر ایک علمی مجلس میں شریک تھا۔ اس مجلس میں ایک بزرگ بھی بیٹھے ہوئے تھے جن کو دیکھنے

سے رُوح کو سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ وہ لوگوں سے نہایت شیریں اور موثر باتیں کر رہے تھے۔ جب مجلس برخواست ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو اہل مجلس نے کہا۔

”جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہتا ہو، وہ انہیں دیکھ لے۔“

میں نے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں تو ان لوگوں نے بتایا کہ یہ عبداللہ بن سلام ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ان کے پیچھے پیچھے جاؤں گا۔ چنانچہ میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ وہ چلتے رہے یہاں تک کہ شہر کے آخری سرے پر پہنچ کر اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ میں نے ان سے اندر آنے کی اجازت طلب کی، جو مجھے مل گئی۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

”بھتیجے! تمہاری کیا ضرورت ہے؟“

”جب آپ مسجد سے نکلے تو میں نے لوگوں کو آپ کے متعلق یہ کہنے سنا کہ ”جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہے وہ ان کو دیکھ لے“ اس لیے میں آپ کے ساتھ آیا ہوں کہ آپ کے حالات سے واقفیت حاصل کروں اور یہ معلوم کر سکوں کہ لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ اہل جنت میں سے ہیں۔“ میں نے اپنی غرض بتائی۔

”بیٹے! یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جنتی کون ہے؟“ انہوں نے ارشاد فرمایا۔

”ہاں، یہ بات تو صحیح ہے لیکن لوگوں نے جو کچھ کہا، اس کا کوئی سبب تو ضرور ہوگا۔“ میں نے عرض کیا۔

”میں تم کو اس کا سبب بتاتا ہوں،“ انہوں نے فرمایا۔

”ارشاد فرمائیے، اللہ آپ کو جزا بخیر دے۔“ میں نے اپنے شوق کا

اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کی بات ہے“ انھوں نے بیان شروع کیا ”کہ میں ایک رات کو سویا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی نے آکر مجھ سے کہا کہ اٹھو۔ چنانچہ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑا چلتے چلتے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بائیں جانب ایک راستہ جا رہا تھا۔ جب میں نے اس راستے کی طرف مڑنا چاہا تو اس نے مجھ سے کہا کہ اسے چھوڑو۔ یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ پھر میں نے آگے دیکھا تو داہنی سمت میں ایک نہایت واضح اور صاف راستہ نظر آیا۔ اس نے مجھ سے کہا اس راستے سے آگے چلو۔ میں اس راستے پر ہولیا اور آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ایک باغ میں جا پہنچا۔ وہ باغ نہایت وسیع و عریض، سرسبز و شاداب اور دلکش و خوشنما تھا۔ اس میں ہر طرف طاہرانِ خوش الحان نغمہ ریز تھے۔ اس باغ کے بیچوں بیچ لوہے کا ایک ستون نصب تھا جس کی جڑ زمین میں پیوست تھی اور اس کا سر آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے اوپر سونے کا ایک حلقہ تھا۔ اس آدمی نے مجھ سے کہا کہ اس پر چڑھ جاؤ۔ میں نے کہا میں نہیں چڑھ سکوں گا۔ تب میرے پاس ایک خادم آیا۔ اس نے مجھے اوپر اٹھایا اور میں اس کی مدد سے اس پر چڑھتا ہوا آخری سرے تک پہنچ گیا اور حلقے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور صبح تک اسے پکڑے رہا۔“

سویرے جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا یہ خواب بیان کیا تو آپ نے فرمایا۔

”جو راستہ تم نے بائیں طرف دیکھا تھا، وہ اصحابِ شمال (اہلِ دوزخ)

کارا سہ تھا۔ اور جو راسہ تم کو داہنی جانب نظر آیا تھا وہ اصحاب
 الیمین (اہل جنت) کا راسہ تھا۔ اور وہ باغ جس کی شادابی اور رونق
 تم کو دلکش معلوم ہوئی، وہ اسلام تھا۔ اور اس کے وسط میں بوستون
 تھا وہ دین کاستون تھا۔ اور اس کے اوپر جو حلقہ تھا وہ عروہ دینی (مضبوط
 حلقہ) تھا۔ اور تم اس حلقے کو زندگی کی آخری سانس تک مضبوطی کے ساتھ
 تھامے رہو گے۔“



حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ

ایک صبح قریش مکہ خوف و دہشت کے مارے ہڑبڑا کر نیند سے بیدار ہوئے کیونکہ ان کی تمام مجالس میں یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رات کی تاریکی میں مکہ چھوڑ کر چلے گئے، لیکن قریش کے سردار کسی قیمت پر اس خبر کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ بڑی سرگرمی کے ساتھ نبی ہاشم اور اصحاب محمدؐ کے ایک ایک گھر میں ان کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ جب وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر کی تلاشی لینے پہنچے اور ان کی صاحب زادی "اسمار" گھر سے نکل کر ان کے سامنے آئیں تو ابو جہل نے ان کے پوچھا۔

”لڑکی تیرا باپ کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کہاں ہیں“ انھوں نے جواب دیا۔

ان کے اس جواب پر وہ آگ بگولہ ہو گیا اور ہاتھ اٹھا کر ان کے چہرے پر ایسا زور دار تھپڑ مارا کہ ان کی بالی کان سے نکل کر زمین پر گر پڑی۔

جب قریش کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی مکہ چھوڑ کر نکل گئے ہیں تو ان کا جنون اپنی تمام حدوں کو پار کر گیا۔ اور انھوں نے کھوجیوں اور سراغ رسانیوں کو اس راستے کی نشان دہی کے کام پر لگا دیا جس سے

وہ گزرے ہیں۔ وہ خود بھی ان کے ساتھ تلاش میں نکل پڑے۔ تلاش کرتے کرتے جب وہ غارِ ثور تک پہنچے تو سراغ رسالوں نے کہا کہ تمہارا مطلوبہ شخص اس غار سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ اور ان کی یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیقِ سفر واقعی اسی غار کے اندر تھے اور قریش ان کے سروں پر کھڑے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب ان کے قدموں کو غار کے اوپر حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اوپر ایک عتاب آمیز اور محبت بھری نگاہ ڈالی تو انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”خدا کی قسم، میں اپنی جان کے خوف سے نہیں رو رہا ہوں بلکہ مجھے اس خوف سے رونا آ رہا ہے کہ کہیں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔“

”ابوبکر! گھبراؤ نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“ آپ نے پورے اطمینان کے ساتھ کہا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے دل پر اطمینان و سکون نازل کر دیا۔ اور وہ قریش کے قدموں کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔

”اے اللہ کے رسول! اگر ان میں سے کسی کی نظر اپنے پاؤں پر پڑ گئی تو وہ ہم کو ضرور دیکھ لے گا۔“

”ابوبکر! ان دو شخصوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ تعالیٰ ہو؟“ آپ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

اور اسی وقت انہوں نے ایک قریشی نوجوان کو یہ کہتے ہوئے سنا: ”آؤ چلیں، غار کے اندر چل کر دیکھیں۔ لیکن امیہ ابن خلف نے اس کی بات کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔“

”کیا تم اس بکڑی کو نہیں دیکھ رہے ہو جس نے غار کے مُنہ پر جالاتان رکھا ہے؟ خدا کی قسم یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش سے بھی پرانا ہے۔“
البتہ اس وقت ابو جہل نے کہا۔

”لات دعزبی کی قسم، میرا خیال ہے کہ وہ یہیں، کہیں ہم سے قریب ہی موجود ہیں۔ وہ ہماری سب باتیں سن رہے ہیں اور ہماری ساری کارروائیاں دیکھ رہے ہیں لیکن ان کے جادو نے ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔“
تاہم قریش کے لوگ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش سے دست بردار ہوئے نہ ان کا تعاقب کرنے کے ارادے سے باز آئے۔ چنانچہ انھوں نے مکہ اور مدینہ کے درمیان طویل راستوں پر پھیلے ہوئے قبائل میں یہ اعلان کر دیا کہ ”جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مردہ یا زندہ کسی حالت میں ان کے سامنے پیش کرے گا، اس کو انعام کے طور پر ایک سو بہترین اونٹ دیے جائیں گے۔“

سراقہ ابن مالک مد لحنی مکہ کے قریب ”قدید“ کے مقام پر اپنے قبیلے کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسی دوران قریش کا ایک قاصد وہاں پہنچا اور اس نے ان کے سامنے اس بڑے انعام کا اعلان کیا جس کو قریش نے اس شخص کے لیے رکھا تھا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زندہ یا مردہ کسی حالت میں ان کے سامنے پیش کرے۔ انعام کے سوا اونٹوں کا یہ اعلان سننے ہی سراقہ کے دل میں حرص نے سر اٹھایا اور اس کو انھیں حاصل کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور اس کے متعلق ایک لفظ بھی اپنی زبان پر نہیں آنے دیا کہ کہیں دوسرے لوگوں کے دل میں بھی اس کا خیال نہ پیدا ہو جائے۔ اور قبل اس کے کہ سراقہ اس مجلس سے اٹھتا اس کے قبیلے کے ایک

شخص نے آکر اطلاع دی کہ ”خدا کی قسم! ابھی میرے سامنے سے تین آدمی گزرے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ابو بکر اور ان کا راہبر ہیں۔“ مگر سراقہ نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

”ہنیں، وہ فلاں قبیلے کے لوگ ہیں جو اپنی ایک گمشدہ اونٹنی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

”شاید وہی ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ شخص خاموش ہو گیا۔

پھر سراقہ اس خیال سے کچھ دیر تک وہاں ٹھہرا رہا کہ کہیں اس کے اٹھنے سے اہل مجلس کو کوئی شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ جب لوگ دوسرے موضوع پر گفتگو کرنے میں مصروف ہو گئے تو وہ دھیرے سے وہاں سے کھسک آیا اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر پہنچ کر اس نے چپکے سے اپنی نوٹدی سے کہا کہ وہ اس کے گھوڑے کو لوگوں کی نظروں سے بچا کر لے جائے اور اسے وادی کے نشیبی حصے میں باندھ دے۔ اور اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ اس کے ہتھیار گھر کے پیچھے سے نکال کر لے جائے تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے اور انھیں گھوڑے کے قریب ہی کہیں رکھ دے۔

سراقہ نے اپنی زرہ پہنی، بدن پر ہتھیار سجائے اور گھوڑے پر سوار ہو کر اسے سرپٹ چھوڑ دیا تاکہ قبل اس کے کوئی دوسرا شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر کے قریش کا مقرر کردہ انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے وہ خود ان کو پکڑ لے۔

سراقہ اپنے قبیلے کے معدودے چند ماہر شہسواروں اور مشہور بہادروں میں تھا۔ اس کا قلبا اور سرکافی بڑا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار سراغ رساں،

کامیاب قیافہ شناس، حضرات کے بالمقابل ثابت قدم رہنے والا، نہایت ہوشیار و عقل مند اور ایک اچھا شاعر تھا۔ اور اس کا گھوڑا بہت عمدہ نسل کا تھا۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ قطع مسافت کرتا ہوا اپنی دھن میں مگن منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ اس کی پشت سے نیچے آ رہا۔ اس نے اسے بدشگونی پر محمول کیا اور دل میں کہا ”یہ کیا ہے“ اور گھوڑے کو بڑا بھلا کہتا ہوا اس پر سوار ہو گیا۔ گھوڑی دور جلتے جلتے گھوڑے کو دوبارہ ٹھوکر لگی۔ اس نے اور زیادہ بدشگونی محسوس کی اور واپسی کا ارادہ کرنے لگا لیکن سو اونٹوں کی لالچ نے اس کو اس ارادے سے باز رکھا۔

سراقہ اس جگہ سے — جہاں اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تھی — ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اس کی نگاہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی پر جا پڑیں۔ اس نے اپنا ہاتھ کمان کی طرف بڑھایا لیکن وہ اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا۔ کیونکہ اس نے دیکھا کہ اس کے گھوڑے کی ٹانگیں زمین میں دھن رہی ہیں اور سامنے سے ڈھواں اٹھ کر اس کی اور گھوڑے کی آنکھوں کے سامنے عائل ہو رہا ہے۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی مگر اس کے پاؤں اس طرح مضبوطی کے ساتھ زمین میں پیوست ہو گئے تھے جیسے ان میں لوہے کی میخیں ٹھونک دی گئی ہوں۔ تب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق کی طرف متوجہ ہو کر عاجزانہ لہجے میں کہا۔

”میری بات سنیے۔ آپ دونوں اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ میرے گھوڑے کی ٹانگیں زمین سے نکال دے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے تعاقب سے باز آ جاؤں گا۔“

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا کر دی اور اللہ تعالیٰ

نے اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین سے نکال دیے۔ لیکن اس کا لالچ از سر نو حرکت میں آگیا اور اس نے گھوڑے کو جوں ہی ان کی طرف بڑھایا، اس کی ٹانگیں اب کی بار پہلے سے زیادہ دھنس گئیں۔ اس نے پھر ان دونوں کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے کہا۔

”آپ میرا زاہراہ، سامان و اسباب اور میرے اسلحے لے لیں۔ میں خدا کو گواہ بنا کر اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ اپنے پیچھے آپ کے تعاقب میں آنے والوں کو واپس کر دوں گا،“ لیکن ان لوگوں نے جواب دیا۔

”ہمیں تمہارے زاہراہ اور سامان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم صرف ہمارا پیچھا کرنے والوں کو لوٹالے جانا۔“

پھر آپ نے اس کے لیے دعا کی اور گھوڑے کی ٹانگیں آزاد ہو گئیں۔ سڑاؤ نے واپسی سے پہلے ان لوگوں کو پکار کر کہا۔

”ذرا رکیے، مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ خدا کی قسم میری طرف سے اب کوئی ایسی حرکت نہیں صادر ہوگی جو آپ لوگوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔“

”تم ہم سے کیا کہنا چاہتے ہو؟“ انہوں نے رکتے ہوئے کہا۔

”محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) بخدا میں جانتا ہوں کہ دین اور اقتدار قائم ہو کر رہے گا۔ آپ مجھ سے اس بات کا عہد کیجئے کہ اس وقت جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا تو آپ مجھے عزت بخشیں گے۔ اور اس کے لیے مجھے ایک تحریر دیدیجئے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا اور انہوں نے ایک چوڑی ہڈی پر یہ تحریر لکھ کر اس کے حوالے کر دی۔ اور جب

وہ واپس جانے لگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”سُرّاقہ! اس وقت تم کیسا محسوس کرو گے جب تم کسریٰ کے کھٹکن پہنو گے؟“

”کسریٰ ابن ہرْمَز کے؟“ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں، ہاں، کسریٰ ابن ہرْمَز کے۔“ آپ نے جواب دیا۔

اس کے بعد سُرّاقہ اپنے قبیلے میں لوٹ آیا۔ اس نے دیکھا کہ لوگ بڑی سرگرمی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں مصروف ہیں تو ان سے کہا۔

”واپس لوٹ چلو، میں نے ان کی تلاش میں زمین کا چپّہ چپّہ چھان مارا ہے۔ اور تم لوگ سُرّاقہ رسانی میں میری مہارت سے ناواقف نہیں ہو“ اور وہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ اس نے رسول اللہ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کے ساتھ اپنی اس ملاقات اور باہم طے ہونے والے عہد و پیمان کو پوشیدہ رکھا۔ جب اس کو یقین ہو گیا کہ وہ لوگ قریش کی دسترس سے بچ کر اپنے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں تب اس کا انکشاف کیا۔ جنت ابو جہل نے یہ خبر سنی اور اس کے عدم تعاون، بزدلی اور اتنا زریں موقع ضائع کر دینے پر اس کی ملامت کی تو اس کا جواب دیتے ہوئے سُرّاقہ نے کہا۔

”ابوا لحکم! اگر تم اس واقعے کو دیکھتے جو میرے گھوڑے کے ساتھ پیش آیا تھا، جب اس کے پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے، تو تم کسی ریب و شک کے بغیر یہ جان لیتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دلیل و برہان کے ساتھ

أَبَا حَكْمٍ وَاللَّهِ لَوَكُنْتُ شَاهِدًا
لَأَمْرٍ بَعَادِي إِذْ تَسُوخُ
قَوَائِمُهُ عَلِمْتُ وَلَكِنْ
تَشْكُ بَانَ مَحْسَدًا
رَسُولٌ يَبْرُهُانِ فَمَنْ ذَا

يُقَادِمُهُ
اللہ کے رسول ہیں پھر ایسی صورت میں کون ہے
جو ان کے سامنے تابِ مقاومت رکھتا ہے؟

زمانہ اپنی معمول کی رفتار سے گردش کرتا رہا۔ سورج مشرق سے طلوع ہوتا
اور مغرب میں ڈوبتا رہا۔ دن، مہینوں میں اور پہینے سالوں میں بدلتے رہے یہاں
تک کہ وہ وقت آگیا جب وہی محمدؐ۔ جو بے یار و مددگار، بے کسی اور لا
چارگی کی حالت میں رات کی تاریکی میں چھپ کر مکے سے نکلے تھے۔
ہزاروں حکمتی تلواروں اور گندم گوں نیزوں کی جھڑپ میں فاتحانہ انداز سے اس میں
داخل ہو رہے تھے۔ اور قریش کے وہ بڑے بڑے مغرور سردار اور اس کے
عظیم المرتبت معبر زعماء جنہوں نے زمین کو اپنے ظلم و جبر سے بھر دیا تھا۔ خوف و
دہشت سے لرزہ بر اندام ان کے سامنے کھڑے، دامن پارسارے رحم و کرم کی بھیک
مانگ رہے تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ آپ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔
اور وہ انبیائی عفو و درگزر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”إِذْ هَبُوا فَاثَمَّ الطَّلَقَاءُ۔“ جاؤ، تم پر کوئی دار و گیر نہیں ہے۔ آج تم سب

آزاد ہو۔“

اس وقت سراقہ نے اپنی سواری تیار کی اور اس پر سوار ہو کر چل پڑا تاکہ
بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر دائرۃ اسلام میں داخل ہونے کا اعلان کرے۔
اس وقت اس کے ہاتھ میں وہ تحریری عہد نامہ تھا جو دس سال پہلے آپ نے
اس کو لکھ کر دیا تھا۔ سراقہ بیان کرتے ہیں۔

”میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا
جب آپ مقام ”حِمْزَانَ“ پر قیام پذیر تھے۔ میں اسلامی فوج کے ایک دستے
میں داخل ہوا جو انصاری سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ وہ مجھ کو اپنے نیزوں کے

بچھلے بیروں سے مار مار کر کہہ رہے تھے۔ ”ڈور ہٹ، ڈور ہٹ، کیا چاہتا ہے“ لیکن میں برابر ان کی صفوں کو چیر کر آگے بڑھتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت آپ اپنی اونٹنی پر تشریف فرما تھے۔ میں نے عہد نامے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے بلند کرتے ہوئے کہا۔

”اے اللہ کے رسول! میں سراقہ ابن مالک ہوں اور یہ وہ تحریر ہے جو آپ نے مجھے لکھ کر دی تھی۔“

تو آپ نے فرمایا۔

”اَدْنُ مِنِّي يَا سُرَاقَةَ اَدْنُ... سراقہ! میرے قریب آؤ... میرے قریب
هَذَا يَوْمٌ وَقَاءٌ وَبِئْسَ... یہ ایفاء عہد اور حسن سلوک کا

دن ہے۔“

پھر میں نے سامنے پہنچ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا اور آپ کے احسان اور حسن سلوک سے بہرہ یاب ہوا۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت سراقہ ابن مالک رضی اللہ عنہ کی اس ملاقات کو ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے جوار رحمت میں بلا لیا۔ حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر بے حد غم گین ہوئے اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس روز کا منظر گردش کرنے لگا جب انھوں نے سو اونٹوں کے لالچ میں آکر آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور آج یہ حال ہے کہ دنیا کے سارے اونٹوں کی حیثیت ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناخن کے ایک تراشے کے برابر بھی نہیں تھی۔ وہ بار بار حضور کی اس بات کو دہرا رہے تھے۔

”كَيْفَ بَكَ يَا سُرَاقَةَ إِذَا الْبَسْتَ... سراقہ! اس وقت تمہاری کیا کیفیت

سوارِی کسری - ہوگی جب تم کسری کے کنگن پہنو گے؟“
 اور ان کو اس بات میں ذرہ برابر شک و شبہ نہیں تھا کہ ایک دن وہ انھیں
 ضرور پہنیں گے۔

زمانے کی گردش نے حالات و واقعات میں انقلاب و تبدیلی کے اپنے
 عمل کو مسلسل جاری رکھا یہاں تک کہ مسلمانوں کی خلافت کی ذمہ داری خلیفہ دوم
 حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر آپڑی۔ اور ان کے عہد مبارک
 میں مسلمانوں کی فوجیں آندھی طوفان کی طرح ایران کی سلطنت پر ٹوٹ پڑیں۔ وہ
 پے در پے قلعوں پر قلعے فتح کرتی، فوجوں کو شکست پر شکست دیتی، تختوں کو
 الٹتی اور اموالِ غنیمت سمیٹتی چلی جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے
 ہاتھوں شاہانِ کسری کی عظیم سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری زمانے کی بات ہے۔
 ایک روز حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے قاصد فتح کی بشارت لے کر دربارِ خلافت
 میں حاضر ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ مسلمانوں کے بیت المال کے لیے اُس مالِ
 غنیمت کا خمس بھی لائے تھے جس کو غازیانِ اسلام نے حاصل کیا تھا۔ جب وہ
 تمام چیزیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھی گئیں تو انھیں دیکھ کر حیران
 ششدر رہ گئے۔ ان چیزوں میں کسری کا وہ تاج تھا جو موتیوں سے مرصع
 تھا، اس کے وہ کپڑے تھے جن کے اوپر زرد دوزی کا کام ہوا تھا، اس کا وہ
 پمکا تھا جس میں جواہرات اور ہیرے جڑے ہوئے تھے، اس کے وہ کنگن
 تھے جن کے مثل کسی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور ان کے علاوہ دوسری
 بیشمار قیمتی اور نفیس چیزیں تھیں۔ حضرت عمر اس قیمتی خزانے کو ایک چھڑی

سے۔ جو اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی۔ الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
 ”جن لوگوں نے اس امانت کو ادا کیا ہے، یقیناً وہ انتہائی امانت دار لوگ ہیں۔“

خلیفہ کی یہ بات سُن کر حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے۔ جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ اُن سے کہا۔

”امیر المؤمنین! آپ نے لوگوں کے اموال پر دست درازی سے احتراز کیا اس لیے آپ کی رعایا بھی ان سے مُجْتَنِب رہی۔ اگر آپ ان کا مال غلط طریقے سے کھاتے تو وہ بھی کھاتی۔“

اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سُراقہ ابن مالک رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا، ان کو کسریٰ کی قمیص، اس کا پاجامہ، اس کی قبائر اور اس کے موزے پہنائے، اس کی تلوار اور پٹکا ان کی کمر میں باندھا اور اس کا تاج اُن کے سر پر رکھا۔ پھر دونوں کنگن، جی ہاں دونوں کنگن ان کے ہاتھوں میں پہنائے۔ اس وقت مسلمانوں نے بلند آواز سے نعرہ لگایا، اللہ اکبر... اللہ اکبر... اللہ اکبر.....

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف رُخ کرتے ہوئے فرمایا،
 ”واہ واہ..... خدا کی شان، بنی مدینہ کا ایک معمول بدو اور اس کے سر پر کسریٰ کا تاج اور ہاتھوں میں اس کے کنگن! اے،“
 پھر آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا۔

”خدا یا! تو نے یہ مال اپنے رسول کو نہیں دیا، حالانکہ وہ تیرے

نزدیک مجھ سے زیادہ محبوب و مکرم تھے۔ اور تو نے یہ مال ابو بکر رضی کو بھی نہیں دیا، حالانکہ وہ بھی تیرے نزدیک مجھ سے زیادہ محبوب و مکرم تھے اور تو نے یہ مال مجھ کو عطا فرمایا ہے۔ میرے معبود! میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ یہ مال تو نے مجھے اس کے فریب میں مبتلا کرنے کے لیے دیا ہو۔“

پھر جب تک انھوں نے وہ سارا مال مسلمانوں میں تقسیم نہیں کر لیا، اپنی جگہ سے نہیں اٹھے۔

حضرت فیروز دہلی رضی اللہ عنہ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور پورے جزیرۃ العرب میں آپ کی بیماری کی خبر مشہور ہو گئی تو یمن میں اسود غنسی، یامہ میں مسیلمہ کذاب اور بلادِ اسد میں ظلیحہ اسدی اسلام سے مرتد ہو گئے۔ اور ان تینوں کذابوں نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ وہ نبی ہیں اور بالکل اسی طرح اپنی اپنی قوموں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں جس طرح محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کو قریش کی طرف بھیجا گیا ہے۔

اسود غنسی ایک شعبدہ باز کاہن، بد باطن و شر پسند اور طاقت ور و قوی ہیکل شخص تھا۔ اس کے علاوہ وہ نہایت فصیح و بلیغ اور جادو بیان مقرر تھا۔ وہ اپنی قوتِ تقریر اور زورِ خطابت کے ذریعہ لوگوں کی عقلوں کو مسخر کر لیتا۔ وہ اتنا عنبر تھا کہ اپنی بے بنیاد اور جھوٹی باتوں کے سہارے عوام کے جذبات سے کھیلنے اور خواص کو مال و دولت اور جاہ و منصب کی طلب پر راہنہ گیری کرنے کی پوری قدرت رکھتا تھا۔ وہ لوگوں کے اوپر اپنی ہیبت طاری رکھنے کے لیے ہمیشہ ان کے سامنے نقاب پوش ہو کر نکلتا تھا۔

اس وقت یمن پر ”ابن ابی اسد“ کی حکومت تھی اور ان کے ہمراہ صحابی رسول

حضرت فیروز دہلی رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے آباء و اجداد ایرانی تھے اور ترک وطن کر کے یمن میں آباد ہو گئے تھے اور ان کی ماہیں عربیہ النسل تھیں۔ ان تارکین وطن کے سردار ”باذان“ ظہور اسلام کے وقت شاہ ایران کی طرف سے یمن کے حاکم تھے۔ جب رسول اللہ کی صداقت اور ان کی دعوت کی برتری ان کے سامنے واضح ہو گئی تو انھوں نے کسریٰ کی اطاعت کا قلابہ اپنی گردن سے اتار پھینکا اور اپنی قوم سمیت اللہ کے دین میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو اس منصب پر برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ اسود غنسی کے دعویٰ نبوت سے کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔

اسود غنسی کی دعوت پر جن لوگوں نے سب سے پہلے لبیک کہا، وہ اس کے اپنے قبیلے بنو مذحج کے لوگ تھے۔ اس نے ان کو لئے کر صنعا پر حملہ کیا اور اس کے حاکم ”شہر ابن باذان“ کو قتل کر کے ان کی بیوہ ”واذا“ سے شادی کر لی۔ پھر صنعا سے دوسرے علاقوں پر چڑھ دوڑا اور وہ سارے علاقے اس کے حملوں کی تاب نہ لا کر حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پے درپے اس کے آگے سرنگوں ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ حضرت موت سے طائف تک اور بحرین و احسا سے عدن تک کے سارے علاقے اس کے زیر نگیں آ گئے۔

لوگوں کو فریب دینے اور انھیں اپنی طرف مائل کرنے میں اسود غنسی کو سب سے زیادہ جس چیز سے تقویت ملی، وہ اس کی غیر معمولی عیاری تھی۔ وہ اپنے متبعین سے کہتا تھا کہ ایک فرشتہ اس کے پاس وحی لاتا اور اسے غیب کی باتوں سے آگاہ کرتا ہے۔ اور اس جھوٹے اور بے بنیاد دعوے کو ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنے جاسوسوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں، جنھیں اس نے اس غرض سے ہر طرف پھیلا رکھا تھا کہ وہ لوگوں کے حالات معلوم کریں، ان کی پوشیدہ

باتوں کی ٹوہ لگائیں، ان کی مشکلات سے آگاہ ہوں اور ان کے دلوں میں پیدا ہونے والی تمناؤں اور اُمیدوں سے واقفیت حاصل کریں اور پھر یہ ساری معلومات چپکے سے اس کے پاس پہنچا دیا کریں۔ پھر وہ جاسوسوں کی ان فراہم کردہ معلومات کے مطابق ہر ضرورت مند اور پریشان حال شخص سے اس کی ضرورت پریشانی کے لحاظ سے ملاقات اور گفتگو کا آغاز کرتا تھا۔ وہ اپنے متبعین کے سامنے ایسی ایسی عجیب و غریب چیزیں پیش کرتا کہ ان کی عقلیں دنگ رہ جاتیں۔ یہاں تک کہ اس کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی اور اس کی دعوت جنگل کی آگ کی طرح لوگوں کے اندر بڑی تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسود غنسی کے ارتداد اور یمن پر اس کے حملے کی خبر ہوئی تو آپ نے یمن میں اسلام کی طرف سبقت کرنے والے ان دس صحابہ کرام کو خطوط لکھے جن سے آپ کو خیر و تعاون کی اُمید تھی۔ ان خطوط میں آپ نے ایمان اور ہوشیاری کے ساتھ ان کو اس اندھے فتنے کا مقابلہ کرنے پر ابھارا اور ہر صورت میں اسود غنسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام جس کے پاس بھی پہنچا، اس نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور فی الفور اسے نافذ کرنے کے لیے حرکت میں آ گیا۔ اس دعوت پر لبیک کہنے والوں میں سب سے پیش پیش ہمارے اس قصے کے ہیرو فیروز دہلی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی تھے۔ ہم اس دل چسپ اور انوکھے قصے کو بیان کرنے کے لیے انھیں کے الفاظ مستعار لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

”میں نے اور ”ابنار“ میں سے میرے ساتھیوں نے نہ تو اسلام کی صداقت میں ایک لمحے کے لیے شک کیا نہ کسی کے دل میں دشمن خدا —

اسود غنسی کی تصدیق کا خیال، سدا ہوا، ملک بھر لگا، ۳۱، کر اور حاکم :

اور ہر ممکن طریقے سے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ جب ہمارے اور اصحاب سابقہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط پہنچے تو ہمیں ایک دوسرے سے بڑی تقویت ملی اور ہر شخص اپنے منصوبے کے مطابق اس پر عمل کرنے کے لیے سرگرم ہو گیا۔

اپنی غیر متوقع اور زبردست کامیابیوں کی وجہ سے اسود غنسی کے اندر غرور تکبر نے گھر کر لیا۔ اس نے اپنے سپہ سالار قیس بن عبد یغوث کے معاملے میں اپنا رویہ بدل دیا اور اس کے ساتھ رعوت سے پیش آنے لگا، یہاں تک کہ جب قیس کو اس کی طرف سے اپنی جان کا شدید خطرہ لاحق ہو گیا تو میں اپنے چچا زاد بھائی ”داؤدویہ“ کو ساتھ لے کر اس کے پاس گیا، اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا اور اس سے کہا کہ قبل اس کے کہ وہ ہمارے اوپر ہاتھ ڈالے، ہمیں اس کا کام تمام کر دینا چاہیے۔ اس نے ہماری دعوت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیا اور ہمارے سامنے اپنے دل کی باتیں ظاہر کرتے ہوئے ایسا محسوس کیا جیسے ہم تائید غیبی کی شکل میں اس کے اوپر آسمان سے نازل ہوئے ہیں۔ پھر ہم تینوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ ہم لوگ اس مرتد اور جھوٹے مدعی نبوت سے اندرونی طور پر نمٹیں گے اور ہمارے دوسرے بھائی باہر سے اس کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں اپنا رول ادا کریں گے۔ اور ہمارے درمیان یہ بات بھی طے ہوئی کہ ہم اس معاملے میں اپنی چچا زاد بہن ”داؤد“ کا تعاون بھی حاصل کریں گے جس سے اسود غنسی نے — اس کے شوہر ”شہرا بن باذان“ کو قتل کر کے — شادی کر لی ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے اسود غنسی کے محل میں جا کر اپنی چچا زاد بہن سے ملاقات کی اور اس سے کہا۔

”بہن! تم جانتی ہو کہ اس شخص نے ہمیں اور تم کو کیسی پریشانی اور تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس نے تمہارے خاوند کو قتل کیا، تمہاری قوم کی عورتوں کو رسوا اور بے عزت کیا، اس کے بہت سے افراد کو موت کے گھاٹ اتارا اور ان کے ہاتھ سے حکومت چھین لی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ہے جس میں آپ نے تمام اہل یمن اور خصوصیت کے ساتھ ہم لوگوں کو اس نقتے کی سرکوبی کا حکم دیا ہے، تو کیا تم اس میں ہمارے ساتھ تعاون کر سکتی ہو؟“

”میں کس چیز میں تمہارے ساتھ تعاون کروں؟“ اس نے دریافت کیا۔

”اس کے نکالنے میں“ میں نے جواب دیا۔

”نہیں، بلکہ اس کے قتل میں۔“ اس نے جواب دیا۔

”خدا کی قسم، میرا مقصد بھی یہی تھا لیکن یہ بات تمہارے سامنے کہنے سے ڈر رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”قسم اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے دین کی حقانیت اور اس کی صداقت کے متعلق شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی آدمی نہیں پیدا کیا ہے جو میرے نزدیک اس شیطان سے زیادہ قابلِ نفرت ہو۔ خدا کی قسم جب تم نے اس کو دیکھا ہے، اس کے بارے میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتی کہ یہ ایک فاجر اور بدکار شخص ہے جو نہ کسی حق کی رعایت کرتا ہے نہ کسی منکر کے ارتکاب سے باز رہتا ہے۔“

”ہمارے لیے اس کو قتل کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”وہ نہایت محتاط ہے اور اپنی حفاظت کے لیے اس نے سخت تدابیر لیں۔“

انتظام کر رکھا ہے۔ محل میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جس کو اس کے محافظوں نے اپنے گھیرے میں نہ لے رکھا ہو۔ البتہ اس دور والے کمرے کی — جس میں کوئی نہیں رہتا — نگرانی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اس کی پشت پر ایک بیابان ہے۔ تم رات کی تاریکی میں اس کمرے میں نقب لگاؤ۔ اس میں تم کو اسکو اور چراغ ملے گا۔ وہیں تم مجھے بھی اپنے انتظار میں پاؤ گے۔ پھر اس کی خواب گاہ میں داخل ہو کر اسے قتل کر دینا۔“ اس نے پوری اسکیم سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن ایسے محل کے کسی کمرے میں نقب لگانا سہل نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ادھر سے کسی آدمی کا گزر ہو اور وہ ہمیں دیکھ کر محافظوں کو آواز دیدے، پھر تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے“ میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”تمہارا یہ اندیشہ غلط نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلے میں میری ایک رائے ہے“ اس نے کہا۔

”وہ کیا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”کل تم اپنے کچھ قابل اعتماد آدمیوں کو کاریگروں اور مزدوروں کے مھیس میں میرے پاس بھیج دینا۔ میں ان سے کہہ کر اندرونی جانب سے کمرے میں نقب لگوا دوں گی، اس طرح نقب لگانے کا کام بہت تھوڑا سا بچ جائے گا جس کو تم لوگ باہر سے معمولی کوشش کر کے مکمل کر لو گے“ اس نے رائے دی۔

”تمہاری یہ رائے بہت مناسب اور معقول ہے“ میں نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد میں نے واپس جا کر اپنے دونوں ساتھیوں کو وہ ساری باتیں بتائیں جو میرے اور اس کے درمیان طے ہوئی تھیں۔ انھوں نے ان باتوں کو پسند کیا اور کامیابی کا دعا کیا۔ اور سہ اس وقت ان کی تیاروں میں لگ گئے۔ ہم نے اپنے

معاذین میں سے خاص خاص مسلمانوں کو ”کوڈ لفظ“ بتایا اور ان کو تیار رہنے کی تاکید کی اور ہم نے اس کے لیے صبح کا وقت طے کیا۔

جب رات کی سیاہ چادر پورے ماتول پر پھیل گئی تو وقت مقرر پر میں اپنے دونوں ساتھیوں سمیت نقب کی جگہ پر پہنچ گیا۔ ہم اس کو کھود کر کمرے میں داخل ہو گئے اور چراغ روشن کر کے ہتھیار سنبھالا اور اس دشمن خدا کے خاص کمرے کی جانب چل پڑے۔ میری چچا زاد پہلے ہی سے اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں بے دھڑک اس میں داخل ہو گیا۔ وہ گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے تلوار کی دھار اس کی گردن پر رکھ کر زور لگایا۔ پہلے تو وہ بیل کی طرح ڈکرایا پھر ذبح کیے ہوئے اونٹ کی طرح تڑپا۔ محافظوں نے اس کی آواز سنی تو یہ کہتے ہوئے اس کی خواب کی طرف دوڑے۔

”یہ کیسی آواز ہے؟“

”کچھ نہیں، اللہ کے نبی پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ تم لوگ اپنی جگہوں پر واپس جاؤ۔“ میری عمر ادا نے ان کو واپس بھیجتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ہم لوگ محل کے اندر ہی رہے۔ جب صبح طلوع ہوئی تو میں نے ایک فیصل پر چڑھ کر اذان دینا شروع کی۔

”اللَّهُ أَكْبَرُ... اللَّهُ أَكْبَرُ... أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ... أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا

رَسُولُ اللَّهِ... وَأَشْهَدُ أَنَّ الْأَسْوَدَ الْعَنَسِيَّ كَذَّابٌ۔ یہی ”کوڈ لفظ“ تھا۔

اس کو سنتے ہی مسلمان ہر طرف سے محل کی طرف بڑھے اور محافظ اذان کی آواز سن کر اس کی طرف لپکے اور دونوں فریق آپس میں بھڑ گئے۔ پھر میں نے اسود کا سر فیصل سے نیچے پھینک دیا جس کو دیکھ کر اس کے خامی کمزور پڑ گئے، ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں اور مسلمانوں نے نعرۂ تبکیر کے ساتھ دشمنوں پر ایک

زوردار حملہ کر دیا۔ اور طلوع آفتاب سے پہلے ہی سارا معاملہ نمٹ گیا۔
 دن ہوا تو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس دشمن خدا
 کے قتل کی خوش خبری پر شتمل ایک خط بھیجا۔ جب قاصد یہ بشارت لے کر
 مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج رات کو آپ کی وفات ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی
 ان کو یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وحی کے ذریعہ آپ کو اسود غنسی کے قتل کی بشارت
 اسی رات مل گئی تھی جس میں وہ قتل کیا گیا تھا۔ آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا
 تھا۔

”اسود غنسی کو گزشتہ رات قتل کر دیا گیا۔ اس کو ایک مبارک گھرانے
 کے مبارک شخص نے قتل کیا ہے۔“
 جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! وہ کون شخص ہے
 تو آپ نے فرمایا تھا

”فیروز، فیروز کامیاب ہو گئے۔“

حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ

حضرت ثابت بن قیس انصاری قبیلہ خزرج کے نمایاں سردار اور یشرب کے معدودے چند زعماء میں سے تھے۔ وہ نہایت ذہین، حاضر جواب، خوش بیان اور بلند آواز شخص تھے۔ جب بولتے تو محفل پر چھا جاتے اور جب تقریر کرتے تو سامعین کو مسحور کر لیتے۔ وہ یشرب کے ان افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ انہوں نے جیسے ہی نوجوان مکی داعی اسلام حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو اپنی پرسوز و دلکش آواز اور بلند و دلگداز لہجے میں قرآن حکیم کی تلاوت کرتے سنا، اس نے اپنی حلاوت تاثیر سے ان کی سماعت کو اسیر کر لیا، اپنے حسن بیان سے ان کے دل کو اپنے قابو میں کر لیا اور اپنی ہدایت و تشریح سے ان کی عقل کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے کو ایمان کے لیے کھول دیا اور پیغمبر اسلام کی جماعت میں شمولیت اختیار کر لینے کا وجہ سے ان کے ذکر کو بلند کر دیا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے اپنے قبیلے کے شہسواروں پر مشتمل ایک جماعت کے ساتھ آپ کا شاندار استقبال اور آپ کا اور آپ کے رفیق سفر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور آپ کے سامنے ایک

موثر تقریر کی جس کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کے نبیؐ پر درود و سلام سے اور اس کا اختتام ان الفاظ پر کیا۔

”اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپ سے اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ہم ہر اس چیز سے آپ کی حفاظت کریں گے جس سے اپنی، اپنی اولاد کی اور اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا چیز ملے گی؟“

جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جنت“

جنت کا لفظ جیسے ہی لوگوں کے پردہ سماعت سے ٹکرایا، ان کے چہرے فرط مسرت سے جگمگا اٹھے اور ان کی پیشانیاں خوشی سے دکنے لگیں اور سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

رضینا یا رسول اللہ... رضینا یا رسول اللہ...

... اور اس روز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت بن قیسؓ کو اپنا خطیب بنالیا جیسا کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ کے شاعر تھے۔ جب بھی عرب قبائل کے وفد اپنے فصیح البیان و مخطبا اور قادر الکلام شعراء کو لے کر مُفاخرہ یا مناظرہ کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے، آپ ان کے خطیبوں کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت ثابت بن قیسؓ کو اور ان کے شاعروں کا جواب دینے کے لیے حضرت حسان بن ثابتؓ کو طلب فرماتے تھے۔ حضرت ثابت بن قیسؓ بکے مومن، سچے متقی، اپنے رب سے ڈرنے والے اور ہر اس چیز سے سختی کے ساتھ اجتناب کرنے والے تھے جو اللہ تعالیٰ کو غضبناک کر دے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ بہت زیادہ خوفزدہ اور غمگین ہیں اور خوف و خشیت کے مارے کانپ رہے ہیں تو ان سے پوچھا۔

”ابو محمد! تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”اے اللہ کے رسول! ڈرتا ہوں، کہیں میں ہلاک نہ ہو جاؤں،“ انھوں نے جواب دیا۔

”وہ کیوں؟“ آپ نے دوبارہ سوال کیا۔

”اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کو ناکردہ اعمال پر تعریف کی خواہش کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اپنی تعریف اچھی لگتی ہے۔ اسی طرح اس نے خود پسندی سے بھی روکا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ میں خود کو پسند کرتا ہوں،“ انھوں نے جواب دیا۔

اس کے بعد آپ بڑی دیر تک ان کو تسلی دیتے رہے۔ پھر آخر میں ارشاد فرمایا۔

”یا ثابت! الّا تَرْضَىٰ اَنْ تَعِيشَ
تَحْمِيْدًا وَتُقْتَلَ بِشَهِيدًا اَوْ تَدْخُلَ
الْجَنَّةَ۔“

ثابت! کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تم
ایک قابل تعریف زندگی گزارو، شہید کی
موت مرو اور جنت میں داخل ہو جاؤ۔“

یہ مزید جانفز اسن کر حضرت ثابت کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا اور وہ بے ساختہ بول اٹھے۔

”بَلَىٰ يَا رَسُولَ اللّٰهِ... بَلَىٰ يَا رَسُولَ اللّٰهِ... کیوں نہیں لے اللہ کے رسول... کیوں نہیں۔“

آپ نے فرمایا، ”یہ چیزیں تمہیں حاصل ہوں گی،“

اور جب اللہ تعالیٰ کا قول،

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا صَوْتَكُمْ
فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا
لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز کو
نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبی کے
ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح

لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۝
 تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو،
 کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کر یا سب غارت
 ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو“ (حجرات: ۲)

نازل ہوا تو حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہما — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شدید
 محبت اور گہرے تعلق کے باوجود آپ کی مجالس سے کنارہ کش ہو کر اپنے گھر میں
 گوشہ نشین ہو گئے، یہاں تک کہ فرض نمازوں کی ادائیگی کے سوا دوسری کسی ضرورت
 سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق
 دریافت کرتے ہوئے فرمایا،
 ”ان کا حال مجھ کو کون بتا سکتا ہے؟“

تو ایک انصاری نے کہا، ”اے اللہ کے رسول! ان کی خبر میں آپ کو
 دے سکتا ہوں۔“
 اور جب وہ ان کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ اپنے گھر میں سرنگوں رنج و
 غم سے گھل رہے ہیں۔ اور جب ان سے پوچھا کہ ابو محمد! آپ کا کیا حال ہے
 تو انہوں نے جواب دیا۔

”بہت بُرا“ اور جب اس کا سبب دریافت کیا تو بولے:
 ”تم جانتے ہو کہ میری آواز اونچی ہے جو اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
 آواز سے بلند ہو جاتی ہے۔ اور اس کے متعلق قرآن میں جو کچھ نازل ہو چکا ہے
 وہ بھی تمہارے علم میں ہے۔ میں تو اپنے بارے میں یہی سمجھتا ہوں کہ میرے
 سارے اعمال رائیگاں ہو گئے اور میں اہل دوزخ میں سے ہوں،“
 انصاری صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آ کر
 جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، سب آپ کے گوش گزار کر دیا تو آپ نے ان سے فرمایا،

"جا کر ان سے کہہ دو کہ تم اہل جہنم میں سے نہیں بلکہ اہل جنت میں سے ہو۔" یہ ن کے لیے ایک غیر معمولی بشارت تھی جس کی اُمید وہ زندگی بھر کرتے رہے۔

حضرت ثابت بن قیسؓ غزوہ بدر کے سوا تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے۔ اور اس شہادت کی طلب میں۔ جس کی بشارت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دی تھی۔ جنگ کے خطرناک ترین معرکوں میں گھستے رہے مگر ہر بار وہ ان کے بالکل قریب سے ہو کر گزر جاتی اور وہ اسے حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے۔ یہاں تک کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں اور مسیلمہ کذاب کے درمیان مزہدین کے خلاف جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس وقت حضرت ثابت بن قیسؓ انصار کے علمبردار، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ مہاجرین کے سردار اور حضرت خالد بن ولیدؓ پوری فوج کے سپہ سالار تھے جس میں انصار و مہاجرین اور عرب بادیہ نشین سب شامل تھے۔

جنگ کے پہلے مرحلے کے بیشتر معرکوں میں قوتِ نوعلبہ کا توازنِ لشکر مجاہدین کے مقابلے میں مسیلمہ اور اس کے لشکر کی طرف تھا یہاں تک کہ وہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے خیمے میں داخل ہو گئے اور ان کی بیوی ام تیمم کو قتل کر دینا چاہا۔ انھوں نے خیمے کی طنائیں کاٹ ڈالیں اور اس کو بڑی طرح پھاڑ ڈالا۔ حضرت ثابتؓ نے اس روز مسلمانوں کی کمزوری اور ان کے انتشار و پراگندگی کے جو مناظر دیکھے اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع اور الزام تراشی کی جو باتیں سنیں، انھوں نے ان کے دل کو رنجِ دالم اور ان کے دل کو غم و اندوہ سے بھر دیا۔ اس وقت شہروں کے رہنے والے، بادیہ نشینوں پر بزدلی کا الزام لگا رہے تھے اور صحرا نشین شہریوں کو طعن دے رہے تھے کہ یہ ٹھیک سے نہیں لڑ رہے ہیں۔ اور انھیں کیا معلوم کہ جنگ کیسے لڑی جاتی ہے۔ اس

وقت حضرت ثابتؓ نے کفن سر سے باندھا اور مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہو کر ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

”مسلمانو! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اس طرح نہیں لڑا کرتے تھے۔ کتنی بڑی بے یہ حرکت کہ تم نے دشمن کو اپنے اوپر جرات کا موقع فراہم کیا اور کسی ناپسندیدہ ہے یہ بات کہ تم نے ان کے سامنے کم ہمتی اور پست حوصلگی کا ثبوت دیا۔“ پھر اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

”خدا یا! مسیلمہ اور اس کے متبعین نے جس شرک کا ارتکاب کیا ہے اور مسلمانوں نے جس کمزوری کا اظہار کیا ہے میں اس سے تیری جناب میں اپنی برأت اور لا تعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔“ پھر حضرت برار بن مالک انصاری، حضرت عمر کے بھائی حضرت زید بن خطاب اور حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہم جیسے مبارک و فرزندہ فال صحابہ کرام کے شانہ بشانہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے اور شجاعت و مردانگی کی ایسی مثال قائم کر دی جس نے مسلمانوں کے دلوں کو غیرت و حمیت اور دشمن کے سینوں کو جوٹ و رعب سے بھر دیا۔ وہ برابر لڑتے اور ہر ہتھیار سے مقابلہ کرتے رہے تا آنکہ زخموں سے چوڑ ہو کر میدان جنگ میں گر پڑے اور اس شہادت سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں جس کی بشارت ان کے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی اور اس فتح سے ان کا دل خوش ہو گیا جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے ذریعے عطا فرمائی۔

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے جسم پر ایک قیمتی زرہ تھی۔ ایک مسلمان اُدھر سے گزرا تو اس نے وہ زرہ ان کے جسم سے اتار کر اپنے پاس رکھ لی۔ ان کی شہادت کی اگلی رات کو ایک مسلمان نے ان کو خواب میں دیکھا، انھوں نے

اس سے کہا۔

”میں ثابت بن قیس ہوں۔ تم مجھے پہچانتے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں“ تو انہوں نے کہا۔

”میں تم کو ایک وصیت کر رہا ہوں۔ خبردار اس کو ایک خواب کی بات کہہ کر ٹال نہ دینا۔ کل جب میں قتل کر دیا گیا تو اس اسٹلے کے ایک مسلمان کا گزر میری طرف سے ہوا۔ اس نے میری زرہ اتار لی اور اسے اپنے خیمے میں — جو کیمپ کی فلاں سمت میں واقع ہے — لے گیا اور اس کو ایک ہانڈی کے نیچے رکھ کر اس کے اوپر سے کجاوہ رکھ دیا۔ تم خالد بن ولیدؓ کے پاس جا کر ان سے کہنا کہ وہ زرہ لینے کے لیے کسی آدمی کو اس کے پاس بھیج دیں۔ وہ زرہ ابھی تک اسی جگہ پر ہے۔ اور میں تم کو ایک دوسری وصیت بھی کر رہا ہوں۔ خبردار اس کو ایک سونے والے کا خواب سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا۔ خالد سے کہنا کہ جب آپ مدینہ میں خلیفہ کے پاس پہنچیں تو ان سے کہیں کہ ثابت بن قیس کے ذمے یہ، یہ قرضے ہیں۔ اور ان کے فلاں، فلاں غلام آزاد ہیں۔ وہ میرے قرضے ادا کر دیں اور میرے غلاموں کو آزاد کر دیں“

جب وہ آدمی نیند سے بیدار ہوا تو اس نے حضرت ولیدؓ کے پاس جا کر جو کچھ سنا اور دیکھا تھا سب ان کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے ایک آدمی کو زرہ لینے کے لیے بھیجا اور وہ اس کو اسی جگہ ملی جس کی نشاندہی انہوں نے کی تھی۔ چنانچہ اسے لا کر ان کے سامنے پیش کر دیا۔ اور جب حضرت خالد مدینہ واپس آئے تو انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے حضرت ثابتؓ کی بات بتائی اور ان کی وصیت بیان کی۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے ان کی وصیت کو نافذ کر دیا۔

حضرت ثابت بن قیس کے سوا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کے مرنے کے بعد کوئی وصیت نافذ کی گئی ہو۔ اللہ تعالیٰ حضرت ثابت بن قیس سے راضی ہو اور ان کو راضی کرے۔ اور اعلیٰ علیین میں ان کا ٹھکانہ بنا

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما

بہاری اس صحابیہ نے مجد و شرف کو ہر طرف سے سمیٹ رکھا تھا۔ ان کے والد، ان کے دادا، ان کی بہن، ان کے خاوند اور ان کے صاحبزادے، ان سب لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یابی کا ثروت حاصل تھا۔ ان کے والد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جو زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گہرے دوست اور وفات کے بعد آپ کے خلیفہ ہوئے۔ ان کے دادا حضرت ابو بکر کے والد ابو عتیق تھے۔ ان کی بہن ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت میں قرآن نازل ہوا۔ ان کے خاوند حواری رسول حضرت زبیر بن عوام اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم تھے۔ مختصراً اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا ہیں۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سابقین اسلام میں سے تھیں۔ سترہ مردوں اور اور عورتوں کے سوا اس فضل عظیم میں کسی دوسرے انسان کو ان کے اوپر سبقت نہیں حاصل تھی۔ ان کا لقب ”ذات النطاقین“ تھا۔ ان کا یہ لقب اس وجہ سے پڑا تھا کہ انھوں نے ہجرت مدینہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے والد کے لیے زاد سفر اور پانی کے مشکیزہ کا انتظام کیا اور جب ان دونوں چیزوں کو باندھنے کے لیے کوئی چیز نہیں ملی تو انھوں نے اپنے کمر بند کے دو

ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑے سے توشہ دان اور دوسرے سے مشکیزے کا منہ باندھ دیا۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس کے عوض ان کو جنت میں دو کمر بند عطا فرمائے۔ اسی وجہ سے ان کا لقب ”ذات النطاقین“ پڑ گیا۔

ان کی شادی حضرت زبیر بن عوام سے ہوئی تھی جو ایک مفلس نوجوان تھے۔ ان کے پاس نہ کوئی خادم تھا جو ان کی خدمت کرتا نہ ایک گھوڑے کے علاوہ کوئی مال تھا جسے وہ اپنے اہل و عیال پر فراوانی کے ساتھ خرچ کرتے۔ ایسی صورت میں حضرت اسماء ان کے لیے ایک بہترین رفیقہ حیات ثابت ہوئیں۔ وہ ان کی خدمت بھی کرتیں اور ان کے گھوڑے کی دیکھ بھال اور اس کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ اس کے چارے کے لیے کھجور کی گٹھلیاں بھی پیستی تھیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زبیر کو شادگی اور فراخی سے نواز دیا اور ان کا شمار مالدار ترین صحابہ کرام میں ہونے لگا۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کے اندر عمدہ خصائل، شریفانہ عادات و اطوار اور غیر معمولی عقل و خرد کے ساتھ ساتھ علم و بردباری کی جو بہترین خوبیاں یکجا تھیں وہ شاذ و نادر ہی کسی مرد میں بھی اکٹھا پائی جاتی ہیں۔ ان کی سخاوت و دریا دلی ضرب المثل تھی۔ ان کے صاحب زادے عبداللہ بن زبیر کا بیان ہے۔

”میں نے کبھی کسی دو عورتوں کو نہیں دیکھا جو میری خالہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور میری والدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے زیادہ فیاض ہوں۔ البتہ دونوں کی نیا ضی ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ میری خالہ کا حال یہ تھا کہ وہ چیزوں کو جمع کرتی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ جب ان کے پاس کافی چیزیں ہو جاتیں تو وہ انہیں ضرورت مندوں پر تقسیم کر دیا کرتی تھیں۔ لیکن میری والدہ کوئی چیز لگے روز کے لیے بچا کر

نہیں رکھتی تھیں۔“

اس کے علاوہ حضرت اسماء بڑی عقل مند اور دور اندیش خاتون تھیں اور مشکل حالات میں نہایت دانشمندانہ رویہ اختیار کرتی تھیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کے سفر پر روانہ ہوئے تو اپنا سارا مال — جس کی مقدار چھ ہزار درہم تھی — اپنے ساتھ لیتے گئے اور اہل و عیال کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ جب ان کے والد ابو قحافہ کو — جو اس وقت تک ابھی مشرک تھے — ان کی روانگی کی خبر ہوئی تو انہوں نے گھر آ کر حضرت اسماء سے کہا۔

”خدا کی قسم، میرا خیال ہے ابو بکر نہ صرف یہ کہ تم لوگوں کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے ہیں بلکہ اپنے ساتھ اپنا مال بھی لیتے گئے ہیں۔ اس طرح تم لوگوں کو مالی پریشانی میں مبتلا کر گئے ہیں۔“

لیکن حضرت اسماء نے ان کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں دادا جان! ایسی بات نہیں ہے وہ ہمارے لیے کافی مال چھوڑ گئے ہیں۔“ پھر انہوں نے بہت سی کنکریاں جمع کیں اور انہیں دیوار میں بنے ہوئے ایک طاق میں رکھا۔ جس میں وہ مال رکھتے تھے۔ اور ان کے اوپر ایک کپڑا ڈال کر اپنے دادا کا — جو نابینا تھے — ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”دادا جان! دیکھتے وہ ہمارے لیے کتنا زیادہ مال چھوڑ گئے ہیں۔“ اور انہوں نے ان کے اوپر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”تب کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر وہ یہ سارا مال تم لوگوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں تو بہت اچھا کیا ہے۔“

دراصل وہ اس طرح بڑے میان کے دل کو تسکین دینا چاہتی تھیں۔ نیز

وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ان کے اوپر اپنا مال خرچ کریں کیونکہ ان کو کسی مشرک کا احسان گزارا نہیں تھا خواہ وہ ان کا دادا ہی کیوں نہ ہو۔

تاریخ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کے سارے کارناموں کو بھلا سکتی ہے مگر اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے اپنی آخری ملاقات کے موقع پر انھوں نے جس دانشمندی اور بڑبڑاری، ڈوراندیشی و ہوشیاری اور قوت ایمانی کا مظاہرہ کیا تھا، تاریخ کے لیے اس کو فراموش کر دینا ناممکن ہے۔

یزید بن معاویہ کے مرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی گئی اور پورا حجاز، مصر، عراق، خراسان اور شام کا بیشتر علاقہ ان کے ماتحت آگیا۔ اس کے فوراً ہی بعد بنو امیہ نے حجاج بن یوسف کی قیادت میں ایک لشکر جرار ان کے مقابلے کے لیے روانہ کر دیا اور فریقین کے درمیان کئی زبردست معرکے برپا ہوئے۔ ان معرکہ آرائیوں میں حضرت عبداللہ بن زبیر نے غیر معمولی شجاعت و مردانگی کا مظاہرہ کیا جو ان کے جیسے بہادر شہسواروں کے شایان شان تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے ان کے بہت سے حامی ان کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہوتے گئے۔ آخر کار وہ اور ان کے تھوڑے سے باقی ماندہ ساتھی بیت اللہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر نے اپنی شہادت سے صرف چند گھنٹے پہلے اپنی والدہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی خدمت میں — جو اس وقت کافی بوڑھی اور نابینا ہو چکی تھیں — حاضر ہو کر سلام کیا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ان کے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

”عبداللہ! اس وقت جب کہ حجاج کی قلعہ شکن توپوں کی شدید سنگ باری سے — جو وہ حرم میں پناہ گزین تمہارے آدمیوں پر کر رہی ہیں —

لکے کے درو دیوار لرز رہے ہیں، تم کس ضرورت سے آتے ہو؟“
 ”اتنی! میں اس وقت آپ سے کچھ مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“
 انھوں نے جواب دیا۔

”مجھ سے مشورہ لینے آتے ہو! کس معاملے میں؟“ حضرت اسماعیلؑ نے
 تعجب سے پوچھا۔

”زیادہ تر لوگوں نے میری مدد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور وہ حجاج کے
 خوف یا اس سے مادی فوائد کے حصول کی امید پر میرا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے ہیں
 یہاں تک کہ میرے لڑکے اور گھروالے بھی مجھ سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اب میرے
 ساتھ صرف تھوڑے سے آدمی بچ گئے ہیں اور ان کا بھی حال یہ ہے کہ جب ان
 کی قوت برداشت جواب دے جائے گی تو وہ بھی گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ
 نہیں ٹھک سکیں گے۔ اور ادھر بنو امیہ کے قاصد برابر میرے سامنے یہ پیش کش
 کر رہے ہیں کہ اگر میں ہتھیار ڈال دوں اور عبدالملک بن مروان کی بیعت کروں
 تو وہ میرا ہر دنیاوی مطالبہ ماننے کے لیے تیار ہیں،“ انھوں نے کہا۔

”عبداللہ! یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے اور تم خود اپنے بارے میں زیادہ بہتر
 جانتے ہو۔ اگر تمہیں اپنے موقف کی حقانیت اور صداقت کا یقین ہے اور تم
 حق کی طرف دعوت دے رہے ہو تو اپنے موقف پر ڈٹے رہو اور اپنے ان
 ساتھیوں کی طرح صبر و استقلال سے کام لو جنہوں نے تمہارے جھنڈے کے
 نیچے لڑتے ہوئے اپنی جانیں دے دی ہیں۔ اور اگر تم نے اس کے ذریعہ دنیا
 حاصل کرنا چاہا تھا تو تم ایک بہت بڑے آدمی ہو کہ خود کو بھی ہلاک کیا اور اپنے
 آدمیوں کو بھی۔“ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

”لیکن اس صورت میں میں آج لازماً قتل کر دیا جاؤں گا!“ حضرت عبداللہؑ

نے کہا۔

”یہ تمہارے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ تم اپنے آپ کو حجاج کے حوالے کر دو اور بنو امیہ کے لڑکے تمہارے سر سے کھیلیں“ حضرت اسماعیل نے فرمایا۔

”میں قتل ہونے سے نہیں ڈرتا بلکہ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ میرا مثلہ کر دیں گے۔“ حضرت عبداللہ نے کہا۔

”قتل ہو جانے کے بعد ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے آدمی خوف محسوس کرے۔ اس لیے کہ بکری جب ذبح کر دی گئی تو کھال کھینچنے سے اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی“ حضرت اسماعیل نے فرمایا۔

یہ سن کر حضرت عبداللہ کی پیشانی خوشی سے چمک اٹھی اور انہوں نے کہا۔

”امی! کتنی عظیم ہیں آپ اور کتنی عظیم ہے آپ کی سیرت میں اس وقت آپ کے پاس ہی باتیں سننے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ خدا کی قسم نہ میرے حوصلے پست ہوتے ہیں نہ میرے اندر کسی قسم کی کمزوری پیدا ہوئی ہے۔ خدا شاہد ہے کہ میں جس کام کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہوں اس کا محرک دنیا اور اس کے عیش آرام کی طلب نہیں ہے۔ بلکہ میرے پیش نظر اس بات پر اللہ کے لیے اپنے غم و غصہ کا اظہار ہے کہ اس کی حرام کردہ چیزوں کو جلال کر لیا گیا ہے۔ اور یہ لیجئے میں آپ کی پسندیدہ چیز کی طرف جا رہا ہوں۔ جب میں قتل کر دیا جاؤں تو میرے اوپر حزن و ملال کا اظہار کرنے کے بجائے اپنے معاملے کو خدا کے سپرد کر دیجئے گا۔“

”مجھے تمہارے اوپر غم اس وقت ہوتا جب تم باطل کی راہ میں قتل کیے جلتے۔“ حضرت اسماعیل نے کہا۔

”امی! آپ مطمئن رہیں کہ آپ کے بیٹے نے نہ تو کبھی کسی منکر کے ارتکاب کا

قصہ کیا، نہ کسی بدکاری سے ملوث ہوا، نہ خدا کے حکم سے تجاوز کیا، نہ کسی کو امان دے کر اس سے غداری کی، نہ کسی مسلمان یا ذمی پر دانستہ کوئی ظلم کیا اور نہ کوئی چیز اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے زیادہ قابلِ تزییح رہی۔ یہ باتیں میں نے اپنی پاکیزگی اور طہارت کے اظہار کے طور پر نہیں کہی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ میں نے یہ باتیں صرف آپ کی تسکینِ قلب کے لیے کہی ہیں۔“ حضرت عبداللہؓ نے کہا۔

”شکر ہے اس خدا کا جس نے تم کو اپنے اور میرے پسندیدہ راستے پر گامزن کیا ہے۔ میرے بچے! میرے قریب آ جاؤ تاکہ میں تمہاری خوش بوسونگہ لوں اور تمہارے جسم کو چھولوں کیونکہ یہ تم سے آخری ملاقات ہے۔“ حضرت اسماءؓ نے کہا۔ اور حضرت عبداللہؓ جھک کر ان کے ہاتھوں اور پیروں کو بے تحاشا چومنے لگے اور وہ اپنی ناک کو ان کے سر، چہرے اور گردن پر پھیر کر سونگھنے اور بوسہ دینے لگیں۔ اور انھوں نے اپنے ہاتھوں کو ان کے بدن پر پھیرتے ہوئے اچانک یہ کہتے ہوئے ان کو واپس کھینچ لیا۔

”عبداللہؓ! یہ کیا چیز ہے جو تم پہنے ہوئے ہو؟“

”یہ میری زرہ ہے۔“ انھوں نے جواب دیا۔

”بیٹے! یہ اس شخص کا لباس نہیں ہے جو شہادت کا طالب ہو۔“ حضرت

اسماءؓ نے کہا۔

”یہ تو میں نے صرف آپ کی تسکینِ خاطر اور اطمینانِ قلب کے لیے پہنا ہے۔“

انھوں نے کہا۔

”اس کو اپنے جسم سے الگ کر دو۔ اس طرح تم کو تیزی سے حرکت کرنے میں

سہولت ہوگی اور پوری قوت کے ساتھ دشمن پر حملہ کر سکو گے۔ اور اس کی جگہ لمبا

پانچامہ پہن لوتا کہ جب تم گرو تو تمہارے ستر کے کھلنے کا اندیشہ نہ رہے۔ ”حضرت اسماعیل نے کہا۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ نے اپنی زرہ اتاری اور اپنے پانچامے کو کس کر باندھ لیا اور یہ کہتے ہوئے جنگ کے لیے حرم کی طرف روانہ ہو گئے۔

”اتنی! میرے لیے دعائے میں کوتاہی نہ کیجئے گا۔“ اور حضرت اسماعیل نے دعا کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا دیا۔

”بارالہا! رات کی تاریکیوں میں جب لوگ میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ اس کے طویل قیام، اس کی شدت گریہ و زاری اور اس کی سسکیوں پر رحم فرمانا۔“

”خدا یا! مکہ اور مدینہ کی گرم دوپہر میں روزہ رکھ کر اس کے بھوک پیاس کی سختی برداشت کرنے پر رحم کرنا۔“

”میرے رب! اس کے اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک پر رحم کرنا۔“

”میرے معبود! میں نے اس کو تیری مشیت کے حوالے کر دیا اور اس کے متعلق تیرے فیصلے پر تسلیم خم کر دیا۔ اس پر مجھ کو صابرین کا اجر عطا فرمانا۔“

اور اس روز کے سورج کے غروب ہونے سے پہلے پہلے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے رب کے جوار رحمت میں پہنچ چکے تھے۔ اور ان کی شہادت پر دس سے کچھ ہی زیادہ دن گزرے تھے کہ ان کی والدہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بھی ان سے جا ملیں۔ اس وقت اگرچہ ان کی عمر

ایک سو سال تھی مگر اس پیرانہ سالی کے باوجود نہ تو ان کا کوئی دانت ٹوٹا تھا نہ کوئی داڑھ گری تھی نہ ان کی عقل میں کسی قسم کا فتور پیدا ہوا تھا۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ

طلحہ ابن عبید اللہ ثقفی اپنے ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں ایک قریشی قافلے کے ساتھ شام جا رہے تھے۔ جب وہ قافلہ بصری پہنچا تو قریش کے عمر سیدہ اور تجربہ کار تاجروں کے آباد بازار میں جا کر خرید و فروخت میں مشغول ہو گئے۔ اگرچہ طلحہ ایک کم سن نوجوان تھے اور ان لوگوں کی طرح مہارت اور تجربہ نہیں رکھتے تھے مگر اپنی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت کے بل پر وہ بہ آسانی ان کا مقابلہ کر سکتے اور اچھے سودے طے کر لینے میں کامیابی حاصل کر لیتے تھے۔

اس بازار میں جو مختلف مقامات سے آئے ہوئے تاجروں سے ہر وقت کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ صبح و شام طلحہ ابن عبید اللہ کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا کہ اسی دوران ان کے ساتھ ایک ایسا اہم واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف ان کی زندگی کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا بلکہ اس نے پوری تاریخ کے دھارے کو موڑ کر رکھ دیا۔ ہم یہ بات طلحہ ابن عبید اللہ ہی پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس تجسس آمیز داستان کو اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

”اس اثنار میں کہ ہم بصری کے بازار میں تھے ہم نے ایک راہب کو یہ اعلان کرتے ہوئے سنا۔

”اے گروہِ تجارت! اس مجمع کے لوگوں سے پوچھو کہ کیا ان کے اندر اہل مکہ

میں سے کوئی شخص موجود ہے؟“ اس وقت میں اس کے قریب ہی تھا۔ میں نے فوراً کہا۔

”ہاں، میں اہل مکہ میں سے ہوں“ تو اس نے پوچھا۔

”کیا تمہارے یہاں احمد کا ظہور ہو چکا ہے؟“

”کون احمد؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب۔“ اس نے کہا۔ ”یہی ہدینہ ہے جس میں ان

کا ظہور ہونا ہے۔ وہ آخری نبی ہیں۔ وہ تمہاری سرزمین، ارض حرم میں مبعوث

ہوں گے اور وہاں سے اس علاقے کی طرف ہجرت کر جائیں گے جہاں کالے

پتھر پائے جاتے ہیں، جہاں کھجوروں کے جھنڈ ہیں اور جہاں کی مٹی نمکین ہے

جس سے پانی کے چٹھے پھوٹتے ہیں۔ نوجوان! دیکھنا ان پر ایمان لانے میں

بھیچے نہ رہ جانا۔“

طلحہ کہتے ہیں کہ اس کی یہ بات میرے دل میں گھر گئی۔ میں تیزی سے

اپنے اونٹوں کے پاس پہنچا، انہیں تیار کیا اور قافلے کو اپنے پیچھے چھوڑ کر تیز رفتاری

کے ساتھ مکے کی طرف چل پڑا۔ اور وہاں پہنچ کر اپنے گھر والوں سے پوچھا کہ کیا

ہماری غیر موجودگی میں یہاں کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ

ہاں (محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ایک نیا دعویٰ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے

ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نبی ہوں۔ اور ابو قحافہ کے بیٹے (ابوبکر رضی) نے ان کی

پیروی اختیار کر لی ہے۔“

طلحہ کہتے ہیں کہ میں ابوبکر کو پہلے سے جانتا تھا۔ وہ نہایت نرم مزاج،

ہر دل عزیز اور رحم دل آدمی تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک خوش اخلاق اور

راست باز تاجر تھے۔ ہم لوگ ان سے مانوس تھے اور ان کی صحبت میں

بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ کیونکہ وہ قریش کی تاریخ سے باخبر اور ان کے انساب کے ماہر تھے۔ میں نے ان کے پاس جا کر پوچھا۔

”کیا یہ بات صحیح ہے کہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور آپ نے ان کی پیروی اختیار کرنی ہے؟“

”انہوں نے کہا کہ ہاں اور مجھے ان کے حالات سنا کر اپنے ساتھ ان کے دین میں داخل ہونے کی ترغیب دینے لگے۔ اور جب میں نے ان کو راہب کی بات سنائی تو وہ حیران و ششدر رہ گئے اور مجھ سے کہا کہ میرے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چلو تاکہ یہ واقعہ جو تمہارے ساتھ پیش آیا ہے، ان کے سامنے بیان کرو، ان کی دعوت کو ان کی زبان سے سُنو اور اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ۔“

ظلمہ کہتے ہیں کہ پھر میں ان کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے میرے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا اور آخرت کی بھلائی کی بشارت دی۔ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیا۔ جب میں نے ان کو بصری کے راہب کا قصہ سنایا تو نہایت خوش ہوئے۔ اور اس خوشی کے آثار ان کے چہرے پر نمایاں ہو گئے۔ پھر میں نے ان کے سامنے کلمہ شہادت کا اقرار کیا۔ اس طرح میں چوتھا شخص تھا جو ابو بکر کے ہاتھ پر ایمان لایا۔“

اس قریشی نوجوان کے قبولِ اسلام کی خبر سن کر اس کے گھر اور خاندان کے لوگ سکتے میں پڑ گئے، جیسے ان کے اوپر بجلی گر پڑی ہو۔ خصوصاً ان کی ماں کو اس واقعے سے زبردست صدمہ پہنچا اور وہ غم سے نڈھال ہو گئیں کیونکہ انہیں امید تھی کہ اپنے بلند اخلاق اور کریمانہ خصائل کی بنا پر ان کا بیٹا ایک دن اپنے

قبیلے کا سردار بنے گا۔ ان کے قبیلے والوں نے انھیں اپنے دین سے پھیرنے کی بہتیری کوششیں کیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتے اور ایک مضبوط پہاڑ کی طرح اسلام پر جمے رہے۔ جب وہ لوگ ان کو نرمی و محبت کے ریشمی پھندے میں پھانسنے میں ناکام ہو گئے تو سختی اور تغذیب کے اسلحوں سے لیس ہو کر ان کے اوپر ٹوٹ پڑے۔ مسعود بن خراش بیان کرتے ہیں۔

”ایک روز میں صفا مروہ کے درمیان سعی کر رہا تھا۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایک نوجوان کا پیچھا کر رہے ہیں جس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے، اسے دھکے دے رہے تھے اور اس کے سر پر مار رہے تھے۔ اس نوجوان کے پیچھے ایک بوڑھی عورت تھی جو چیخ پیچ کر اسے گالیاں دے رہی تھی میں نے لوگوں سے پوچھا کہ اس نوجوان کا کیا ماجرا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہ طلحہ ابن عبید اللہ ہے جس نے اپنے آبائی دین کو ترک کر کے بنی ہاشم کے لونڈے (محمدؐ) کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ میں نے پوچھا، اور اس کے پیچھے یہ بوڑھی کون ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ یہ اسی نوجوان کی ماں صعیبہ بنتِ حضرمی ہے“

پھر نوفل بن خویلد نے — جس کا لقب شیر قریش تھا — حضرت طلحہ ابن عبید اللہ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کو ایک رسی میں باندھ کر لکے کے اوباشوں اور لٹپوں لٹنگوں کے حوالے کر دیا تاکہ وہ انھیں سخت ترین سزائیں دیں۔ اسی وجہ سے طلحہ ابن عبید اللہ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کو ”قرینین“ کہا جاتا ہے۔

زمانے کی گردش جاری رہی، یکے بعد دیگرے نئے نئے حادثات و واقعات رونما ہوتے رہے اور مہر و پیام کے ساتھ ساتھ حضرت طلحہ ابن عبید اللہ

ایمان کے تکمیلی مراحل طے کرتے رہے، خدا اور اس کے رسولؐ کی راہ میں ان کی آزمائشوں کا سلسلہ دراز ہوتا رہا اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے احسان اور حسن سلوک کا دائرہ بڑھتا اور وسعت اختیار کرتا رہا یہاں تک کہ مسلمانوں نے ان کو ”زندہ شہید“ کا لقب دے دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ”طلحہ خیر“، ”طلحہ جود“، اور ”طلحہ نیاض“ کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ ان القاب میں سے ہر لقب کا ایک پس منظر ہے جو ایک دوسرے سے بڑھ کر دل کشی و خوشنمائی کا حامل ہے۔

ان کے ”زندہ شہید“ کے لقب سے ملقب ہونے کا پس منظر یہ ہے کہ غزوہ اُحد کے موقع پر جب مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے اور آپ کے ساتھ دس انصاریوں اور ہابریں میں سے حضرت طلحہ ابن عبید اللہ کے سوا کوئی نہیں رہ گیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ پہاڑ پر چڑھ رہے تھے تو مشرکین کی ایک ٹولی وہاں پہنچی جو آپ کو قتل کرنا چاہتی تھی تو آپ نے فرمایا۔

”کون ہے جو ان لوگوں کو ہم سے دور بھگائے۔ وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔“

تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ”اے اللہ کے رسولؐ! میں!“ لیکن آپ نے فرمایا۔

”نہیں، تم اپنی جگہ پر رہو،“ تب ایک انصاری نے کہا۔

”اے اللہ کے رسولؐ! میں!“

”ہاں، تم!“ آپ نے فرمایا۔

وہ انصاری آگے بڑھ کر مشرکین سے لڑتے رہے یہاں تک کہ وہ شہید

ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دوران کچھ اور اوپر چڑھ گئے۔ مگر مشرکین نے جلد ہی آپ کو آگیا۔ آپ نے پھر کہا۔

”کیا ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی نہیں ہے؟“

”میں ہوں، اے اللہ کے رسول!“ حضرت طلحہ نے پھر پہل کی۔

”نہیں، تم اپنی جگہ پر رہو،“ آپ نے ان کو روک دیا۔

تب دوسرے انصاری آگے بڑھے اور بولے۔

”اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں؟“

”ہاں، تم ان کا مقابلہ کرو،“ آپ نے ان کو اجازت دی۔ اور وہ دشمنوں

سے قتال کرتے رہے تا آن کہ انھوں نے بھی جام شہادت نوش فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقابلے کے لیے اپنے ساتھیوں کو آواز

دیتے رہے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم آپ کی آواز پر سب سے پہلے بیک کہتے رہے اور

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو منع کر کے کسی انصاری کو اس کی اجازت دیتے رہے

یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے وہ سب انصاری شہید ہو گئے اور آپ کے ساتھ

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کے سوا کوئی نہیں رہ گیا۔ جب دشمن پھر آپ کے قریب پہنچ گئے

تو آپ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا۔

”اب تمہاری باری ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہو گئے تھے، پیشانی

اور ہونٹ زخمی ہو گئے تھے، چہرہ مبارک سے خون جاری تھا اور آپ زخموں سے

نڈھال ہو گئے تھے۔ اس موقع پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم مشرکین پر حملہ کر کے ان کو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے دور دھکیل دیتے، پھر واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو ہمارا دے کر تھوڑا اوپر چڑھاتے اور زمین پر بیٹھا کر مشرکین پر دوبارہ حملہ کرتے

تھے۔ یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ان کو مکمل طور پر سپا کر دیا۔
حضرت ابو بکرؓ کہتے ہیں کہ اس وقت میں اور ابو عبیدہ ابن جراح رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے دور تھے۔ جب ہم آپ کی مدد کے ارادے سے آپ
کے قریب پہنچے تو آپ نے فرمایا۔

”مجھے چھوڑ دو اور اپنے ساتھی (طلحہؓ) کی مدد کو پہنچو۔“

جب ہم ان کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ان کے جسم سے بے تحاشا خون بہہ
رہا ہے اور ان کے بدن پر تلواروں، نیزوں اور تیروں کے ستر سے زیادہ زخم
ہیں، ان کی پتھیلی کٹ گئی ہے اور وہ ایک گڑھے میں بیہوش پڑے ہیں۔
اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے۔

”مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَنْظُرَ اِلَى رَجُلٍ
يَمِيْنِي عَلٰى الْاَرْضِ قَدْ قَضٰى حُجْبَهٗ
فَلْيَنْظُرْ اِلَى طَلْحَةَ بْنِ عَبِيْدِ اللّٰهِ۔“
”جو کسی ایسے شخص کو زمین پر چلتا پھرتا دیکھنا
چاہتا ہو جو اپنی نذر (موت) پوری کر چکا
ہو وہ طلحہ ابن عبید اللہ کو دیکھ لے۔“

اور حضرت ابو بکرؓ جب غزوہ احد کا ذکر کرتے تو فرماتے،

”ذَا لِكَ يَوْمٍ كَلَّهٗ، بِطَلْحَةَ — وہ پورے کا پورا طلحہ کا دن تھا۔“

یہ تھا وہ قصہ جس کی وجہ سے حضرت طلحہ ابن عبید اللہؓ کا لقب
”زندہ شہید“ پڑا۔ رہی ان کے ”طلحہ خیر“ اور ”طلحہ جوڈ“ کے القاب کی جات
تو اس کے سیکڑوں قصے ہیں۔ اور انھیں میں سے ایک یہ ہے۔

حضرت طلحہؓ بہت بڑے تاجر اور نہایت مالدار آدمی تھے۔ ایک روز
ان کے پاس حضرت موت سے ستر لاکھ درہم کی کثیر رقم آئی۔ وہ رات بھر غم گین اور
پریشان رہے۔ ان کی پریشانی دیکھ کر ان کی اہلیہ حضرت ام کلثوم بنت ابی بکرؓ
نے کہا۔

”ابو محمد! آپ کو کیا ہوا ہے؟ شاید میری طرف سے آپ کو کوئی تکلیف

پہنچی ہے۔“

”نہیں، نہیں۔ تم تو ایک بہترین مسلمان بیوی ہو۔ میں رات بھر یہ سوچتا رہا کہ وہ شخص اپنے رب کے بارے میں کیا گمان رکھتا ہے جس کے گھر میں اتنی بڑی مقدار میں رقم پڑی ہو اور وہ بے فکر سو رہا ہو۔“

”تو اس میں فکر اور پریشانی کی کیا بات ہے؟ آپ اپنے محتاج اہل قبیلہ اور مفلس احباب کو کہاں بھولے ہوئے ہیں۔ صبح کو یہ ساری رقم ان کو بانٹ دیجئے۔“
حضرت ام کلثوم نے رائے دی۔

”اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر رحمت نازل فرمائے۔ واقعی تم صاحبِ توفیق اور صاحبِ توفیق کی بیٹی ہو۔“ انھوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اور صبح کے وقت انھوں نے وہ ساری رقم تھیلیوں اور بڑے بڑے پیالوں میں رکھ کر فقراء، مہاجرین و انصار میں تقسیم کرادی۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص حضرت طلحہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے مدد کا طالب ہوا۔ اور اپنی ایک رشتہ داری کا ذکر کیا جو دونوں کو باہم جوڑتی تھی حضرت طلحہؓ نے کہا کہ آج سے پہلے مجھ سے اس رشتے کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ بہر حال میرے پاس ایک زمین ہے جس کے لیے عثمانؓ ابن عفان مجھے تین لاکھ درہم دے رہے ہیں۔ اب اگر تم چاہو تو وہ زمین لے لو اور اگر چاہو تو اے فرخستہ کر کے میں تم کو تین لاکھ کی نقد رقم دے دوں۔ تو اس آدمی نے کہا کہ میں اس کی قیمت ہی لوں گا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو وہ رقم دے دی۔

”طلحہ خیر“ اور ”طلحہ وجود“ کو یہ لقب مبارک ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مرحمت فرمایا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور ان کی قبر کو منور کرے۔

حضرت ابو ہریرہ دوسی رضی اللہ عنہ

یقیناً آپ صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے اس کو کب درخشاں سے
بخوبی واقف ہوں گے۔ کیا امت مسلمہ کا کوئی فرد ایسا بھی ہے جو حضرت ابو
ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ناواقف ہو؟ لوگ ان کو جاہلیت میں ”عبد شمس“ کے
نام سے پکارتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی نعمت سے نوازا اور
اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے مشرف کیا تو آپ نے ان سے پوچھا۔
”تمہارا نام کیا ہے؟“

”عبد شمس“ انھوں نے جواب دیا۔

”ہنہیں، بلکہ تمہارا نام عبدالرحمان ہے۔“ حضور نے ارشاد فرمایا۔

”ہاں، عبدالرحمان۔ اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان
ہوں،“ انھوں نے عرض کیا۔

یہی ان کی کنیت ”ابو ہریرہ“، تو اس کا سبب یہ ہے کہ بچپن میں ان کے
پاس ایک بلی تھی جس کے ساتھ وہ کھیلا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے ہم جو یوں
نے انھیں ابو ہریرہ کہنا شروع کر دیا اور بعد میں یہ کنیت اتنی مشہور ہوئی کہ ان
کے نام پر غالب آگئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے تعلقات
ستوار ہوئے تو آپ بسا اوقات ان کو پیار سے ”ابو ہریرہ“ کہہ کر بلا تے! اسی لیے

وہ خود بھی ”ابو ہریرہ“ کو ”ابو ہریرہ“ پر ترجیح دیتے اور کہتے کہ میرے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔ ”ہریرہ“ مذکور اور ”ہریرہ“ مونث ہے اور مذکر مونث سے اچھا ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ حضرت طفیل بن عمروؓ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور وہیں اپنے قبیلے میں مقیم رہے اور ۶ؓ میں اپنے قبیلے بنی دوس کے ایک وفد کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور ہر چیز سے قطع تعلق کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور صحبت کے لیے یکسو ہو گئے، مسجد نبوی کو جائے قیام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنا لیا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے بیوی بچے نہیں تھے۔ صرف ان کی بوڑھی ماں تھیں جو اس وقت تک شرک پر مہر تھیں جن کی محبت اور خیر خواہی کے پیش نظر وہ برابر ان کو اسلام کی دعوت دیتے رہتے تھے مگر وہ ہمیشہ اس سے نفرت اور انکار کرتی رہتی تھیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے مگر ان کا دل غم سے کباب ہوتا رہتا۔ ایک روز انھوں نے اپنی ماں کو خدا اور رسول پر ایمان لانے کی دعوت دی تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسے نازیبا الفاظ استعمال کیے جن کو سن کر حضرت ابو ہریرہؓ کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ روتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کو روتا دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے ابو ہریرہ! کیوں رو رہے ہو؟“

”میں برابر اپنی ماں کو اسلام کی دعوت دیتا رہا۔ مگر وہ ہمیشہ انکار کرتی رہی۔ آج بھی جب میں اس کو دعوت دی تو اس نے مجھے سخت دل آزار بات سنائی۔ اے اللہ کے رسول! اللہ عزوجل سے دعا فرمائیے کہ وہ ابو ہریرہ کی ماں کو اسلام کی طرف مائل کر دے۔“ انھوں نے روتے ہوئے کہا۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک دعا کے لیے بلند ہو گئے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب میں واپس گھر گیا تو دیکھا کہ دروازہ بھٹرا ہوا ہے۔ اور مجھے اندر سے پانی گرنے کی آواز سنائی دی۔ جب میں نے اندر داخل ہونا چاہا تو ماں نے کہا کہ ابو ہریرہؓ ابھی وہیں کھڑے رہو۔ پھر جب انھوں نے کپڑے پہن لیے تو کہا کہ اب اندر آ جاؤ۔ جب میں اندر گیا تو انھوں نے کہا۔

”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ“

میں آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے پھر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا جیسا کہ تقوڑی دیر پہلے غم سے آنسو بہاتا ہوا گیا تھا۔ اور عرض کیا کہ اللہ کے رسولؐ خوش ہو جاتے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعائیں لی اور ابو ہریرہؓ کی ماں کو اسلام کی ہدایت دیدی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی گہری محبت تھی جو ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ وہ آپ کے دیدار سے کبھی آسودہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے

”مَا دَأَيْتُ شَيْئًا أَمْلَحَ وَاصْبَحَ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى نَكَانَ الشَّمْسُ تَجْرِي فِي وَجْهِهِ“

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت کوئی چیز نہیں دیکھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے رُخ تاباں میں سورج گردش کر رہا ہے۔“

وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرتے رہتے تھے کہ اس نے ان کو اپنے دین کے اتباع کی توفیق عطا فرمائی۔ وہ کہتے تھے۔

”شکر ہے اس خدا کا جس نے ابو ہریرہؓ کو اسلام کی ہدایت بخشی، شکر ہے اس خدا کا جس نے ابو ہریرہؓ کو قرآن کا علم دیا اور شکر ہے اس خدا کا جس نے

ابو ہریرہ کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے نوازا۔“
 حضرت ابو ہریرہؓ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ
 محبت رکھتے تھے اسی طرح وہ علم کے بھی بڑے شیدائی تھے۔ انہوں نے اس
 کو اپنا روزمرہ کا معمول بلکہ اپنی زندگی کا منتہا، مقصود بنا رکھا تھا۔ حضرت زید
 ابن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔

”ایک روز میں، ابو ہریرہؓ اور میرا ایک ساتھی، تینوں آدمی مسجد نبوی
 میں بیٹھے ذکر و دعا میں مصروف تھے۔ اسی دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 حجرہ مبارک سے نمودار ہوئے اور آکر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ جب ہم خاموش
 ہو گئے تو آپ نے فرمایا۔

”اپنا سلسلہ جاری رکھو۔“

تب میں نے اور میرے ساتھی نے ابو ہریرہ سے پہلے دعا مانگی اور
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری دعاؤں پر آمین کہی۔ اس کے بعد ابو ہریرہ
 نے دعا کی۔

”اے اللہ! میں تجھ سے وہ چیزیں بھی مانگتا ہوں جو میرے ان
 دونوں ساتھیوں نے مانگی ہیں اور میں تجھ سے نہ بھولنے والا علم مانگتا ہوں۔“
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دعا پر بھی آمین کہی۔ اس کے
 بعد ہم دونوں نے کہا کہ ہم بھی اللہ تعالیٰ سے نہ بھولنے والا علم مانگتے ہیں۔ تو
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”سَبَقْتُكُمْ بِهَا الْغُلَامُ الدَّوْسِيُّ“ یہ دوسی نوجوان تم لوگوں سے بازی لے
 گیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ جس طرح علم کو اپنے لیے پسند کرتے تھے اسی طرح
 دوسروں کے لیے بھی پسند کرتے تھے۔

ایک روز ان کا گزر مدینہ کے بازار میں ہوا۔ وہ لوگوں کی دنیاوی مصروفیت اور خرید و فروخت اور لین دین میں ان کے اہٹاک کو دیکھ کر گھبرائے۔ انھوں نے لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

”اے اہل مدینہ! تم لوگ کتنے عاجز اور ناکام ہو۔“

”ابو ہریرہ! آپ نے ہماری کون سی عاجزی اور ناکامی دیکھی؟“ لوگوں

نے پوچھا۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث تقسیم ہو رہی ہے اور تم لوگ یہاں ہو۔ جا کر اپنا حصہ لیتے کیوں نہیں؟“ حضرت ابو ہریرہ نے کہا۔

”ابو ہریرہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کہاں تقسیم ہو رہی ہے؟“ انھوں نے پوچھا۔

”مسجد میں“ حضرت ابو ہریرہ نے جواب دیا۔

یہ سن کر لوگ تیزی سے مسجد کی طرف دوڑے اور حضرت ابو ہریرہ ان کے انتظار میں وہیں کھڑے رہے۔ جب ان لوگوں نے واپس آکر ان سے کہا کہ ہم لوگ مسجد میں گئے تھے مگر وہاں تو ہم نے کوئی چیز تقسیم ہوتے ہوئے نہیں دیکھی تو حضرت ابو ہریرہ نے کہا۔

”کیا تم لوگوں نے مسجد میں کسی کو نہیں دیکھا؟“

”کیوں نہیں، ہم نے وہاں دیکھا کہ کچھ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں، کچھ تلاوت قرآن میں مصروف ہیں اور کچھ لوگ حلال و حرام کے متعلق بحث و مباحثہ کر رہے ہیں“ ان لوگوں نے جواب دیا۔

”تم لوگوں کا بھلا ہوا، وہی تو ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث“ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا۔

اپنی غیر معمولی علمی مصروفیت و انہماک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں کی پابندی کی وجہ سے بھوک، فاقہ کشی اور زندگی کی جو سختیاں حضرت ابو ہریرہؓ نے جھیلئیں، شاید ہی کسی دوسرے نے جھیلی ہوں۔ وہ اپنے متعلق بیان کرتے ہیں۔

مجھے اتنی شدت کی بھوک لگتی تھی کہ بیتاب ہو کر میں اصحاب رسولؐ میں سے کسی صاحب سے قرآن کی کسی آیت کے متعلق پوچھتا تھا۔ حالانکہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوتا۔ تاکہ وہ مجھے اپنے گھر لے جا کر کچھ کھلائیں۔ ایک روز تو مجھے ایسی زور کی بھوک لگی کہ میں نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیا۔ پھر میں صحابہ کرام کے راستے پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے ادھر سے ابو بکر صدیقؓ کا گزر ہوا۔ میں نے کتاب اللہ کی ایک آیت کے متعلق ان سے دریافت کیا اور یہ سوال میں نے صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ مجھے اپنے گھر بلائیں۔ مگر انہوں نے نہیں بلایا۔ پھر عمرؓ بن خطاب میری طرف سے گزرے۔ میں نے ان سے بھی ایک آیت کے بارے میں پوچھا۔ لیکن انہوں نے بھی مجھے کھانے کے لیے نہیں پوچھا۔ پھر وہ گزر گاہِ رحمتِ مجسم کے نقوش پا سے منور ہوئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ میں بھوک سے بے حال ہوں۔ انہوں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”ابو ہریرہؓ؟“

”بیک یا رسول اللہ!“ میں نے کہا۔ اور پھر پیچھے پیچھے چلتا ہوا آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہاں آپ نے ایک پیالے میں دودھ دیکھ کر گھر والوں سے پوچھا۔

”یہ دودھ تم لوگوں کو کہاں سے ملا؟“

”یہ فلاں صاحب نے آپ کے واسطے بھیجا ہے“ انہوں نے فرمایا۔

تب انہوں نے مجھ سے فرمایا۔

”ابو ہریرہ! جاؤ تمام اہل صفہ کو بلا لاؤ۔“

آپ کا مجھے ان سب لوگوں کو بلانے کے لیے بھیجنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اتنے سے دودھ سے اہل صفہ کا کیا بنے گا۔ میں چاہتا تھا کہ اس میں سے کچھ پی لوں تاکہ مجھے سہارا مل جائے پھر ان لوگوں کو بلانے جاؤں۔ بہر حال میں ان لوگوں کو بلا کر لے گیا۔ جب وہ سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گئے تو آپ نے فرمایا۔

”ابو ہریرہ! یہ لو اور اسے سب لوگوں کو بلاؤ۔“ میں وہ پیالہ باری باری ہر ایک کو دیتا گیا یہاں تک کہ سب نے آسودہ ہو کر پی لیا۔ اب میں نے پیالہ ان کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے سر مبارک اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا۔

”اب میں اور تم، صرف دو آدمی بچ گئے ہیں۔“

”جی ہاں، اللہ کے رسول! آپ نے سچ فرمایا۔“ میں نے عرض کیا۔

آپ نے فرمایا ”پیو“ میں نے پیا۔

پھر فرمایا، ”اور پیو“ میں نے اور پی لیا۔ آپ برابر ”اور پیو، اور پیو“ کہتے رہے اور میں پیتا رہا۔ یہاں تک کہ میں پورے طور پر شکم سیر ہو گیا اور عرض کیا۔

”قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔“

تب آپ نے پیالہ لے کر باقی بچے ہوئے دودھ کو خود پی لیا۔

اس واقعے کو گزرے ابھی زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی کہ اسلامی فتوحات

کے نتیجے میں ہاتھ آنے والے غنائم کے سبب مسلمانوں میں مال و دولت کی فراوانی

ہوگئی اور حضرت ابوہریرہؓ کے پاس بھی مال و دولت، مکان و اسباب اور نبوی بچے ہر چیز ہوگئی۔ مگر یہ ساری چیزیں مل کر بھی نہ تو ان کی فطرت اور طبیعت میں ذرہ بڑا کوئی تغیر پیدا کر سکیں نہ گزرے ہوئے دنوں کی یاد کو ان کے لوحِ دل سے محو کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ وہ اکثر یہ بات کہا کرتے تھے۔

”میں نے حالتِ تنہی میں پرورش پائی اور مسکینی کی حالت میں ہجرت کی میں صرف پیٹ کی روٹی کے عوض بسہرہ بنتِ غزوان کے یہاں مزدوری کرتا تھا۔ میں حضر میں ان لوگوں کی خدمت کرتا اور سفر میں ان کے اونٹوں کو ہانکتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسی کے ساتھ میری شادی کرادی۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے اپنے دین کے ذریعے سارے حالات درست کر دیے اور ابوہریرہؓ کو والی بنا دیا۔“

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ کی طرف سے کئی بار مدینہ منورہ کے والی بنائے گئے۔ مگر گورنری کا یہ عہدہ بھی ان کی نرم مزاجی اور سادگی میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکا۔ ایک بار اپنی گورنری کے زمانے میں وہ اپنے گھر والوں کے لیے لکڑیوں کا ایک بوجھ پیٹھ پر لادے مدینہ کے راستوں سے گزر رہے تھے۔ جب ان کا گزر ثعلبہ ابن مالک کی طرف سے ہوا تو بولے :

”مالک کے بیٹے! گورنر کو جانے کے لیے راستہ دیدو۔“

”اللہ آپ پر رحم فرمائے، کیا اتنی ساری جگہ آپ کے گزرنے کے واسطے کافی نہیں ہے؟“ ابن مالک نے کہا۔

تو انھوں نے کہا۔ ”گورنر کے ساتھ اس گٹھ کے لیے بھی راستہ دو جو اس کی پیٹھ پر لدا ہوا ہے۔“

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں دُور علم اور نرم مزاجی کے ساتھ تقویٰ اور پرہیزگاری کی واضح مقدار بھی جمع ہوگئی تھی۔ وہ دن کو روزہ

رکھتے اور تہائی رات تک عبادت اور ذکر الہی میں مصروف رہتے، پھر اپنی بیوی کو بیدار کر دیتے جو رات کا دوسرا تہائی حصہ عبادت میں گزارتیں پھر وہ اپنی بیٹی کو جگا دیتیں اور وہ رات کے آخری حصے میں قیام کرتیں۔ اس طرح ان کے گھر میں عبادت کا سلسلہ رات بھر جاری رہتا۔

ان کے پاس ایک جشن لوٹڈی تھی۔ ایک دفعہ اس سے کوئی ایسی نازیبا حرکت سرزد ہو گئی جس سے ان کو اور گھردالوں کو بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے اس کو مارنے کے لیے کوڑا اٹھایا۔ پھر رک گئے اور کوڑا رکھتے ہوئے لوٹڈی سے کہا ”اگر قیامت کے دن قصاص کا ڈر نہ ہوتا تو جو اذیت تو نے ہمیں پہنچائی ہے، میں تجھے ضرور اس کی سزا دیتا لیکن میں تجھ کو ایک ایسی ہستی کے ہاتھ فروخت کروں گا جو تیری قیمت مجھے اس روز ادا کرے گی جب میں اس کا سب سے زیادہ ضرورت مند ہوں گا۔ جا تو اللہ کے لیے آزاد ہے۔“ ان کی صاحب زادی ان سے کہتی تھیں۔

”ابو جان! میری ہم جولی لڑکیاں مجھے طعنہ دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تیرے آبا تجھے سونے کے زیورات کیوں نہیں پہناتے؟“ تو وہ جواب دیتے۔

”بیٹی! ان سے کہہ دینا کہ میرے والد میرے اوپر جہنم کی آگ سے ڈرتے ہیں۔“

حضرت ابو ہریرہؓ کا اپنی بیٹی کو سونے کے زیورات نہ پہنانا کسی بنجالت یا مالی طمع کی وجہ سے نہیں تھا کیونکہ وہ انفاق فی سبیل اللہ میں نہایت فیاض اور بڑے کشادہ دل واقع ہوئے تھے۔ ایک دفعہ مروان ابن حکم نے ان کے پاس ایک سو دینار بھجوائے اور دوسرے دن کہلا بھیجا کہ خادم نے غلطی سے وہ رقم آپ کو دیدی حالانکہ میں نے آپ کے یہاں نہیں کسی دوسرے کے یہاں

بھجوانی تھی۔ اس لیے وہ رقم واپس بھیج دیجئے۔ یہ سن کر وہ سخت نارام ہوئے اور مروان کے یہاں کہلا بھیجا کہ ”میں نے وہ ساری رقم خدا کی راہ میں خرچ کر دی۔ اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی نہیں بچا ہے۔ جب بیت المال سے میرا وظیفہ برآمد ہو تو اس میں سے یہ رقم وضع کر لینا،“ اصل مروان نے ایسا صرف ان کو آزمانے کے لیے کیا تھا۔ مگر جب پتہ لگا تو اس کو صحیح پایا۔

حضرت ابو ہریرہؓ زندگی بھر اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرتے رہے۔ جب وہ گھر سے نکلنے کا ارادہ کرتے تو سب سے پہلے ان کے حجرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہتے۔

”امی جان! السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔“

”میرے بیٹے! وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ وہ جواب دیتیں۔

پھر وہ کہتے، ”اللہ آپ پر رحم فرمائے جیسا کہ آپ نے بچپن میں میری پرورش کی“

تو وہ جواب میں کہتیں۔ ”اور اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر بھی رحم کرے جیسا کہ تم نے بڑھاپے میں میرے ساتھ حسن سلوک کیا۔“

حضرت ابو ہریرہؓ کو اس بات سے غیر معمولی دل چسپی تھی کہ وہ لوگوں کو اپنے والد کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی کی دعوت دیں۔ ایک روز انہوں نے دو آدمیوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے سن رسیدہ تھا۔ انہوں نے چھوٹی عمر والے سے پوچھا۔

”یہ آدمی تمہارا کون ہے؟“

”یہ میرے والد ہیں،“ اس نے جواب دیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے اس کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ”ان کا نام لے کر نہ بلانا، ان کے آگے نہ چلنا اور ان سے پہلے نہ بیٹھنا۔“

حضرت ابو ہریرہؓ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور ان کا آخری وقت آگیا تو رو پڑے۔ جب ان سے رونے کا سبب دریافت کیا گیا تو بولے۔

”میں تمہاری اس دنیا کے لیے نہیں رو رہا ہوں بلکہ دوری منزل اور قلت زاد کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ میں ایک ایسے رستے کے آخری سرے پر کھڑا ہوں جو مجھے جنت یا دوزخ میں پہنچانے والا ہے۔ ابو مجھے اس بات کا قطعی کوئی علم نہیں ہے کہ میں ان دونوں میں سے کس میں پہنچوں گا۔“

مروان بن حکم غیادت کے لیے آیا تو ان سے کہا۔

”ابو ہریرہؓ! اللہ تعالیٰ آپ کو شفا دے۔“ تو انہوں نے کہا۔

”خدا یا! میں تیری ملاقات کو محبوب رکھتا ہوں، تو بھی میری ملاقات کو

پسند فرما اور اس میں جلدی کر۔“

اور مروان کی واپسی سے پہلے ہی ان کی یہ دعا در قبولیت کو دست تک دے چکی تھی۔

اللہ تعالیٰ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک ہزار چھ سو نوے سے زیادہ حدیثیں یاد کیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین اجر عطا فرمائے۔

— — — — —

لے اکثر محدثین ان کی مرویات کی تعداد ۷۳۷۵ بیان کرتے ہیں۔ م

حضرت سلمہ بن قیس اشجعی رضی اللہ عنہ

حضرت فاروق اعظم نے مدینہ منورہ کے محلوں میں گشت کرتے ہوئے وہ پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی تاکہ لوگ امن و اطمینان کے ساتھ بھرپور نیند سوئیں۔ وہ مدینے کے مکانوں اور بازاروں کا چکر لگاتے ہوئے اپنے ذہن میں اصحاب رسولؐ میں سے ان عظیم بہادروں کو تلاش کر رہے تھے جن میں سے کسی ایک کو اس فوج کی قیادت سونپ سکیں جو ابھواز کی فتح کے لیے حرکت میں آنے والی تھی۔ پھر بے ساختہ بول اُٹھے۔

”میں اس کو پاگیا..... ہاں ان شاء اللہ میں اسے پاگیا“ اور صبح کو حضرت سلمہ بن قیس اشجعی کو بلا کر ان سے کہا۔

”میں ابھواز جانے والے لشکر کی قیادت تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ خدا کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ اور اس کی راہ میں ان لوگوں سے قتال کرو جو اس کے منکر ہیں۔ جب تمہارے دشمن مشرکین سے تمہاری بڑ بھڑ ہو تو سب سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دینا۔ اگر وہ تمہاری دعوت قبول کرے دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور جنگ میں تمہارا ساتھ دینے کے بجائے اپنے علاقوں میں

لہ ایران کا ایک علاقہ جو اس کے مغربی حصے میں واقع ہے۔

رہنا پسند کریں تو ان کے اوپر زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی مالی ذمہ داری نہیں ہے۔
 البتہ مالِ قیمت میں ان کا کوئی حصہ بھی نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ دشمن کے خلاف جنگوں
 میں تمہارا ساتھ دینا پسند کریں تو ان کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو تم کو
 حاصل ہیں اور ان کے اوپر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو تمہارے اوپر عائد ہیں۔
 اور اگر وہ قبولِ اسلام سے انکار کر دیں تو ان کو جزیہ ادا کرنے کی دعوت دینا اور انہیں
 ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ ان کے دشمنوں سے ان کی حفاظت کرنا اور کوئی ایسی
 ذمہ داری ان کے اوپر نہ ڈالنا جو ان کی استطاعت سے باہر ہو۔ لیکن اگر وہ
 جزیہ کی ادائیگی سے بھی انکار کر دیں تو ان سے جنگ کرنا۔ ایسی صورت میں فدا
 تعالیٰ کی نصرت و تائید تمہاری پشتیبان ہوگی۔ اگر وہ کسی قلعہ میں پناہ گیر ہو کر
 خدا اور رسول کے حکم کے مطابق تم سے صلح کی خواہش ظاہر کریں تو ان کا یہ
 مطالبہ ہرگز تسلیم نہ کرنا اس لیے کہ تم نہیں جانتے کہ اس معاملے میں اللہ اور اس
 کے رسول کا کیا حکم ہے۔ اور اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری پر صلح کا
 مطالبہ کریں تو ان کا یہ مطالبہ بھی رد کر دینا۔ البتہ تم اپنی ذمہ داری پر ان سے صلح کا
 معاہدہ کر سکتے ہو۔ اور جب جنگ میں تم کو فتح حاصل ہو جائے تو حد سے تجاوز نہ
 کرنا، نہ غداری کے مرتکب ہونا۔ لاشوں کا مشلہ نہ کرنا نہ کسی بچے کے خون سے اپنا
 ہاتھ رنگنا۔“

حضرت سلمہ بن قیس نے فاروقِ اعظم کی ان قیمتی ہدایات کو سن کر ان کے
 سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

”سَمِعًا وَطَاعَةً يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ!“

پھر حضرت عمر نے زور سے ان کے ہاتھ کو دباتے ہوئے پوری گرم جوشی سے
 ان کو الوداع کہا اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ ان کی کامیابی کے لیے دعا فرمائی۔

کیونکہ انھیں اس مہم کی مشکلات اور اس کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ تھا جو انھوں نے حضرت سلمہؓ اور ان کے لشکر کے کندھوں پر ڈالی تھی۔ اس لیے کہ ابواز ایک کوہستانی علاقہ تھا جس کے راستے نہایت دشوار گزار اور قلعے ناقابلِ تسخیر تھے، جو بصرہ اور ایران کی سرحد پر واقع تھا اور جس کے باشندے گردوں سے بھی زیادہ سخت جان اور جفاکش واقع ہوئے تھے۔ اور مسلمانوں کے لیے دو اسباب سے اس علاقے کو فتح یا اس پر قبضہ کرنے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایک تو یہ کہ ایسی صورت میں ان کی پشت بصرہ کی جانب ایرانیوں کے حملوں سے محفوظ ہو جاتی اور دوسرا یہ کہ اہل فارس سے اپنی فوجوں کی آماجگاہ بنا کر عراق کے امن اور اس کی سلامتی کے لیے کوئی خطرہ نہیں پیدا کر سکتے تھے۔

غازیان فی سبیل اللہ کا یہ لشکر اپنے قائد حضرت سلمہؓ ابن قیس کی سرکردگی میں مدینہ سے روانہ ہوا اور راستے کے نشیب و فراز کو طے کرتا ہوا سرزمین ابواز میں داخل ہو گیا۔ لیکن ابھی وہ لوگ اس کے اندر زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اس کے سخت طبعی اور جغرافیائی حالات کی وجہ سے ان کو قدم قدم پر دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہاڑی راستوں میں اوپر چڑھتے ہوئے فوج کو کھوکھلی اور نکلی چٹانوں سے گزرنے کی مشقت جھیلنی پڑتی اور نیچے اترتے ہوئے سڑے ہوئے متعفن پانی کے جوہڑوں کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی۔ اس کے علاوہ خطرناک قسم کے جان لیوا سانپوں اور سست مگر چوکنے زہریلے بچھوؤں کی مصیبت سے الگ نمٹنا پڑتا تھا۔ لیکن حضرت سلمہؓ ابن قیس کی صاف و شفاف اور مومن روح ہر وقت اپنے لشکر کے اوپر سایہ فگن رہتی جس کی وجہ سے یہ ساری مصیبتیں خوشگوار اور دشوار راہیں آسان ہو گئی تھیں۔ وہ وقفے وقفے سے ان کو ایسی نصیحتیں کرتے رہتے جن سے ان کی روحیں جھوم اٹھتیں اور ان کی راتوں کو قرآن کی خوشبو سے معطر

کرتے رہتے جس کی روشنی میں وہ ہنسا اٹھتے اور اس کے نور میں تیرتے ہوئے اپنی ساری مشقتیں اور تکلیفیں بھول جاتے۔

حضرت سلمہ ابن قیسؓ نے خلیفہ المسلمین کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور جب اہل ابواز سے ان کا سامنا ہوا تو سب سے پہلے ان کے سامنے اللہ کا دین پیش کیا مگر انھوں نے نفرت و اعراض کا اظہار کیا۔ پھر ان کو جزیہ کی ادائیگی کی دعوت دی لیکن انھوں نے انکار اور استکبار کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے سامنے جنگ کے سوا دوسری کوئی صورت باقی نہیں بچی۔ چنانچہ وہ جہاد فی سبیل اللہ اور اجر آخرت کے حصول کی نیت سے میدان جنگ میں کود پڑے۔ دونوں فوجیں پوری قوت کے ساتھ ایک دوسری سے ٹکرائیں۔ معرکہ مکارزار گرم ہوا اور جنگ کے شرارے اڑنے لگے اور فریقین نے شجاعت و بسالت اور بہت و جواں مردی کے ایسے جوہر دکھائے جن کی مثال جنگوں کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ آخر کار جنگ کا خاتمہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنے والے اہل ایمان کی فتح مبین اور دشمنانِ خدا، اہل شرک کی شکستِ فاش پر ہوا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد جب حضرت سلمہ ابن قیسؓ مجاہدین میں مالِ غنیمت کی تقسیم کی طرف متوجہ ہوئے تو اس میں ان کو ایک تہایت عمدہ اور بیش قیمت زیور ملا۔ انھوں نے چاہا کہ اسے ہدیہ کے طور پر امیر المومنین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے فوجیوں سے کہا۔

”اگر اس زیور کو تم سارے لوگوں کے درمیان تقسیم کیا جائے تو کسی کے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا۔ تو کیا تم سب لوگ اس بات پر راضی ہو کہ اسے امیر المومنین کی خدمت میں ہدیہ بھیج دیا جائے؟“

سب نے خوشی سے اس کی اجازت دیدی اور انھوں نے اس زیور کو

ایک ڈبے میں رکھ کر اپنے قبیلے بنو اشجج کے ایک شخص کو بلایا اور اس سے کہا کہ اپنے غلام کے ساتھ مدینہ جاؤ۔ پہلے امیر المومنین کو فتح کی خوش خبری سنانا پھر ان کی خدمت میں یہ زیور ہدیہ کے طور پر پیش کر دینا۔ جب وہ اشججی حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے اور حضرت عمرؓ کے درمیان ایک نہایت عبرت انگیز ماجرا پیش آیا۔ ہم وہ ماجرا اسی کی زبانی پیش کرتے ہیں۔

”میں اپنے غلام کے ساتھ پہلے بصرہ پہنچا وہاں ہم نے سلمہ بن قیس کی دی ہوئی رقم سے اپنے سفر کے لیے دو اونٹنیاں خریدیں اور ان کے اوپر اپنا سامان اور زاد راہ لاد کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر میں نے امیر المومنین کو تلاش کیا۔ وہ مسلمانوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک چھری تھی جس پر وہ کسی چرواہے کی طرح ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ وہ کھانے والوں کے برتنوں کو دیکھ دیکھ کر اپنے غلام یرفا سے کہتے جا رہے تھے۔

”یرفا! ان کے برتن میں اور گوشت ڈالو، ان کو اور روٹیاں دو۔ ان کے پیالے میں اور شوربہ ڈالو“

جب میں ان کے سامنے پہنچا تو انھوں نے مجھے بھی بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں قریب ہی لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر میرے سامنے کھانا لایا گیا اور میں نے کھالیا۔ جب سارے لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو وہ یرفا کو برتن سمیٹنے کا حکم دے کر گھر کی طرف چل پڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے چلا۔ جب وہ گھر میں داخل ہو گئے تو میں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے مجھے اجازت دیدی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک نمڈے پر دو ٹیکوں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں جن کے اندر کھجور کے ریٹھے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان میں سے ایک تیکہ میری طرف سرکا دیا جس پر میں بیٹھ گیا۔ ان کی پشت کی طرف ایک دروازہ تھا

جس پر پردہ لٹک رہا تھا۔ انھوں نے پردے کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔
 ”ام کلثوم! میرا کھانا۔“

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ دیکھوں، امیر المؤمنین کا مخصوص کھانا کیسا ہے۔
 ان کی اہلیہ نے ان کو روغن زیتون لگی ہوئی روٹی دی جس پر نمک کی ایک ڈلی رکھی ہوئی
 تھی۔ انھوں نے مجھ سے کھانے کے لیے کہا اور میں نے امتثال امر کے طور پر تھوڑا سا
 کھایا۔ میں نے ان کے سوا کسی دوسرے آدمی کو اتنی رغبت اور شوق سے کھانا
 کھاتے نہیں دیکھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے کہا، مجھے پلاؤ۔ گھر والے
 ایک پیالہ لائے جس میں جو کے ستو کا گھول تھا۔ انھوں نے کہا، پہلے اس کو پلاؤ۔
 میں نے پیالہ لے کر اس میں سے بہت تھوڑا سا پیا۔ کیونکہ میرا ستو اس سے زیادہ
 لذیذ اور عمدہ تھا۔ پھر انھوں نے خوب آسودہ ہو کر پیا اور پی چکنے کے بعد کہا۔
 ”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَطْعَمَنَا قَسَبَنَا
 وَشَقَانَا قَارِدًا أَنَا۔“
 آسودہ اور پلا کر سیراب کیا۔

اس وقت میں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”امیر المؤمنین! میں آپ کے پاس ایک پیغام لایا ہوں۔“

”کہاں سے؟“ انھوں نے دریافت کیا۔

”سلمہ بن قیس کے یہاں سے۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں سلمہ بن قیس اور ان کے قاصد کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“... مجھے مسلمانوں

کے شکر کا حال بتاؤ۔“ انھوں نے کہا۔

”امیر المؤمنین! جیسا کہ آپ پسند کرتے ہیں، فوج بخیر و عافیت ہے اور اللہ تعالیٰ

نے اس کو اپنے اور اللہ کے دشمنوں پر فتح و کامرانی عطا فرمائی ہے۔“ میں نے عرض کیا۔

پھر میں نے ان کو فتح کی خوشخبری سنائی اور تفضیل کے ساتھ فوج کے

حالات بتاتے تو انہوں نے کہا۔

”الْحَمْدُ لِلَّهِ... اَعْطَى نَتَفَضَّلِ وَ
انْعَمَ فَاَجْزَلِ۔“
تسکرے خدا کا جس نے اپنی ہر بات کو اسے
عطا کیا اور اپنے انعام سے خوب نوازا۔“

پھر پوچھا، ”کیا بصرہ کی طرف سے ہو کر آئے ہو؟“

میں نے کہا، ”جی ہاں امیر المومنین!“

”وہاں مسلمان کیسے ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”خدا کے فضل سے بخیریت ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اشیاء ضرورت کے نرخ کیسے ہیں؟“ انہوں نے دریافت کیا۔

”ہر چیز انتہائی ارزاں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

پھر پوچھا، ”گوشت کا کیا حال ہے؟ اس لیے کہ گوشت عربوں کی بنیادی

غذا ہے۔ اس کے بغیر ان کی معیشت درست نہیں ہو سکتی۔“

میں نے عرض کیا، ”گوشت بہت وافر مقدار میں ہے۔“

پھر انہوں نے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”یہ تمہارے ہاتھ میں

کیا ہے؟“

”جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں دشمن پر فتح دی اور ہم نے مالِ غنیمت اکٹھا کیا تو

سلمان بن قیس نے اس میں اس زیور کو دیکھ کر فوج سے کہا۔

”اگر اس زیور کو تمہارے درمیان تقسیم کیا جائے تو کسی کے ہاتھ کچھ نہیں

لگے گا۔ اگر میں اسے امیر المومنین کی خدمت میں بھیج دوں تو کیا تم سب لوگ اس

پر راضی ہو؟“ تو سب نے کہا، ”ہاں!“ یہ کہہ کر میں نے وہ ڈبہ ان کے حوالے

کر دیا۔ جب انہوں نے ڈبے کو کھولا اور ان کی نظر زیور اور اس میں جڑے ہوئے

سرخ، زرد اور سبز نگینوں پر پڑی تو ایسی جگہ سے اچھل کر کھڑے ہو گئے اور ڈبے

کو زمین پر پھینکتے ہوئے اپنے ہاتھ کو کمر پر رکھ لیا۔ زمین پر گرنے کے بعد نگینے ادھر ادھر بکھر گئے۔ ان کی عورتوں نے سمجھا کہ میں دھوکے سے ان کو قتل کرنا چاہتا ہوں اس لیے وہ سب دروازے کی طرف لپکیں۔

پھر خلیفہ نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”انھیں اکٹھا کرو،“ اور اپنے غلام یرفا کو حکم دیا۔

”اسے خوب اچھی طرح مارو۔“

میں ڈبے سے نکل کر بکھرے ہوئے نگینوں کو جمع کرنے لگا اس دوران یرفا

مجھے برابر مارے جا رہا تھا۔

پھر انھوں نے کہا، ”اٹھ، نہ تو اچھا ہے نہ تیرا قائد“

میں نے اٹھ کر عرض کیا، امیر المؤمنین! اب ہواز تک جانے کے واسطے میرے

اور میرے غلام کے لیے سواریوں کا انتظام کر دیجئے۔ کیونکہ آپ کے غلام نے

ہماری سواریاں لے لی ہیں۔ تو انھوں نے یرفا سے کہا کہ ”اس کو اور اس کے غلام

کو صدقہ کے اونٹوں میں سے دو سواریاں دے دو۔“ پھر میری طرف متوجہ

ہوتے ہوئے کہا۔

”جب تمہاری ضرورت پوری ہو جائے تو یہ دونوں اونٹنیاں ان لوگوں کو دیدنا

جو تم سے زیادہ ان کے ضرورت مند ہوں۔“

تو میں نے کہا۔ ”امیر المؤمنین! میں ایسا ہی کروں گا۔ جی ہاں ان شاء اللہ آپ

کے حکم کی تعمیل کروں گا۔“

پھر انھوں نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”سن لو!! خدا کی قسم ان زیورات کی تقسیم سے پہلے اگر فوج ادھر ادھر بکھر

گئی تو تمہیں اور تمہارے قائد دونوں کو سخت عبرت ناک سزا دوں گا۔“

میں نے اسی وقت وہاں سے کوچ کر دیا اور منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا سلمہ ابن قیس کے پاس پہنچا اور ان سے کہا۔

”جس کام کے لیے آپ نے مجھے اپنا خصوصی ایچی بنایا تھا وہ میرے لیے بڑا نانا مبارک ثابت ہوا قبل اس کے کہ میرے اور آپ کے اُدپر کوئی بھاری مصیبت نازل ہو ان زیورات کو فوراً فوج میں تقسیم کر دیجئے“ اس کے بعد میں نے ان کو وہ پوری سرگزشت سنائی جو میرے اُدپر بتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اس مجلس کو برخاست کرنے سے پہلے پہلے وہ زیورات فوج میں تقسیم کر دیے۔“



حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ

وہ اس یثربی نوجوان "معاذ بن جبل" کے عنقوانِ شباب کا زمانہ تھا جب خاورِ اسلام کی ہدایت ریز شعاعیں جزیرہ عرب کی تاریک فضاؤں میں صوفگن ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ہم جولیوں میں اپنی تیز فہمی، قوت استدلال، خوش بیانی اور بلند ہمتی کے لحاظ سے ایک منفرد و ممتاز مقام کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک خوب رو اور حسین و جمیل نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں سُریگیں، سر کے بال گھونگھریالے اور دانت موتی کی طرح سفید براق تھے۔ وہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کے راستے اتر کر ان کے دل میں گھر کر لیتا تھا۔ نوجوان معاذ بن جبل کی داعیِ اسلام حضرت مُصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اور لیلۃ العقبہ میں اس کے ہاتھوں نے بڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے مصافحہ اور ان پر بیعت کی۔ وہ ان بہتر پاک نفس انسانوں میں شامل تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت و ملاقات کا شرف حاصل کرنے اور تاریخ کے صفحات میں اپنے ہاتھوں سے ایک دل کش اور روشن ترین باب رقم کرنے مگے گئے تھے۔

نوجوان معاذ بن جبل نے مکہ سے مدینہ واپس پہنچتے ہی اپنے ہم جولیوں کی ایک مختصر ٹولی کے ساتھ مل کر بتوں کو توڑنے اور ان کو خفیہ یا علانیہ طور پر مشرکین کے گھروں سے نکال پھینکنے کے لیے ایک جماعت بنائی۔ اور ان کم سن نوجوانوں کی اس کارروائی

کا اثر یہ ہوا کہ میثرب کا ایک بہت بڑا آدمی ”عمر بن جموح“ اسلامی جماعت میں شامل ہو گیا۔

عمر بن جموح کا شمار قبیلہ بنو سلمہ کے سربراہ آوردہ رئیسوں اور بڑے سرداروں میں ہوتا تھا۔ دوسرے شرفا رکی طرح انھوں نے بھی اپنے لیے نہایت نفیس اور بیش قیمت لکڑی کا ایک بت بنا رکھا تھا۔ وہ اس کے رکھ رکھاؤ کا نہایت اہتمام کرتے، اس کے اوپر ریشمی کپڑے ڈالتے اور ہر روز صبح کو اسے خوش بو سے معطر کرتے۔

ایک رات ان نوجوانوں نے ان کے بت کو اس کی جگہ سے اٹھایا اور اسے لے جا کر بنو سلمہ کی آبادی کے پیچھے ایک گڑھے میں پھینک دیا جس میں کوڑا کرکٹ اور غلاظت ڈالی جاتی تھی۔ جب صبح کو بڑے میاں بیدار ہوئے اور بت کو اپنی جگہ پر نہیں پایا تو اسے ہر طرف تلاش کرتے پھرے۔ آخر کار اس کو ایک گڑھے میں گندگی میں لت پت منہ کے بل پڑا ہوا دیکھا تو بولے۔

”تمہارا بڑا ہو، آج رات ہمارے معبود کے ساتھ کس نے یہ زیادتی کی ہے؟“
پھر اس کو گڑھے سے نکالا، دھو کر صاف کیا اور خوش بو لگا کر یہ کہتے ہوئے دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

”مناہ! خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ تمہارے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے تو میں اسے سخت ذلت آمیز سزا دوں گا۔“

اور رات کو جب بڑے میاں سو گئے تو لڑکے چپکے سے بت کے پاس پہنچے اور اس کے ساتھ پھر وہی کارروائی کی جو گزشتہ رات کر چکے تھے۔ صبح کو وہ پھر اسے ڈھونڈنے نکلے اور جب وہ ایک دوسرے گڑھے میں پڑا ہوا مل گیا تو اس کو نکال کر دھویا اور صاف ستھرا کر کے خوشبو لگائی اور زیادتی کرنے والوں کو سخت دھکی دی۔ تیسری رات جب لڑکوں کی طرف سے پھر اسی حرکت کا اعادہ ہوا تو انھوں نے اس کو

گڑھے سے نکال کر صاف کیا اور اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر اپنی تلوار لائے اور اس کو بت کی گردن کے ساتھ لٹکاتے ہوئے اس کو مخاطب کر کے کہا۔

”مناہ! خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ تیرے ساتھ یہ تازیبا حرکت کون کرتا ہے۔ اگر تمہارے اندر ذرا بھی خیر ہے تو یہ تلوار تمہارے ساتھ ہے اس سے تم خود اپنا دفاع کرنا۔“

رات کو جب شیخ سو گئے تو لڑکوں نے اس بت کے ساتھ پھر وہی حرکت کی۔ انہوں نے اس کی گردن سے تلوار اتار لی، اس کو ایک مردہ کتے کی گردن کے ساتھ باندھا اور ان دونوں کو لے جا کر گڑھے میں پھینک آئے۔ صبح کو شیخ نے بڑی سرگرمی کے ساتھ اس کی تلاش شروع کی۔ آخر وہ ان کو مردہ کتے کے ساتھ بندھا ہوا غلاطت میں ملوث گڑھے میں اوندھے منہ پڑا ہوا ملا۔ اس وقت انہوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تَاللّٰهِ لَوْ كُنْتُ اِلٰهًا لَم تَكُنْ اَنْتَ
وَكَلْبٌ وَسَطٍ بِيْرِنِي قَزَنٌ۔“

خدا کی قسم! اگر تو معبود ہوتا تو، کتے کے ساتھ بندھا ہوا گڑھے میں نہ پڑا ہوتا۔“

اس کے بعد نبو مسلمہ کے اس شیخ نے اسلام قبول کر لیا اور بڑے اچھے مسلمان ہوئے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سائے کی طرح ہمیشہ ان کے ساتھ لگے رہتے۔ انہوں نے آپ سے قرآن سیکھا اور شرایع اسلام کا علم حاصل کیا یہاں تک کہ ان کا شمار اصحاب رسول میں کتاب اللہ کے بڑے قاریوں اور شریعت خداوندی کے زبردست عالموں میں ہونے لگا۔ یزید ابن قتیب کا بیان ہے۔

”میں حمص کی مسجد میں داخل ہوا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ ایک نوجوان کے گرد

لوگوں کا بہت بڑا مجمع اکٹھا ہے، جس کے بال گھونگھریا لے ہیں۔ جب وہ بولتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے منہ سے روشنی نکل رہی ہے اور موتی جھڑ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“ تو لوگوں نے کہا۔ ”معاذ بن جبلؓ“

اور ابو مسلم خولانی کہتے ہیں کہ ”میں دمشق کی مسجد میں گیا۔ وہاں ایک علمی مجلس منعقد تھی جس میں بڑے بڑے سن رسیدہ صحابہ کرام تشریف فرما تھے۔ اس مجلس میں سرگئیں آنکھوں اور چمکدار دانتوں والا ایک نوجوان بھی شریک تھا۔ جب لوگوں کے درمیان کسی علمی مسئلے میں اختلاف رائے واقع ہوتا تو اسی نوجوان کی طرف رجوع کرتے۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ تو اس نے کہا۔ معاذ بن جبلؓ“

اور اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے بچپن ہی سے اپنی تعلیم و تربیت کے سارے مراحل درس گاہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں طے کیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرچشمہ علم و معرفت سے سیراب ہو کر انھیں کے ہاتھوں فارغ التحصیل ہوئے۔ وہ سب سے اچھے معلم کے سب سے اچھے شاگرد تھے اور معاذ بن جبلؓ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کافی ہے،

”أَعْلَمُ أُمَّتِي بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ“ میری امت میں حلال و حرام کے سب سے
معاذ بن جبلؓ۔ بڑے عالم معاذ بن جبلؓ ہیں۔“

اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ ان چھ خوش نصیب افراد میں سے تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں قرآن جمع کیا تھا۔ اسی لیے اصحاب رسول کا یہ حال تھا کہ جب وہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی موجودگی میں کوئی علمی بات کرتے تو ان کی ہیبت اور

علمی عظمت کی وجہ سے سب کی نظریں ان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے دونوں ساتھیوں حضرت
 عمر فاروق اور حضرت ابو بکر صدیق نے ان کی بے مثال علمی قوت سے اسلام اور
 مسلمانوں کی خدمت کا کام لیا۔

یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فتح مکہ کے بعد قریش کو فوج در فوج مسلمان
 ہوتے دیکھتے ہیں اور نئے مسلمانوں کے لیے کسی اچھے معلم کی ضرورت محسوس کرتے
 ہیں جو ان کو اسلام کی تعلیم دے اور اس کے احکام سے روشناس کر لے۔ چنانچہ
 آپ مکہ میں حضرت عتاب بن اسیدؓ کو اپنا نائب بناتے ہیں اور لوگوں کو قرآن
 کی تعلیم اور اسلام کی تفہیم کے لیے حضرت معاذ بن جبلؓ کو ان کے پاس چھوڑ جاتے
 ہیں۔ اور جب شاہان یمن کے نمائندوں نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر اپنے
 اور اپنی قوم کے قبول اسلام کا اعلان کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی
 ایسے شخص کو اپنے ساتھ بھیجنے کی درخواست کی جو وہاں لوگوں کو دین کی تعلیم دے
 سکے تو آپ نے اس اہم کام کے لیے اپنے اصحاب کرام پر مشتمل داعیوں اور ہادیوں
 کی ایک جماعت تشکیل دی اور ان کا سربراہ حضرت معاذ بن جبلؓ کو مقرر فرمایا۔
 اور روشنی کے ان سفیروں کو الوداع کہنے کے لیے بنفس نفیس نکلے اور حضرت معاذؓ
 کی سواری کے ساتھ ساتھ دیر تک چلتے رہے۔ گویا آپ ان کو جی بھر کر دیکھ لینا
 چاہتے تھے۔ اس پورے عرصے میں حضرت معاذؓ اپنی ادنیٰ پر سوار رہے۔ آپ
 نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

”معاذ! شاید اس کے بعد تمہاری ملاقات مجھ سے نہ ہو سکے۔ اب تمہارا

گزر میری مسجد اور قبر پر ہوگا۔“

حضرت معاذؓ اپنے نبی، اپنے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی

کے صدمے سے روپڑے اور ان کے ساتھ ہی دوسرے مسلمانوں کی آنکھوں کے پیمانے بھی لبریز ہو کر چھلکنے لگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور واقعی حضرت معاذ بن جبلؓ کی آنکھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے پھر کبھی روشن نہ ہو سکیں۔ کیونکہ ان کی یمن سے واپسی کے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو چکا تھا۔ جب وہ مدینہ واپس آئے اور اس کو اپنے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انس و محبت سے عالی پایا تو بہت روئے۔

جب خلافت کی زمام کار حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں آئی تو انھوں نے حضرت معاذ کو بنی کلاب میں ان کے وظائف تقسیم کرنے اور اغنیا سے وصول کی ہوئی صدقہ و زکوٰۃ کی رقمیں فقراء و مساکین میں بانٹنے کے لیے بھیجا تو وہاں انھوں نے اپنی ذمہ داری نہایت دیانتداری کے ساتھ ادا کی اور گھوڑے کی پیٹھ پر ڈالنے کا ٹاٹ جو گھر سے لے کر نکلے تھے اسی کو اپنے گلے میں لپیٹے ہوئے اپنی اہلیہ کے پاس واپس آگئے۔ اہلیہ نے پوچھا کہ وہ ہدیے کہاں ہیں جو والی لوگ اپنے گھر والوں کے لیے لاتے ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ”میرے ساتھ ایک نہایت ہوشیار ننگراں تھا جو ہر وقت میرے اوپر نظر رکھتا تھا۔“

”آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ کے نزدیک قابل اعتماد اور امین تھے۔ پھر عمرؓ آئے تو انھوں نے آپ کی نگرانی کے لیے ننگراں مقرر کر دیا؟“ بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ پھر انہوں نے اس بات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیویوں سے کہہ کر ان کی شکایت کی۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت معاذ کو بلا کر پوچھا۔

”کیا میں نے تمہاری نگرانی کے لیے تمہارے ساتھ کوئی ننگراں بھیجا تھا؟“

”نہیں تو امیر المومنین! لیکن اس سے بہانہ کرنے کے لیے اس کے سوا دوسری کوئی بات مجھے نہیں سوچھی۔“ یہ سن کر حضرت عمرؓ، سنس پڑے اور ان کو کچھ دے کر کہا کہ ”اس کے ذریعے اس کو راضی کر لو۔“

اور حضرت فاروق اعظمؓ ہی کے دورِ خلافت کی بات ہے کہ شام کے گورنر حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ نے ان کے یہاں پیغام بھیجا۔

”امیر المومنین! شام کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ان کو ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے جو ان کو قرآن کی تعلیم دے سکیں اور دین سکھا سکیں! امیر المومنین! آپ ایسے لوگوں کے ذریعے ہماری مدد فرمائیں جو یہ خدمت انجام دے سکیں!“

تو حضرت عمرؓ نے ان پانچ اصحاب کو طلب فرمایا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جمع قرآن کی خدمت انجام دی تھی۔ اور وہ تھے حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبادہ ابن صامت، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابودردار رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اور ان سے کہا۔

”آپ کے شامی بھائیوں نے مجھ سے کچھ ایسے اصحابِ علم کی خدمات طلب کی ہیں جو انہیں قرآن اور فقہِ دین کی تعلیم دے سکیں۔ آپ لوگ اپنے میں سے تین آدمیوں کے ذریعے میری مدد کریں۔ اگر آپ چاہیں تو اس کے لیے قرعہ اندازی کر لیں ورنہ میں اپنی پسند سے تین آدمیوں کو بھیج دوں گا۔“

تو ان لوگوں نے کہا کہ ”اس میں قرعہ اندازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ ابوایوب کافی ضعیف ہو گئے ہیں اور ابی بن کعب ایک مریض آدمی ہیں۔ باقی ہم تین آدمی سمجھتے ہیں۔“ ان کا یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ نے کہا۔

”آپ لوگ سب سے پہلے حمص جائیں اگر اہل حمص کا حال آپ کو پسند آئے تو اپنے میں سے ایک آدمی کو وہاں چھوڑ دیں، ایک آدمی دمشق اور ایک فلسطین چلا جائے“

حضرت فاروق اعظم کے حکم کے مطابق تینوں حضرات پہلے حمص پہنچے اور وہاں حضرت عبادہ ابن صامت کو چھوڑا۔ پھر حضرت ابوذر دار نے دمشق کی راہ لی اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فلسطین چلے گئے۔

وہاں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک وبائی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو انہوں نے اپنا رخ قبلہ کی طرف کر لیا۔ اس وقت ان کے ہونٹوں پر یہ ترانہ چل رہا تھا۔

”مَرْحَبًا بِالمَوْتِ مَرْحَبًا زَائِدًا جَاءَ
بعد غِيَابٍ وَجَبِيْبٌ وَفَدَّ عَلِي
میں بصد شوق موت کو خوش آمدید کہتا
ہوں، ایک ملاقاتی طویل غیر حاضری کے بعد
آیا ہے، اور ایک محبوب بڑی تمنائوں کے
بعد ملا ہے۔“

پھر آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے کہا۔
”میرے معبود! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے دنیا اور اس کی زندگی کو اس لیے نہیں چاہا تھا کہ اس میں باغات لگاؤں اور نہریں جاری کروں بلکہ اگر اس کو چاہا تھا تو صرف اس غرض سے کہ گرمیوں کی دوپہر میں بھوک پیاس کی شدت برداشت کروں، سکھن حالات کی سختیاں جھیلوں اور ذکر و تعلیم کی مجال میں علماء کے سامنے زانوئے تلمذتہ کروں۔ خدایا! تو کسی نفسِ مومنہ کی طرح میری جان کو اپنی کفالت میں لے لے۔“

پھر ان کی مقدس روح۔ دعوت الی اللہ اور ہجرت فی سبیل اللہ کی حالت میں۔ مسجدِ خاکی کو چھوڑ کر اپنے رب کے حضور پہنچ گئی۔

مآخذ

		(الف)	
الدردر فی اختصار	بلاذری	انساب الاشراف	
المغازی والسير	کماله	اعلام التتار	
النجوم الزاهرة	وکيع	اخبار القضاة	
الاصابه فی تميز الصحابه	احمد حافظ	القصص الاسلاميه	
اسد الغابه	البشيري	فی عهد النبويه	
البيدایه والنهايه فی	جاحظ	المستطرف	
عهد النبوة	حسين بيگل	البيان والبتين	
امتاع الاسماع	ابن قتيبه	الصدیق	
المحبر فی التاريخ	ابو حاتم سجستاني	المعارف	
الطبقات الكبرى	محمد احمد باشميل	المعمرون	
الكامل فی التاريخ	محمد بن سعيد صحاحی	القادسيه	
الشعر والشعراء	بوصيري	الكواكب الدرريه	
الاعلام ومراجعہ	حافظ ابن عبدالبر	الاستيعاب	
الجرح والتعديل	عبدالكريم شہرستاني	الملل والنحل	
البعير			
عائظ ابن عبدالبر			
ابن تغري بردی			
عائظ ابن عمر عسقلانی			
ابن اثير			
نشار			
مقريزي			
محمد بن حبيب			
ابن سعد			
ابن اثير			
ابن قتيبه			
ارکلی			
ابن ابی حاتم رازی			
حافظ شمس الدين			
بن محمد ذہبی			

ابن جریر طبری	تاریخ الامم والملوک	محمد بن طاہر المقدسی	المجمع بین رجال الصحیحین
العصفری	تاریخ خلیفہ ابن خیاط	ابوزید احمد بن سہل بلخی	البدء والتاریخ
عبید اللہ رحمانی	تحفة الاحوذی	محب الدین الطبری	اشہر مشاہیر الاسلام
مبارکپوری	تاریخ الخلفاء	ابوالفرج الاصفہانی	الریاض النضرہ
حافظ جلال الدین	تہذیب الاسما واللقاب	محمد بن اسمعیل بخاری	الافغانی
سیوطی	تاج العروس من جواهرہ	محمد عجاج خطیب	التاریخ البکیر
امام شرف الدین نووی	القاموس	امام احمد بن حنبل	الوہریرۃ من سلسلۃ
مترضی زبیدی	(دش)	شیخ حسین غلامی	اعلام العرب
شمار القلوب فی المضاف			الزید
ثعالبی	و المنسوب	امام محمد بن اسمعیل بخاری	اصحاب بدر
(ج)			(ب)
ابن حزم	جمہرۃ النساب العرب	حافظ ابن جریر عسقلانی	صحیح بخاری
	جمہرۃ الاولیاء	ابن عساکر	(د)
	جامع الاصول من	حافظ ذہبی	تہذیب التہذیب
ابن اثیر	احادیث الرسول	ابن جریر الطبری	تہذیب
	(ج)	حافظ ابن جریر عسقلانی	تاریخ الاسلام
مجد الدین	محاتۃ الاسلام	حافظ ذہبی	تاریخ الطبری
ابونعیم اصفہانی	حلیۃ الاولیاء	الذیاری بکری	تقریب التہذیب
مجدد پورسہ کاندھلوی	حیاۃ الصحابہ	حافظ ذہبی	تجرید اسماء الصحابہ
			تاریخ الخمیس
			تذکرۃ الحفاظ

سیرة بطل	حسن الصحابه
محمد زیدان	(خ)
سلسله اعلام المسلمين	اعلاصه تذهیب تہذیب
محمد قوسیم بن علی	الکمال
الشرفیت التونسی	
سعد بن ابی وقاص و	خزانة الادب
سجاد	البغدادی
ابطال قادسیہ	(د)
(ش)	دیوان حسان بن ثابت
شہداء الاسلام فی	و شروحه
نشار	عبد الرحمن برقوقی
عہد النبوة	دائرة المعارف الاسلامیہ فرید وجدی
شذرات الذهب	ذول الاسلام
ابو الفلاح عبد الحمی	حافظ ذہبی
بن العماد خبلی	(ذ)
العراقی	ذیل تاریخ الطبری
شرح الفیہ	ذیل المذیل
(ص)	الطبری
صفوة الصفوة	(ر)
ابن جوزی	رغبة الامل فی شرح
(ط)	الکامل
طبقات علماء افريقية و	رجال حول الرسول
تونس	خالد محمد خالد
طبقات فحول الشعرا	(ز)
محمد بن سلام الجحی	زعما الاسلام
الشعرانی	حسن ابراهیم حسن
ابن سعد	(س)
ابن سمرہ الجعدی	طبقات فقہاء الیمن
	سیر اعلام النبلاء
	حافظ شمس الدین ذہبی

رافع اصغہانی	محاضرات الآداب	ڈاکٹر علی خرد پطی	عبدالقدیر زبیر	(ع)
المسعودی	مروج الذهب			
حافظ ابو بکر البیہقی	مجمع الزوائد			(غ)
امام ابو داؤد سجستانی	مسند ابی داؤد	محمد بن محمد الجوزی	غایۃ النہایہ	
	مختصر تاریخ دمشق			(ف)
ڈاکٹر محمد حمید اللہ	مجموعۃ الوثائق السیاسیہ	عبدالرحمن بن	فتوح مصر و اخبارہا	
یا قوت حموی	مجمع البلدان	عبدالقدیر بن عبدالحکیم		
امام مسلم نیشاپوری	مسلم	حافظ ابن جریر عسقلانی	فتح الباری	
معرفة القراء الکبار علی	معرفة القراء الکبار علی	بلاذری	فتوح البلدان	
تحقیق محمد جاد الحق	الطبقات والاعصار			(ق)
محب اللہ بن خلیف	مع الرعیل الاول	العلقشدری	قلائد الجنان فی التعریف	
	(ن)		بقبائل الزمان	
زبیری	نسب قریش	محمود شہید خطا	قادة فتح فارس	
احمد بن علی	نہایتہ الادب	محمود شہید خطا	قادة فتح العراق و الجزیرہ	
العلقشدری				(ک)
	(و)	شیخ علی متقی	کنز العمال	
ابن خلکان	وقیات الاعیان		(م)	
		یا فعی	مرآة الجنان	

مشافہ عکس کارٹر

الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور